فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد چہارم)

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلادیش۔

کتاب	:	تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (چہارم)۔
مؤلف	:	محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا-
سن تصنیف	:	۱۹۹۹ء
سن کتابت	:	نومبر/ ۲۰۲۳ء
باراول	:	۱۰/ دسمبر/ ۲۰۲۳ء
باردوم	:	۱۰/ ۰٦/ ۲۰۲٦ء
تعداد	:	۱۰۰۰(ایک ہزار)
قیمت	:	۵۰۰/ٹاکا، بنگلہ دیشی۔ ۳۰/ریال سعودی
کمپوز	:	محمود العالم (اندرقلعہ، چاٹگام، بنگلادیش)
ناشر	:	دارالبحوث والمناصرة الاسلامية چاٹگام، بنگلادیش
ملنے کے پتے	:	0088-01533091784
Email	:	tahernadwi@gmail.com

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

انتساب

فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر

(الاحزاب:۱۳)

اس لہو کے نام جو ملت اسلامیہ ارکان کے لئے بہا مگر خود ارکان میں اجنبی ٹھہرا

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریری
کہ این مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیری



محمد طاہر جمال ندوی
۱۲/ دسمبر/ ۲۰۲۳ء

عرض ناشر

برادر محترم مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ہند، وتلمیذ خاص مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے دینی وروحانی، علمی وثقافتی، فکری وسیاسی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک قابل القدر عالم دین، معروف ادیب و قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور مفکر مورخ بھی ہیں، جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظرعام پر آچکی ہیں، اور بہت ساری تصانیف اب تک زیرِ طبع وزیرِ نظر بھی ہیں۔

مولانا محمد طاہر جمال ندوی بن الحاج مولانا حافظ جمال الدین احمد کی ولادت ۵ / ۵ /۱۹۶۶ء میں بستی باغگونہ علی چنگ ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول سے پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیڈنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ثانویہ تک کی تعلیم پاکر دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں ایک سال حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی اور حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب سے پڑھا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں سے کلیۃ الادب العربی سے ماجستر کر کے ۱۹۹۱ء میں سندفراغت حاصل کی۔

مولانا محترم فراغت تعلیم کے معا بعد بنگلا دیش آئے اور یہاں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، جن میں دارالانصار چاٹگام قابل ذکر اور ناقابل فراموش درسگاہ ہے، پھر چند سال پڑھانے بعد آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا، جہاں آپ نے چند سال گزارے، اس کے بعد دوبارہ بنگلا دیش آئے ہوئے ہیں، حالیا تصنیف وتالیف میں مصروف اور سرگرم عمل ہیں، الحمدللہ مولانا کی چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گرانمایہ تصانیف ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں۔
☆ سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں۔
☆ روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے۔

☆ تذکرۂ علامہ سید الامینؒ۔
☆ تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ۔
☆ روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب۔
☆ ارکان کے عظیم شاعر علاول/ الاول، حیات وکارنامے۔
☆ ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں۔
☆ روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)۔
☆ وادیٔ پرخار کے گمنام مسافر۔
☆ سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ
☆ سرخیل کارواں۔
☆ علماء اور جمعیۃ علمائے اسلام ارکان۔
☆ روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ۔
☆ روداد سخن۔
☆ نقوش خیال۔
☆ حیاتِ نور۔
☆ حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس۔
☆ برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۲)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۳)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۴)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۵)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۶)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۷)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۸)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۹)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۰)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۱)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۲)۔

مولانا کی ان تمام تصانیف میں سے سب سے مقبول ترین تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں'' جو دسمبر ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، اور دوسرا ایڈیشن زیرطبع ہے، جس کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''فاضلِ عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت ولیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا، اور تاریخ کے خلا کو پر کیا، جو عرصہ سے پایا جاتا تھا''۔

مولانا کی زیر نظر تصنیف ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد چہارم'' بھی ہمارے نزدیک ایک شاہکار تصنیف ہے، جسے آپ نے بڑی محنت، لیاقت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس سوانحی تصنیف کو بھی ایک ملی فریضہ اور قومی خدمت کے بطور اور بقول آپ کے ایک سعادت سمجھ کر لکھا ہے، اور اس کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جو تکلیفیں، صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں ان کے اجر ومعاوضے صرف اور صرف ذاتِ خداوندی کی طرف سے ممکن اور امید ہیں۔

تاہم اس قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی قوم کی طرف سے عصر حاضر کے ہمارے اس عظیم مصنف وقلم کار کو خراجِ تحسین وگل دستۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت اور فضل وعنایات سے مصنف کی زندگی اور قلمی کاوشوں کو مزید شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

محمد طارق جمال

سکریٹری برائے نشر واشاعت

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلادیش۔

فہرست

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد چہارم)

حرف آغاز

الحمدللہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی اشرف الانبیاء وسیدالاولین والآخرین، وعلی آلہ و صحبہ اجمعین،ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، ولا عدوان الا علی الظالمین، امابعد:

تاریخ کاروان حیات کا حافظہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جوقوم یا افراد اپنے حافظہ کھو بیٹھتے ہیں، وہ اپنے مستقبل تاریک بنالیتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کا حال ماضی کا آئنہ اور کسی بھی قوم کا مستقبل حال کا نتیجہ ہوتا ہے۔اور تاریخ انسانی زندگی کا وہ ائینہ ہے، جس میں قوم اپنی حیات کا ہر اہم پہلو بڑی سچائی اور گہرائی کے ساتھ دیک پاتی ہے، چاہے اس کا تعلق انسانی سماج، طبقات، سیاست، معیشت معاشرت غرض انفرادی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا اخلاقی، تہذیبی ہو یا تمدنی کہ تاریخ ان کے ہر اہم پہلو کو بڑی گہرائی سے سامنے لاکر سورج کی طرح عیاں کردیتی ہے۔

اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ جوقوم اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کے کارنامے بھلا دیتی ہے، اس کا وجود بحیثیت ایک قوم صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے، کیوں کہ اس کے امتیازات، خصوصیات، کمالات، غیرت وخودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت کے جوسرچشمے تھے کہ جہالت نے انہیں ان سے محروم کردیا تو اس کا رشتہ اپنے اسلاف سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، اب اس حالت میں ان کی رگوں میں وہ خون گرم کہاں سے آئے گا، جو اس کے جسم میں زندگی کی حقیقی توانائی اور اپنی عزت وآبرو، عصمت وناموس اور عظمت واقتدار پر کٹ مرنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کرسکتا تھا؟ اس لئے ہر زندہ اور حوصلہ مند قوم اپنی قومی تاریخ اور اپنے ماضی کی عظمت رفتہ اور اپنے اسلاف کے روشن کارناموں کو حرز جان بنائے رکھتی ہے۔

مسلمانان ارکان اپنے وطن عزیز میں حکمران رہ چکے تھے، ۱۷۸۴ء کو ان پر برمیوں کا زبردست حملہ ہوا تو ان کے روشن حالات نے انگڑائیاں لیں، ان پر ناموافق سیاسی حالات کا تسلط ہو گیا، ان کی سیاسی، معاشی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی غرض سبھی شعبوں کو زوال وانحطاط نے دیمک کی طرح چھاٹ گیا تھا۔ ان کے علم وفن، مال ودولت، عزت وآبرو، نخوت وغیرت، ناموس وقار سب پر آنچ آنے لگی، برطانوی دور حکومت میں بھی ان کی یہی حالت بدلی نہ تھی، پھر ۱۹۴۸ء میں برمیوں کا ارکان پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو انہوں نے ارکانی مسلمانوں پر وہ سارے مظالم ڈھائے، جن کی یاد وتذکار سے ہٹلر اور چنگیز بھی شرمائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پوری دنیا کی اسلامی اور اسلامیوں کی تاریخ کی طرح ارکان کی تاریخ میں بھی زوال وانحطاط کا کرشمہ دیکھا گیا ہے، مسلمانان ارکان جب یہاں حکمران تھے تو اس زمین نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں بڑے بڑے اعیان پیدا کئے، اور تو اور ان میں ادباء، شعراء، انشاپرداز اور علماء وصلحا کی کوئی کمی نہیں تھی، اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف علم وادب، تہذیب وثقافت، اخوت ومساوات انسانی کے سرمایہ کار تھے، انہوں نے اپنے سرمایہ کو یہاں کے مسلمانوں کے علی الرغم دوسرے انسانوں، وحشی اور غیر متمدن قوموں پر پوری فیاضی کے ساتھ لٹایا تھا، ہمارے اسلاف نے یہاں کے ذرے ذرے سے محبت کی، اور یہاں کے چپے چپے کو اپنے جذبۂ عشق ووارفتگی کی سجدہ گاہ بنائی۔ یوں یہاں کی محبت بھری سرزمین نے ان کے دلوں کو جیت لیا تو انہوں نے اپنے سینے کو مزید کھول دیا تھا، ماضی کی اسکرین پر ان تمام مناظر کی تصاویر مرتسم ہیں، جو ہمارے سنہرے ماضی کی یاد دلاتی ہیں، اب انہیں بھول جانا ہماری قومی زندگی کا کوئی چھوٹا نہیں بلکہ سب سے بڑا حادثہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

ہماری قومی تاریخ کے سنہرے صفحات شاہد ہیں کہ ارکان میں جو دعاۃ ومرشدین اسلام کے پیام جاودانی لے کر آئے تھے، انہوں نے عزم وہمت کو ہم رکاب کر کے یہاں کے انسانیت کش حالات کو سازگار بنایا، اور اپنی عزت وشرافت، اصول پرستی اور عدل گستری، مساوات اور انسانیت نوازی کے کارناموں سے یہاں کی غیر متمدن، وحشی اور بربر قوموں کو اسلام سے روشناس کر دیا تھا، انہوں نے اپنی اخلاقی بلندی اور رواداری کے مخلصانہ جذبات کے ذریعے یہاں والوں کو اتنا متاثر کیا کہ نہ صرف ان قوموں نے بلکہ یہاں کی سرزمین نے بھی ان کے لئے اپنے آغوش محبت وا کر دیا، اور انہیں عزت و

احترام کے بلند مقامات پر بٹھایا، تاریخ کی ایک لمبی مسافت ہے، جسے ہم نے اس سرزمین میں عظمت وسربلندی کے لہراتے ہوئے پرچم تلے طے کی ہے، یوں یہاں کی گلریز وادیوں نے ہمارے اسلاف کے پاؤں چومے، سنگلاخ پہاڑیوں نے ان کے قدموں کو بوسا دیا، کبھی کبھار ضرورت کی بنیاد پر ہمارے اسلاف نے اپنا قدم آگے بڑھایا، اور وہ خون کے متلاطم سمندروں کو پار کیا، اور اپنے اپنے مقصد ومنزل کو پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

مگر اب طرفہ یہ ہے کہ ہم بڑے ناخلف، بزدل اور بادہ مست بن گئے ہیں، ہمارے ان دعاۃ و مرشدین، شہیدوں اور غازیوں نے عزیمت ودعوت کا روشن باب رقم کیا تو ہم نے ان کی آرزوؤں اور امنگوں سے غدر کرنا شروع کر دیا ہے، وہ اور ان کے تمام کارنامے آنے والی نسل کے لئے روشنی کے مینار تھے، مگر اب ہمارے ہاتھوں ان کی شناخت اور تاریخی کارنامے مسخ ہونے لگے ہیں، اس طرح روشنی کے ان میناروں کی بنیادیں بھی ہمارے ہاتھوں متزلزل ہونے لگی ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ اس نے بعض موقع پر اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کو یا تو بھلا دیا ہے یا بگاڑ دیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کا دروازہ کھولنے والا ملت اسلامیہ کے عظیم سرخرو نوجوان حضرت محمد بن قاسم کے حالات بڑے دردناک ہیں، جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، اور ایک طویل مدت تک مطلق العنان حکمرانوں نے انہیں مسلم تاریخ میں جائز مقام تک دینا گوارا نہ کیا، مگر اسلامیان ارکان کے اسلاف کی طرح ان کے متعلق بھی وقت نے جب اپنے چہرے سے ناانصافی کی گرد وغبار ہٹائی، تو اسلام کے اس عظیم المرتبت خادم کے روشن چہرے پر پڑی ہوئی گرد وغبار صاف ہو کے چہرہ مزید تابناک ہوا، تو تاریخ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، غیرت مندوں نے انہیں اپنی حمیت وغیرت کی علامت بنایے۔

ادھر اور ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد یہاں کی تاریخ نے حضرت سید احمد بن عرفان الشہید اور حضرت اسماعیل شہید پیدا کئے، جنہوں نے وادی بالاکوٹ میں جہاد کا علم بلند کیا، باوجودیکہ ان مجاہدین اسلام کی پشت میں کچھ غدار خوانین نے چھرا گھونپا، سکھوں اور انگریزوں کی امیدیں اور مرادیں بھر لائیں، مگر دریائے کنہار کے شوریدہ سر لہروں کے ساتھ اس تحریک کا مقدس لہو مل کر تاریخ کا رخ پھیر دیا، یوں یہ حضرات جنوبی ایشیا میں حقیقی اسلامی جہاد کے سب سے بڑی اور سب سے پہلی تحریک کے نقیب بن

کرا بھرے، نہ صرف وہ حضرات بلکہ ان کے رفقاء، ہم نوا وشرکاء سبھی کو تاریخ نے بلند مقام عطا کیا ہے۔

بعض مورخین شاید وطن مقدس ارکان کے دور اخیر کے مجاہدین کو ناکام دیکھ رہے ہوں گے، جس طرح بعض حضرات مورخین حضرت سید احمد بن عرفان الشہید کی تحریک جہاد کو ایک ناکام تحریک کی نظر سے دیکھتے ہیں، مگر یاد رہے کہ بعض موقع پر شکست بڑا تلخ تجربہ ہوتا ہے، لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ ایک شکست ان کے لئے بڑی فتح کا پیش خیمہ بن گئی، اور وہ قومیں پہلے سے بڑھ کر معزز اور مضبوط بن کر ابھریں، تو راقم الحروف کی امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ اور تو اور سرزمین ارکان کے دور آخر کی تاریخ بھی اس انداز سے ابھر آئے گی۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ مجاہدین سید احمد بن عرفان الشہید کے برعکس سرزمین ارکان کے دور آخر کے مجاہدین کی نامرادی کی تلخی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اہل وطن اپنے جان نثاروں کو بھی بھول گئے ہیں، ان لوگوں کو بھول گئے جنہوں نے اپنی کڑیل اور بے داغ جوانیاں اور عمریں غاصبوں، خون خواروں اور طاغوتوں کے مقابلے میں دفاع دین ووطن کی خاطر قربان کردیں، اب تو حسرت و یاس کا یہ عالم ہے کہ ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک نہیں لئے جارہے ہیں، لیکن یاد رہے کہ آخر وہ لوگ ہمارے ہی تھے، جنہوں نے دریائے مایو اور کلاڈان سے وضو کیا، اور اپنے لہو کے سوغات دے کر ہماری تاریخ کو سرخرو کیا، وہ قائدین ملت، وہ جوانان قوم ہمارے جسد ملی ہی کا اٹوٹ حصہ تو تھے، جنہوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنے کی کوششیں کیں، اور اپنی اپنی زندگیوں کو اس حوالے سے وقف کردیا، مگر آج ہمارے اندر شعور واحساس کی چنگاری ایسی بجھی کہ ہم ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک بھول گئے ہیں۔

جی ہاں ! ان محسنوں کو یاد کرنا ہمارا فرض اولین ہے، جنہوں نے ظلمت و اندھیاری کے اس مہیب طوفان میں حق وصداقت کی قندیلیں روشن کیں، جنہوں نے حق کی آوازیں بلند کرنے کے صلے میں طعنوں، ملامتوں کے تیر سہے، اور اپنی زندگی، اپنے مستقبل کو ملت وقوم کی راہ پر نثار کیا، ملک وقوم کی آزادی اور اگلی نسل کے مستقبل کی حفاظت کی بھرپور کوشش کی، اس مقصد کے لئے قید خانے کی اندھیاری کے نذر ہوگئے، شہید ہوئے، غازی بنے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اب ان کی اکثریت ہمارے مابین نہیں رہے، مگر ان غزاۃ وشہداء کی پاک روحیں دیکھ

رہی ہیں کہ ان کی قربانیوں سے کون کون مستفید اور کون کون فیضیاب ہو رہے ہیں، اگر ہم فراموش کرنے والے نہیں ہیں تو ہم ان شہیدوں اور غازیوں کو کبھی بھی نہیں بھول سکتے، ہر چند کہ وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے، لیکن ان کا ملت و ملک پر نچھاور کیا ہوا لہو، جانے والوں کا قرض اور آنے والوں کی امانت ہے، اگر ہماری قوم ان کی جان نثاری، جرات وعزیمت کو نظر انداز کرتی ہے تو بجا طور پر یہ شک پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری قوم زندہ بھی ہے یا نہیں؟

ہمارے اسلاف ہمت وحوصلہ، غیرت وشجاعت، عزم واستقلال، حب دینی اور حب الوطنی، حق وصداقت، انصاف وعدل گستری، رواداری وفیاضی غرض اخلاق عالیہ کے مجموعی طور پر مجسم تھے، اسی روشنی میں انہوں نے یہاں سے جہالت کو دور کیا، اور علم وعمل کی روشنی پھیلائی، آزادی کی یاد دلائی، حریت کا سبق پڑھایا، تہذیب وشائستگی کے چراغیں روشن کرکے فکر وتدبر اور علم وعمل کی روایات قائم کیں، وہ سب حقیقت میں اسلام کی تعلیمات سے سرشار تھے، انہوں نے ملک وملت کی فتح مندی اور کامرانی کے لئے جان کے نذرانے پیش کئے تھے، اسلامی جہاد پر ان کا یقین تھا، مگر اب ہم کیا ہوگئے ہیں کہ ان کے کارناموں کو بھی بھول جانے لگے ہیں، ہمارے منہ ان سے پھیرنے لگے، انہوں نے حصول آزادی اور انسداد غلامی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، مگر ہم نے غلامی کو اپنا شیوۂ زندگی بنالیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ارکان کے روہنگیا مسلمان بحیثیت قوم ایک زندہ دل اور معزز قوم ہے، جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ اس قوم کے اسلاف نے اپنے وطن میں ایمان وعقیدہ مسلک ومذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے قندیل نورانی اور چراغ روحانی جلایا تھا، یہاں انہوں نے وہی کچھ کیا، جو اسلام نے ان سے مطالبہ کیا تھا، انہوں نے یہاں کی اجڈ اور غیر مہذب قوموں کو اسلام کی روشن تہذیب وثقافت سے روشناس کرایا، اور ایک دنیا کی دنیا کو ظلمت واندھیاری کے مہیب طوفان سے نکال کر ہدایت وروشنی کی طرف لے آیا تھا، ان کی وجہ سے یہاں کی اجڈ قوموں کو وہ زندگی ملی، جس کے حصول کے بعد انسان تمام مخلوقات خداوندی سے برتر ہوکر اعلی سے اعلی مقام اور بلند سے بلند تر مراتب پر فائز ہوجاتا ہے۔

ہمارے ان بزرگوں کی دعوت وعزیمت کے واقعات اور کارناموں کی دھندلی سی نشانیاں اور جھلکیاں جو تاریخ کے صفحات میں ملتی ہیں، ان سے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ انہوں نے اشاعت

دین اور تبلیغ ملت اسلامیہ کے لئے زمانے کی چاہت وطلب کے مطابق مختلف حکمت عملیوں کو اپنایا تھا، ان میں سے ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو اس راہ دعوت وعزیمت میں اپنی اخلاقی بلندیوں، ذاتی خوبیوں اور کرداری رعنائیوں سے لوگوں کو متوالے بنائے اور اجڈ لوگوں کو اسلام کے حلقہ بگوش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان میں سے بعض عبقری شخصیات ایسی بھی پائے جاتی ہیں، جنہوں نے اپنے تطبیقی فیصلوں سے جہاد فی سبیل اللہ کے میدان کا انتخاب کیا، اور تیر وتفنگ، تلواروں اور نیزوں کے سائے تلے پل کر اسلام اور مسلمانوں کی آبرو بچائی تھی، اور جبھی موقع ملا تو یہاں اسلام کا نظام بھی قائم کیا، اور امن وآشتی، عدل مساوات کے ذریعے امن وطمانیت کی فضا قائم کر دی تھی۔

ہم اپنے ان بزرگوں میں عالی مشرب صوفیاء ودرویش، عالی ہمت علماء وصلحاء، روشن خیال شعراء وادباء، اور عالی مقام مولفین ومصنفین، دل دردمند دعاۃ ومصلحین، فکر ارجمند کے مالک دانشوران وسیاست دان، جان سوز رہنما ومرشدین، کوہ ہالہ سے ٹکر لینے والے قائدین وشہسواران، غرض سب کچھ پاتے ہیں، انہوں نے ہر دور میں بدلتی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی فضا اور ماحول کو خوب خوب سمجھا تھا، اور اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق دینی اور قومی ذمے داریاں خوب خوب نبھائی تھیں۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک ہم اپنے بزرگوں کو اسلام اور انسانیت، ملک اور قوم کی خدمات انجام دینے والے پاتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک چلنے والا جو سلسلۂ دعوت وجہاد نظر آرہا ہے، یہ دراصل ہمارے ان ماضی کے بزرگوں کی خدمات کی ایک روشن کڑی ہے، جس طرح ماضی میں ہمارے بزرگوں نے زمانے کی پرکٹھن پگڈنڈیوں کی چکر کاٹتے ہوئے اس سلسلہ کو باقی رکھا تھا، ٹھیک آج بھی ان کے نہج پر یہ سلسلہ منزل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں ہمارے بزرگوں نے ایک مرتبہ علم جہاد بلند کیا تھا، یہاں مسلمانوں کی جان ومال، عزت وناموس کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی، اس حوالے سے بہتوں نے اپنی اپنی جان کے نذ رانے پیش کئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح ۱۹۴۷ء میں حضرت جعفر حسین قوالی شہید نے ہمارے بزرگوں کے اس جہادی سلسلہ کو مزید نکھارا اور آگے بڑھایا تھا، بعد میں ان کے متبعین اور خوشہ چینوں نے ان پر چھائی ہوئی خزاں کو بہار کی شبنم سے آبیاری کرنے کی کوشش کی ہے، کیا ہم ان تمام حضرات کی خدمات و

کارناموں کو یکسر بھلا سکتے ہیں؟ کیا وہ عقیدت ومحبت کے کم سے کم گلدستے پانے کے لائق بھی نہیں ہیں؟ جی ہاں حق تو یہ ہے کہ ان پر عقیدت ومحبت کے جتنے بھی گلدستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہیں، ہم ان کے عقیدے ومسلک، فکر وجذبات، اولوالعزمی وعالی مشربی، قربانی وجان نثاری، اخوت ومحبت، پیار اور ہمدردی، عبادت وخدا ترسی، صبر وحق پسندی، فدائیت وللّٰہیت کو تہ دل سے سراہتے ہیں، اور ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں اور کرداری روشنیوں کو موجودہ لوگوں اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ اور معالم الطریق بھی سمجھتے ہیں۔

۱۹۴۲ء سے لے کر آج تک اس راہِ دعوت وعزیمت میں ہزاروں فدایان ملت وقوم نے اپنے بزرگوں کی طرح جان کے نذرانے پیش کئے، جن کی تفصیلات کے لئے ایک اکیڈیمی کے زیر سائے مرتب ہونے والا ایک موسوعہ کی ضرورت ہوگی۔ تحریک آزادی ارکان کے زیر سائے کام کرنے والے تمام مجاہدین وقائدین باشعور، زندہ دل اور مستقبل سے باخبر تھے، حقیقت میں یہ لوگ گفتار کے غازی نہ تھے، بلکہ کردار وعمل ان کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا، قربانی اور ایثار ان کی زندگی کا مقصد اصلی تھا، انہوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں سے درس عبرت حاصل کیا، دعوت وجہاد اسلامی کو شیوۂ حیات بنایا، انہوں نے طاغوت کی غلامی اختیار کرنے کے بجائے خون کا متلاطم سمندر پار کرنے کو مناسب سمجھا تھا، ان لوگوں نے کسی بھی قسم کی غلامی کو قبول نہیں کیا، اسلام کی بقا اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے دل کو دہلا دینے والے طوفان سے مقابلے پر مقابلہ کیا تھا۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں سے بعض کور بین اور نادان افراد آج اپنے ان بزرگوں کے جمیع مثبت کارناموں کو منفی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، حتی کہ چند افراد ایسے بھی نکلے ہیں کہ وہ نہ صرف جہاد و کفاح سے جی چراتے ہیں بلکہ انہیں برمیوں کی غلامی سے دلچسپی اور دل لگی اور طلب آزادی کی جدو جہد سے نفرت اور چھیڑ ہے، ان کے دل وضمیر کو اداسی اور نامرادی کی لت کھائی جا رہی ہے، انہوں نے قوم کی جائز چاہت وطلب کو جھانسہ دے کر دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے کو پسند کر لیا ہے۔

یہ بات جس بزرگ کی زبان یا قلم سے نکلی ہے بڑی سچی نکلی ہے کہ ایک قوم کی مذلت کو دو چار افراد کی کوشش دور نہیں کر سکتی، اسے دور کرنے کے لئے پوری قوم کو پوری تیاری، مستعدی اور دلسوزی کے ساتھ اجتماعی انداز میں کوشش کرنی ہوگی، ایک قوم کی سب سے بڑی خطا یہ ہوتی ہے کہ وہ ظلم واستبداد،

جبر وتشدد کے خلاف لڑنے اور حق کی آواز بلند کرنے سے دست بردار ہوجائے، چند افراد کے خون کے آنسو ایک قوم کی مظلومیت کے مقابل نہیں ہوسکتے، بلکہ مقابلہ کے لئے پوری قوم کی اجتماعی جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج ارکان کے روہنگیا مسلمانوں کو اپنے بجھتے ہوئے چراغ کو بچانے کے لئے شعلوں سے ٹکر لینے والے جان سوز پروانوں کے خونِ جگر کی ضرورت ہے، جس کے بغیر خزاں کا مارا ہوا یہ گلستان شبنم بہار سے کبھی بھی آشنا نہیں ہوسکتا۔

ہمارے پچھلے بزرگوں کی خدمات وکارناموں کے حوالے سے راقم الحروف کا اتنا یقین ہے کہ ہماری قومی وملی زندگی میں جتنے دھارے بہہ گئے اور آج بھی ایک حیرت انگیز انداز میں بہہ رہے ہیں، سیاست وقیادت کے جتنے چشمے ابل پڑے، اور میدان کارزار میں جتنی پاک روحوں کے عزائم بیدار، جوں، اور دار ورسن کی کشاکش سے غیر متزلزل رہے، یہ بس ان بزرگوں کی قربانی، جاں سوزی، اخلاص وللّٰہیت اور فدائیت کا فیضان ہے۔

یاد رہے کہ غیرت مندوں اور غازیوں کے روشن کارناموں اور ان کے اثرات ونتائج کا صحیح صحیح اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن وجلوس کی ہما ہمی، عیش وعشرت کا طرب ونشاط، تختوں اور تاجوں کی چمک دمک، تیر وتفنگ، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار سے نہیں کیا جاسکتا، اس کا صحیح صحیح اندازہ ٹوٹی ہوئی تلواروں، بکھرے ہوئے خیموں، دہکتی ہوئی روحوں، دمکتے ہوئے چہروں اور بہتے ہوئے خون کے دریاؤں سے کیا جاسکتا ہے۔

اور یہ بھی اچھی طرح یاد رہے کہ ظالم کے ظلم وجبر، استبداد وستم رانیاں جتنی بھی تپاں کیوں نہ ہوں، مگر ہر طلوع کے پردے میں راز ہائے زوال مضمر ہوتے ہیں، دنیا میں آج تک صبح کو بلند ہونے والا تپاں سورج اپنے غروب کے دھیما پن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکا، یہی حال ارکان کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والوں کا ہوگا، انشاء اللہ۔

آج ہم ارکان کے روہنگیا مسلمان جن حالات کے شکار ہیں، اور ہماری قومی تحریک نے پچھلے چند سالوں سے جس قسم کی چھلانگ لگا رکھی ہے، اس میں امید کی کرنی بڑی دھیمی نظر آرہی ہے، جہاں تک سیاست وقیادت کی دنیا میں قدم رکھ کر اندازہ کیا، اس کے پیش نظر ہمارے لئے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ پچھلے چند سالوں سے روہنگیا مسلمانوں کی سیاست وقیادت کا قدم آیا منزل کی طرف

بڑھ رہا ہے یا یہ میدان تیہ کی چکر کاٹنے میں مصروف؟ آیا روہنگیا مسلمانوں کی کہنے میں بڑی بڑی جماعتیں سیاست وانقلاب کے میدان میں اپنا واضح نصب العین جو غیر متزلزل ہو، متعین کرسکیں یا آئے دن اس حوالے سے غلطی پر غلطی کا مظاہرہ کررہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو قوم سیاست کے میدان میں ایک قدم بھی غلط اٹھا دیتی ہے، تو اس کی تقدیر کا قدم صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے، جس کا خمیازہ اس قوم کو نسلاً بعد نسل بھگتنا پڑتا ہے، اگر ہمارا اس طرح کا حال مزید باقی رہے گا تو آگے چل کر تباہیوں اور بربادیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، اس لئے عرض ہے کہ ہمیں اپنے اگلے قدم کو جوش کے بجائے ہوش سے ڈالنا ہوگا، اللہ تعالی ہمیں توفیق سے نوازے۔

بہر حال ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ مایوسی ایک ایسی بیماری ہے جو قوموں کے جسم سے عزم وعمل کی ساری توانائیوں کو سلب کرلیتی ہے، مایوسی کی وجہ سے انسان کے جذبات حالات کی برفیلی پگڈنڈیوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، ان کے اندر سے زندگی کی ساری امنگیں رخصت ہوجاتی ہیں، اور وہ مسلسل احساس کمتری میں مبتلا ہوکر بتدریج قعر مذلت میں گرجاتا ہے، اور جو قوم اپنی ذلت ونکبت پر راضی ہوکر جدو جہد کا دامن چھوڑ دیتی ہے، وہ قدرت کے تعاون سے محروم ہوجاتی ہے۔

اس لئے حالات جتنے بھی مایوس کن کیوں نہ ہوں، مگر اللہ تعالی کی ذات پر بھروسہ کرنا ہمارا فرض ہے، توکل اور صبر کے دامن تھامے ہمیں اپنے اندر از سر نو قوت مدافعت اور عزم وعمل کی توانائیاں لانی ضروری ہیں، اگر ہم نے اپنی رہی سہی صلاحیت واستعداد کو مستحکم کیا، تو یقین ہے کہ راستے کا کہرا ہمارے سروں سے جلد چھٹ جائے گا، جس سے ہمارے مستقبل کی راہیں روشن ہوجائیں گی، ہماری ترقی کا راستہ بڑی تیزی سے صاف ہوجائے گا۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روہنگیا قوم ایک سعادت مند قوم ہے، جس کی تقدیر میں جہاد کا فریضہ لکھا گیا ہے، اور یاد رہے کہ سرزمین ارکان ایک ایسی سرزمین ہے کہ جو جنوب شرق ایشیا کے لئے باب الاسلام کا درجہ رکھتی ہے، یہ زمین مستقبل میں ایک مضبوط اور غیر مسخر اسلامی گھاٹی میں تبدیل ہوسکتی ہے، اگر چاہے خدا کرے۔

بہر حال زیر نظر مجموعہ (تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے) ہماری آنے والی نسلوں کے لئے سعادت کی زندگی کا ایک پیغام ہے، جسے یادوں اور تذکاروں کا گلدستہ، آنسوؤں کا مالا، جان نثاروں کی روداد

جان سپاری اور فدایانِ قوم وملت کی داستان الفت ومحبت کہا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعہ ایک تاریخ تو نہیں، لیکن تاریخ کا احتجاج ضرور ہے، یہ مجموعہ فکری نظر بندوں کی کم نگاہی، مورخین یا تذکرہ نگاروں کا ماتم، سیاسی وانقلابی مجبوریوں کا نوحہ، پس ماندگان تحریک کا مرثیہ اور اسلامیاں ارکان کے جذبوں کا امین بھی ہے، اس مجموعہ میں جتنے بھی تذکرے ہیں تقریبا ہر ایک مختصر تجزیے پر مشتمل ہیں، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کی درسگاہوں سے درس خود فراموشی کرنے والے جوانوں کو یہ علم ہو کہ ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے، اور یہ سوچ کہ ہماری حالت ایسی کیوں کر ہو گئی۔

اس مجموعہ میں شامل بیشتر ستاروں کے حالات و واقعات کو جمع کرنے میں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں، کوشش تو کی گئی، مگر غلطی کے امکانات بہت ہیں، پھر ممکن ہے کہ قارئینِ کرام کو اس میں کہیں کہیں جذبات کا عنصر بھی نظر آئے گا، تاہم اس حوالے سے ہم کسی بھی معذرت کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے موضوع پر قلم اٹھانا ہے تو جذبات سے بالکل برتر ہو کر اٹھانا امکانیات سے نہیں ہے، لیکن یہ بھی یہ وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہ جذبات صرف اسلوب نگارش اور بیان احوال کی حد تک ہے، حقائق وواقعات کی استنادی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ **ھذا۔ و صلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد و آله و صحبه و سلم۔**

بیاد رفتگاں دو چار آنسو
اب اپنا یہ فریضہ رہ گیا ہے

خاکسار/

محمد طاہر جمال ندوی

۰۳/ دسمبر/ ۲۰۲۲

شیخ طریقت شاہ صوفی حضرت ابوالخیر صاحب بوسیدنگی

شاہ ابوالخیر صاحب کی ولادت ۱۹۱۳ء میں شاہ فریر دیپ ٹیکناف میں ہوئی، آپ کے والد جناب مقبول علی صاحب کے متعلق اطلاع ہے کہ وہ مجذوب قسم کے آدمی تھے، چنانچہ ادھر ادھر مارے مارے پھرا کرتے تھے، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''پیر صاحب کے والد محترم جناب مقبول علی صاحب کا دماغی توازن درست نہیں تھا، اس لئے وہ مارے مارے پھرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ انہیں مقبول پاگلا کے نام و لقب سے یاد کرتے تھے، چونکہ مقبول صاحب کے صرف ایک صاحب زادے (پیر صاحب) تھے اور وہ بھی انتہائی خوبصورت، اس لئے لوگ مقبول صاحب اور پیر صاحب کو انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، نیز لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہ مست قلندر مجذوب ہے جو اللہ کا نیک بندہ ہے''۔(۱)

حکومت برطانیہ کی تھی، اس لئے نقل مکانی میں کوئی مشکلات نہیں ہوتی تھیں، چنانچہ آپ کے والد مقبول صاحب نے بعض وجوہات کی بنیاد پر شاہ فریر دیپ سے پتھری قلعہ کا معروف علاقہ رائی شنگ میں نقل مکانی کی، ان کی نقل مکانی کا واقعہ تقریباً ۱۸۲۳ء کا تھا، واقعۂ کرب بلاء یعنی ۱۹۴۲ء کا واقعہ پیش آیا تو یہ گھرانہ رائی شنگ سے منتقل ہو کر جنوبی بوسیدنگ کی بستی تیتو پوک چلا آیا، وہاں مقبول صاحب کا انتقال ہو گیا تھا، مقبول صاحب کا جہاں تک پتہ چلا کہ وہ ایک درویش انسان تھے، اور حضرت پیر صاحب کی والدہ بھی بڑی اچھی خاتون تھی، والد کے انتقال پر ملال کے بعد والدہ نے اور ایک آدمی سے نکاح کیا تھا۔

حضرت پیر صاحب کے تعلیمی حالات کا جہاں تک پتہ چلا کہ آپ باضابطہ عالم نہیں تھے، والد محترم کے انتقال پر ملال کے بعد آپ پر مصیبت کی بدلی چھا گئی تھی، چنانچہ باضابطہ حصول علم کی کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے تھے، آپ کے تعلیمی حالات پر مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان و برما، ص: ۲۰۸۔

''چونکہ پیر صاحب کے والد رحمۃ اللہ علیہ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، غریب خانہ میں زندگی گزر رہی تھی اور پیر صاحب کو ہجرتوں کی پر مشقت راہوں سے گزرنا پڑا تھا، اس لئے پیر صاحب کو باقاعدہ مستند عالم دین ہونے کا موقع نہیں ملا، تاہم پیر صاحب نے نورالایضاح، قدوری، ہدایۃ النحو، قلیوبی اور علم الصیغہ تک کی کتابیں درسا پڑھ لیں، اللہ تعالی نے سیدالطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح پیر صاحب کو بھی وہ بلند مقام عطا فرمایا جو خال خال ہی کسی کو ملتا ہے''۔(۱)

پیر صاحب بڑے ذہین وفطین آدمی تھے، جتنا بھی پڑا بہت اچھا ہی پڑا تھا، آپ کو ضروری دینی مسائل پر خاصی مہارت تھی، اگر تکمیل کر سکتے تو خدا معلوم کتنے بڑے عالم دین ہوتے، بہر حال آپ ضابطے کے عالم نہیں تھے، مگر دینی مسائل پر آپ کو کافی عبور حاصل تھا، آپ نے اپنے علاقے تیتو یوک کی جامع مسجد میں امامت اور خطابت کا فریضہ انجام دیا تھا، کہتے ہیں کہ یہاں آپ کی ملاقات حضرت پیر صاحب صاحب بازاری سے ہوئی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کا بیان ملاحظہ ہو کہ:

''۱۹۵۴ء کے لگ بھگ پیر صاحب صاحب بازار (شاب بازار) چلے گئے اور وہاں امامت وخطابت شروع کردی، امامت وخطابت کے دوران خیال آیا بلکہ من جانب اللہ الہام ہوا کہ کتب بینی پر قطب بینی کو فضیلت حاصل ہے، ظاہری علوم کے بجائے باطنی علوم حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے، اور کسی مرد صالح کے ہاتھ پر بیعت کے بغیر راہ راست اور صراط مستقیم پر چلنا مشکل ہے، ابھی پیر صاحب اسی فکر میں تھے کہ اچانک پیر صاحب کی ملاقات پیران پیر شاہ محمد ہاشم صاحب سے ہوگئی، چنانچہ اب پیر صاحبؒ شاہ محمد ہاشم کی خدمت میں مصروف ہو گئے، پیر صاحب ۱۹۵۵ء میں شاہ محمد ہاشم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی رسم ادا کی، بیعت کے بعد مسلسل تین سال حضرت شاہ محمد ہاشم کی خدمت

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۰۸۔

میں رہے، اور ۱۹۵۷ء میں حضرت شاہ محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ نے پیر صاحب کو خرقہ خلافت عطا کیا، اور شاہ صاحب نے پیر صاحب کو اپنے دست مبارک سے خلافت کے متعلق جو تحریر دی اس کا عکس تحریرا الگ طور پر یہاں منسلک ہے''۔(۱)

خلافت واجازت ملنے کے بعد آپ نے سلسلۂ پیری مریدی کا آغاز کردیا، ویسے ارکان میں آپ کے سینکڑوں مریدان پائے جاتے ہیں، آپ ۱۷۱۰۱ء میں رنگون تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی آپ نے اپنے سلسلہ کو جاری رکھا تھا، چنانچہ وہاں بھی آپ کے بہتوں مریدان پائے جاتے ہیں، پھر آپ نے ۱۹۸۱ء میں ارکان برما کو خیرباد کہہ کر نہ جانے کس وجہ سے تھا کہ اپنے وطن سے دور جا کر زندگی کے بقیہ حصہ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا، بہر حال آپ ۱۹۸۱ء میں کراچی پہنچے، وہاں سوکوارٹر کے قریب ایک جگہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، آج بھی اس جگہ کو عام لوگ پیر صاحب فارہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، ۱۹۸۶ء میں آپ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے جہاز مقدس پہنچے، یہاں آپ نے تقریبا چار مہینوں تک قیام فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ آپ حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ ہوئے تھے۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے حضرت پیر صاحب کے درجن سے زیادہ خواب کا تذکرہ کیا ہے، اگر کسی کو شوق مطالعہ ہے تو مولانا کی کتاب ''مشاہیر ارکان برما'' کھول کر دیکھ سکتے ہیں، دراصل اللہ والوں کا خواب بھی عجیب وغریب قسم کا ہوتا ہے، ہم جیسے عام اور کور باطن کی بس کی بات نہیں ہے کہ اللہ والوں کے خواب پر کچھ بھی تبصرہ کریں، ویسے آپ کی بڑی بڑی کرامات کی بات بھی لوگوں کی زبانی سننے میں آئی، ان میں سے ایک کرامت کا تذکرہ بھی مولانا حافظ محمد صدیق نے اپنی مذکورہ کتاب میں کیا ہے، جو یہ ہے کہ:

''پیر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ دوران مراقبہ میری روح نکل کر اللہ سے جاملی، اور میری ظاہری زندگی ختم ہوگئی، میری یہ حالت دیکھ کر کافی لوگ جمع ہوگئے، لیکن

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۰۸۔

کچھ دیر کے بعد دوبارہ روح لوٹ کر آئی اور مجھے نئی زندگی ملی، پیر صاحب کے
بڑے صاحب زادے مولانا سید حسین صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے کئی دفعہ
مشاہدہ کیا کہ پیر صاحب جب سوجاتے ہیں تو سینہ مبارک سے ایک نور نکلتا ہوا نظر
آتا ہے، لیکن بیداری کے بعد یہ کرامت ختم ہوجاتی ہے''۔(۱)

عجیب اور دلچسپ کرامت ہے، جو اللہ والوں سے ہی ظہور ہوسکتی ہے، ایسی ساری چیزیں ہم کور باطن کے لئے انوکھی نہیں تو اور کیا ہے، اللہ تعالی آپ کے مقام ومرتبہ کو مزید بلند کرے۔

حضرت پیر صاحب کے مریدوں کی تعداد ہزاروں ہے، آپ نے جن حضرات کو بیعت کرنے کی اجازت عطا کی، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) مولانا عبد السبحان صاحب بوسیدنگی۔
(۲) مولانا علی حسین صاحب کچار فاروی، بوسیدنگی۔
(۳) مولانا سراج صاحب گلشن بہار، کراچی۔
(۴) صوفی عبد الرحمن صاحب چنیزہ۔
(۵) جناب ماسٹر عبد الرحمن صاحب کے ایریا بی کراچی۔
(۶) جناب عبد الشکور صاحب برمی کالونی، کراچی۔
(۷) جناب مولانا محمد عثمان صاحب نورانی بستی، کراچی۔
(۸) مولانا سید حسین صاحب (آپ کا صاحب زادہ)۔
(۹) جناب ابو الباصر صاحب سوکوارٹر، کراچی۔(۲)
(۱۰) جناب محمد اسحاق صاحب۔
(۱۱) مولانا محمد شفیق صاحب۔

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۲۰۱۲۔

(۲) حافظ محمد صدیق صاحب نے روایت کی ہے کہ ابو الباصر صاحب سے خلافت سلب کر لی گئی ہے، وہ اس لئے کہ انہوں نے راہ سنت سے بغاوت کی اور بدعت وخرافات کی طرف مائل ہوگئے تھے۔

پیر صاحب اپنے خلفاء اور مجاز بیعت کو وہ سند عطا کرتے تھے، جو ان کے پیر ومرشد حضرت شاہ ہاشم صاحب نے ان کو عطا کی تھی، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کی کتاب سے مستعار لے کر اس سند کا متن یہاں درج کر دیا جائے:

الحمد للہ رب العالمین وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد: فقیر محمد ہاشم اصلح اللہ شانہ میگوید کہ ابو الخیر ازیں فقیر را بیعت وخلافت ہم چنانکہ این فقیر از مولانا الحاج ظہیر الدین مستفیض گردیدہ اند، خدائے تعالی او را امداد وارشاد وتلقین ثابت قدم دارد، واستقامت واخلاص وتقوی وحلم وسخاوت وجود را شعار خود سازند، تا از زمرۂ ارباب نفوس قدسیہ وقلوب مطہرہ ذکیہ شوند، باقی توفیق باد۔

از: محمد ہاشم صاحب بازاری۔

حضرت شاہ ابو الخیر صاحب اپنے مریدوں کو بیعت کے بعد درج ذیل اذکار کی تلقین کرتے تھے:

(۱) لطیفہ قلب: اللہ اللہ کا ورد اس انداز سے کیا جائے کہ بائیں پستان کے دو انگل نیچے سے لفظ اللہ صادر ہو۔
(۲) لطیفۂ روح: اللہ اللہ کا ورد اس انداز سے کیا جائے کہ دائیں پستان کے نیچے سے اللہ اللہ کی آواز نکلے۔
(۳) لطیفہ سر: کلیجہ کے قریب جو نرم ہڈی ہے، وہاں سے اللہ اللہ کی آواز نکلے۔
(۴) لطیفہ نفس: ناف کے قریب سے اللہ اللہ کا ورد ہو۔
(۵) لطیفۂ خفی: دماغ کے اگلے حصے سے اللہ اللہ کا ورہو۔
(۶) لطیفۂ اخفی: دماغ کے پچھلے حصہ سے اللہ اللہ کا ورد ہو۔
(۷) لطیفہ دم کشی: ایک سانس میں کئی مرتبہ اللہ اللہ کا ورد کیا جاسکے، اور اس کی تمرین ہو۔
(۸) لطیفہ ذکر سلطان: غالبا یہ سلطان الاذکار ہے، لا ناف سے دل دماغ کے دائیں جانب سے اور الا اللہ بائیں جانب سے ورد ہو، اور ذکر اللہ کے دوران زبان، ہونٹ اور آنکھیں پوری طرح بند ہو، اسی دوران پورے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے اور ہر اعضائے جوارح سے لفظ اللہ کی آواز نکالی جائے۔
(۹) لطیفہ عالم فنا: لا موجود الا اللہ اور لا فاعل الا اللہ کا ورد کرنا۔
(۱۰) لطیفۂ جسم فنا: لا موجود الا اللہ اور لا فاعل الا اللہ کا ورد کرنا۔

(۱۱) لطیفۂ پردۂ طے: اس کے ذریعے وصول الی الحق کا درجہ حاصل کرنا۔(۱)

جہاں تک پتہ چلا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ چاروں معروف سلسلہ صوفیہ میں لوگوں کو بیعت کرتے تھے، ہر ایک کو اس کے مزاج کے موافق اوراد واذکار عطا فرمایا کرتے تھے، طریقہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ، چشتیہ وقادریہ میں سے اکثر وبیشتر نقشبندیہ محمدیہ کی طرف آپ کا میلان تھا۔

(۱) ملاحظہ ہو: حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان وبرما، ص: ۲۱۲۔۲۱۵۔

حضرت مولانا ابوالخیر صاحب، سنبنوی، منگڈوی

مولانا ابوالخیر کی ولادت جنوبی منگڈو کی بستی سنبنیہ میں ہوئی، مولانا کا سلسلۂ نسب سرزمین ارکان کے ایک نامور بزرگ حضرت حسن شاہ صاحب سے ملتا ہے، جن کا مزار پاک ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب میں زیارت گہِ خاص وعام ہے۔

جہاں تک پتہ چلا کہ مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہوئی، بعد میں بنگال کی موجودہ دینی، علمی اور روحانی درسگاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، مشہور روایت کے مطابق آپ وہیں کے فارغ التحصیل ہیں، جبکہ دوسری اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے علوم اسلامیہ کی تکمیل کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی تھی، تاہم موخر الذکر روایت قرین قیاس اس لئے ہے کہ آپ نے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی، پھر حضرت حاجی صاحب کی ہجرت کے بعد مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی طرف رجوع کر کے تجدید بیعت کی اور ان کے حلقۂ مریدان میں شامل ہو گئے تھے۔ خیر آپ کی فراغت جہاں سے بھی ہو، لیکن یہ طے ہے کہ آپ نے ان دونوں بزرگوں سے بیعت ضرور کی تھی۔

ابوالخیر صاحب فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور رنگون کا سفر کیا، بعد میں برما کا مشہور شہر مکٹیلا انٹر میڈیٹ کالج سے آئی اے کی ڈگری حاصل کر کے وہاں کے ایک ہائی اسکول میں کئی سالوں تک تدریسی خدمات بھی انجام دی تھیں۔

مرحوم اپنے زمانے میں انگریزی حکومت کی عمل داری کے دوران صوبۂ ارکان کی حکومت کے رکن رکین رہے تھے، علاوہ بریں مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ، مدرسہ امداد العلوم علی تانجو، مدرسہ قاسم العلوم چارکمبو اور دارالعلوم میانجاپور کے تاحیات شوری کے ممبر رہ چکے تھے۔

ابوالخیر صاحب ایک عالم دین، دور اندیش دانشور، اور صاحب بصیرت سیاست دان تھے، علاوہ ازیں حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مرید ہونے کی وجہ سے علمائے ارکان کے یہاں آپ کی بڑی قدر ومنزلت تھی، اور عوام الناس میں آپ کی بزرگی اور خداترسی

کا خاصا دھوم بھی تھا۔

ملک برما سے واپسی کے بعد مولانا ابوالخیر صاحب نے ارکان اور برما کے مختلف علاقوں میں تبلیغ وتلقین اور تعلیم وارشاد کے حوالے سے مختلف دورے کئے تھے، جہاں بھی گئے شرک وبدعات اور خلاف شرع رسومات کو اپنے مواعظ حسنہ اور حکمت بالغہ کے ذریعے مٹانے کی کوشش کی، آپ ایک عظیم عالم دین، بڑے پائے کا مصلح اور داعی انسان تھے۔

یادرہے کہ مولانا مرحوم حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب چارکمبوی کے نانا جان تھے، اللہ تعالی آپ کی طرح آپ کے نواسہ کو بھی دین کے لئے قبول فرمایا تھا، حافظ صاحب مرحوم نے بھی تعلیم وتدریس، تبلیغ وتلقین اور اسلامی جہاد میں اپنی ساری زندگی کھپائی تھی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ان دونوں کے مساعی جمیلہ کو قبول کرے اور ان کی اولاد واحفاد، تلانذہ اور متعلقین میں ان کی طرح زندہ دل انسان پیدا ہو، آمین یارب العالمین۔

مولوی ابو یوسف شہید شیتا فوریکوی

ابو یوسف بن مولانا امجد حسین صاحب موضع شیتا فوریکہ جنوبی منگڈو میں ۱۹۷۵ء میں پیدا ہوئے، ناظرۂ قرآن مجید اور ابتدائی درجات کی تکمیل کے بعد ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک مدرسہ امداد العلوم علی نانجو سے متوسط کی تعلیم حاصل کی، انہوں نے ۱۹۹۱ء میں بنگلادیش کی طرف ہجرت کی، اس کے بعد روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے زیر انتظام مدرسہ ابن عباس میں بقیہ تعلیم مکمل کرکے سند فراغت حاصل کی، انہوں نے بخاری شریف کا درس شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود الحسن شرف الدین بیلوی سے لیا، علاوہ ان کے مولانا حافظ حبیب اللہ، مولانا محمد علی اور خود ان کے والد مولانا امجد حسین صاحب ان کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

مولوی ابو یوسف بڑے بہادر اور بےخوف آدمی تھے، انہوں نے ارایس او میں شامل ہوکر جہاد اسلامی کی تربیت حاصل کی، ۱۹۹۴ء کے عملی جہاد میں ایک مجاہد کی حیثیت سے کمانڈر مولانا صدیق الرحمن صاحب شہید کے گروپ میں شامل ہوئے، جو جنوبی منگڈو میں جہادی کاروائیاں کررہے تھے، ابو یوسف کی وہاں پر بےخوفی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس نے اپنے علاقہ میں پہنچنے کے بعد ایک جگہ پر پڑاؤ ڈالا تھا، اتفاقا قریب ہی کچھ فاصلے پر دشمن نے بھی ایک کیمپ لگا رکھا تھا، چنانچہ ابو یوسف چپکے سے اس کیمپ میں پہنچے اور دشمن کے پکایا ہوا چاولوں کا بڑا دیگچہ اٹھالائے، جسے مجاہدین نے دن بھر مزے لے لےکر کھایا تھا۔

ابو یوسف تکنیکی ذہن کا مالک تھے، ریڈیو وائرلس کے تار وغیرہ درست کرنے کے ماہر تھے، انہیں اسلحہ جات کو ٹھیک کرنے کی بھی مہارت حاصل تھی، آخر کار ایک معرکہ میں مولانا صدیق الرحمن صاحب کے ساتھ شہید ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالی نے مولوی صاحب کو جہاد کے لئے قبول فرمایا، وہ بالآخر شہادت کے اعلی رتبہ پر فائز ہوئے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی زندگی اور جہاد وشہادت کو قبول فرمائے۔

مولوی ابو یوسف صاحب کی پوری زندگی ہنسی خوشی میں گزری، لوگوں سے پہل کرکے ملاقات کرنا ان کا شیوہ تھا، کسی کا دل دکھانا نہیں جانتے تھے، اس لئے ان کے دوست واحباب کی تعداد بہت زیادہ ہے، سب ان سے محبت رکھتے تھے، مولوی صاحب اساتذہ کا بھی نہایت ادب کرتے تھے۔

حضرت مولانا احمد علی شہید انڈانگی، منگڈوی

مولانا احمد علی صاحب جنوبی منگڈو کے معروف گاؤں انڈانگ میں ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب اور مسجد میں حاصل کی، مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ اور مدرسہ محمدیہ فرانفورو سے ہوتے ہوئے دورۂ حدیث کی تکمیل جامع العلوم شقدار فارہ منگڈو سے کی، ان کے والد صاحب زمیندار تھے، ان کے گھر میں کافی فراغت تھی، حصول تعلیم کے بعد انہوں نے دعوت دین اور درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اپنے گاؤں کے مدرسہ اور مسجد کا اہتمام سنبھالا، اور آخری دم تک اس مشغلہ کو جاری رکھا تھا، کہتے ہیں کہ مولانا صاحب دینی خدمات انجام تو دیتے تھے مگر معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

ارکان میں جماعت اسلامی طرف سے تحریک اسلامی کی دعوت پہنچی تو اولین مرحلے میں لبیک کہنے والوں میں مولانا بھی شامل تھے، اس کے بعد وہ چین سے کبھی نہیں بیٹھے تھے، دعوت وجہاد کے سلسلے میں انہوں نے دن رات کو ایک کر دیا تھا، جان ہتھیلی پر لے کر گھر گھر پہنچے، چنانچہ بعض جاننے والے کہتے ہیں کہ دعوت کی دھن ان پر ہمیشہ سوار رہتی تھی۔

مرکز اراایس او اور اس جماعت کی قیادات کے ساتھ مولانا احمد علی کا گہرا رابطہ رہا تھا، ہمہ وقت ہدایات کے منتظر اور تعمیل حکم کے لئے تیار رہتے تھے، علاوہ ازیں مقررہ میعاد پر ضروری سامان کی ترسیل کے ساتھ اہم اور غیر معمولی حالات وواقعات کی رپورٹ بھی باقاعدگی سے فراہم کیا کرتے تھے، چنانچہ ان کی وجہ سے تنظیم کے شعبہ نشر واشاعت کو بڑی سہولت ملتی رہتی تھی۔

مولانا نے بنگلہ دیش، پاکستان اور سعودی کا بھی سفر کیا، تاہم کہیں بھی مستقل قیام نہیں کیا تھا، وہ کہتے تھے کہ مجھے ناقص صلاحیتوں کے ساتھ جتنی بھی توفیق اللہ تعالی کی طرف سے ملی ہے اُن ساری خدمات کا زیادہ حق دار میرا اپنا وطن اور اپنی قوم ہے، جب تک اللہ کو منظور ہو اور بالکل مجبور نہ ہو جاؤں گا تب تک ترک وطن نہیں کروں گا۔

ایک روایت کے مطابق مولانا اکثر کہا کرتے تھے کہ میری صرف دو آرزو ہیں، پہلی یہ کہ ارکان میں جہاد ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھوں، جب کہ دوسری آرزو یہ ہے کہ مجاہدین کی نصرت کرتے ہوئے شہادت کا درجہ حاصل کرلوں۔

چنانچہ اللہ تعالی نے مولانا کی تمنائیں پوری کیں، ۱۹۹۴ء میں اراایس او کے مجاہدین ارکان میں برسوں کے تعطل کے بعد برمی درندوں کے خلاف جہادی کاروائی کا آغاز کیا تو مولانا نے بھی اپنا عہد خوب خوب نبھایا، جہاں تک ممکن ہوسکا انہوں نے مجاہدین کی بھرپور امداد ونصرت کی، برمی افواج کی نقل و حرکت اور ان کے ٹھکانوں سے مجاہدین کو لمحہ بہ لمحہ باخبر رکھا، مجاہدین کے لئے دوائی اور غذائی رسد جتنا بھی ممکن تھا فراہم کیا، رات ہو یا دن بھیس بدل بدل کر مجاہدین کے خفیہ ٹھکانوں تک کئی بار پہنچے، ان کی اطلاعات سے مجاہدین نے خاطر خواہ استفادہ کیا اور جہادی منصوبہ بندی کی، علاوہ ازیں وہ بذات خود دشمن کے گھات میں بیٹھے اور شب خون بھی مارے تھے۔

مولانا احمد علی صاحب باقاعدہ تربیت یافتہ مجاہد تو نہیں تھے، لیکن بعض امور مجاہدین کے حوالے سے مجاہدین سے بھی بڑھ کر تھے، وہ مجاہدین کے رہبر، مربی، انصار اور مددگار تھے، دراں حالیکہ جس کی حاجت مجاہدین کو قدم قدم پر پیش آتی تھی۔

بعد ازاں دشمن نے ہزاروں کی نفری اس علاقے میں لا جمع کی، ہر قدم پر فوج کھڑی کردی گئی، برمی فوج اور مجاہدین کے بیچ بطور ڈھال نہتے مقامی روہنگیا مسلمانوں کی انسانی دیوار کھڑی کردی تو اس وقت مولانا کے علاقے میں مجاہدین کا قریب ترین متعین دستہ کما نڈر مولوی محمد یونس جہادی ہولاپوی/اولافوی کے ماتحت تھا، دشمن نے ان کے گرد بہت سخت گھیرا ڈالا ہوا تھا، اب مجاہدین کے پاس رسد بالکل ختم ہو گیا تھا، ایسی حالت میں بھی مولانا احمد علی کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی راستے سے مجاہدین کو رسد پہنچانے کی کوشش میں رہے تھے، آخر کار دشمن کو ان کی حرکات وسرگرمیوں کا اندازہ ہو گیا تھا، ظاہر ہے کہ یہاں منافقین کی بھی تو کوئی کمی نہیں تھی، مولانا کے متعلق منافقین نے پہلے سے دشمن کے کان بھر چکے تھے۔

آخر کار مولانا کی آخری تمنا بھی پوری ہوگئی، وہ دشمن کے ہاتھوں رنگے ہاتھ پکڑے گئے، واقعہ یہ ہے کہ وہ فجر سے پہلے تھوڑے پکے ہوئے چاول کیلے کے پتوں پر لپیٹ کر چھپتے چھپاتے مجاہدین تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے، ساتھ ایک چچازاد بھائی بھی تھا، پکڑے جانے کے بعد ان دونوں کو قریب کی فوجی چھاؤنی لے جایا گیا، اس حوالے سے ان کے اس چچازاد بھائی کا بیان ہے کہ:

''وہاں ہم دونوں کے ساتھ تشدد اور ایذا رسانی کا ہر طریقہ آزمایا گیا، مولانا کو تو سخت تاذیت کا نشانہ بنایا گیا لیکن مجھے نسبتاً کچھ کم، چنانچہ تشدد کے دوران مولانا احمد علی صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور مجھے بالکل معذور کر کے نشان عبرت بنا کر چھوڑ دیا گیا''۔

مولانا صحیح معنی کے عالم دین اور ایک نیک سیرت، پاکباز انسان تھے، کم گو، نرم مزاج، امانت دار اور صداقت شعار بھی، جو بھی ان سے خواہ ایک بار ہی سہی ملتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، طبیعت میں بڑا گداز تھا، اور نہایت خلیق اور نہایت ملنسار تھے، ان کے تواضع وانکساری، دعوت دین، جہاد اسلامی اور اہل حق کی خاطر تھی، باطل پرستوں، منافقوں اور دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے یا بننے والوں کے لئے وہ ایک آہنی دیوار تھے۔

مولانا احمد علی صاحب ۴۵ /سال کی عمر میں شہید ہوئے، ان کے پسماندگان میں بوڑھے والد، اہلیہ اور چھ بچے ہیں، اللہ تعالی ان سب کو صبر جمیل عطا کرنے کے ساتھ ان کی قربانیوں اور شہادت کو قبول فرمائے، آمین۔

حافظ اختر حسین صاحب، مجاہد، کوار بیلی، منگڈوی

حافظ اختر حسین صاحب کی ولادت تقریباً ۱۹۱۶ء میں کوار بیل شمالی منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد صاحب کا نام الحاج شاعر محمد تھا، جو گاؤں کے ایک زمیندار ہونے کے ساتھ ایک دین دار اور علم دوست آدمی تھے، کہتے ہیں کہ حافظ صاحب کی والدہ محترمہ علمائے دین اور حفاظ القرآن سے نہایت محبت کرنے والی خاتون تھی۔

اختر حسین صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی، ابھی قرآن کریم کا ناظرہ ختم ہوا تو آپ کے والد صاحب نے آپ کو قریب کے ایک حفظ خانہ میں داخل کرا دیا، چونکہ آپ بڑے ذہین وفطین تھے تو آپ نے دو سال کے اندر قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، آپ ایک حافظ القرآن ہو پانے کی وجہ سے نہ صرف والدین بلکہ علاقہ بھر کے لوگوں کے نور نظر بن گئے تھے۔

حفظ قرآن سے فراغت کے بعد اختر حسین صاحب قریب کے ایک سرکاری اسکول میں بھرتی ہو گئے، جہاں سے آپ نے ساتویں کے امتحان میں پاس کیا، اس کے بعد آپ کو اگلی تعلیم کے لئے ہندوستان بھیجا گیا، اور مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہو گئے، لیکن چند دن کے اندر آپ پر ایک کنواری لڑکی نظر پڑ گئی، چنانچہ اس سے کسی طرح جان بچا کر وطن چلے آئے اور گھر کے کام کاج میں لگ گئے تھے۔

ایک دن کا واقعہ تھا کہ اختر حسین صاحب اپنی کھیت کے غلے بیچنے کے لئے دریائے ناف پار کر کے نہلا گئے ہوئے تھے، آپ کو غلے کے عوض میں دو سو روپے ملے تھے، یکایک آپ کی ملاقات قائد مجاہدین محمد جعفر حسین قوال سے ہو گئی، وہ قائد کے جادو بیانی سے کافی متاثر ہو گئے، چنانچہ آپ گھر واپس ہوئے بغیر فقیرہ بازار چلے گئے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا تھا کہ اختر حسین صاحب جہاد کونسل میں شامل ہو گئے تھے، ابتدا میں آپ نے عسکری تربیت حاصل کی، بعد میں آپ کی استعداد اور صلاحیت کا جوہرہ کھلا تو خود جعفر حسین قوال نے آپ کو مجاہدین کے ایک گروپ کا کمانڈر بنا دیا، جس کے بعد آپ نے خلوص وللّٰہیت سے کام کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ آگے چل کر قائد تحریک کو آپ پر کافی اعتماد ہو گیا، ان کو یقین ہو چلا کہ اختر حسین

ایک دن مجاہدین کی قیادت سنبھال سکیں گے۔

محمد جعفر حسین کی معزولی پر اختر حسین صاحب جہاد کونسل سے بگڑ گئے، چونکہ آپ مجاہد اعظم کے فدائین میں سے تھے تو آپ نے یہاں زور سے اس معزولی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، مگر آپ کی نہ سنی گئی تو آپ مجبوراً خاموش ہو گئے تھے۔

بعد ازاں آپ نے جہاد کونسل سے علیحدگی اختیار کر کے ایک گروپ کی قیادت شروع کر دی تھی، جس کی وجہ سے آپ کے ساتھ جہاد کونسل کی رنجش شروع ہو گئی تھی، ویسے محمد جعفر حسین کی شہادت کے بعد آپ نے مکمل ایک قائد ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

محمد جعفر حسین کی شہادت کے بعد جہاد کونسل اور مجاہد پارٹی کے درمیان رسہ کشی کے دوران اختر حسین صاحب غیر جانب دار رہے تھے، لیکن بعد میں مجاہد پارٹی نے جہاد کونسل پر چڑھائی کر دی تو اختر حسین مجاہد پارٹی کے شدید مخالف ہو گئے، تاہم اگلے ایک سال کے بعد یہ مخالفت موافقت میں تبدیل ہو گئی تھی، چنانچہ آپ مجاہد پارٹی کے ساتھ ایک معاہدہ کر اس میں ضم ہو گئے تھے۔

مجاہد پارٹی میں ضم ہو جانے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ حکومت کے چند گماشتوں نے قاسم کے کان بھر دیا کہ اختر حسین ابھی پارٹی کے مخالفت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، چنانچہ قاسم راجا صاحب نے ڈھاکہ جانے سے قبل اپنے دو مجاہد کو حکم دیا کہ اختر حسین کو حراست میں لے کر تومبرو سے کولونگ بھیج دیا جائے، ساتھ ساتھ قاسم نے کرنل بدیع الزمان کے نام ایک خط بھی لکھ دیا، جس میں کہا گیا تھا کہ بدیع الزمان اختر حسین جب آپ کے پاس پہنچیں گے تو انہی حراست میں رکھنا اور میرے آنے تک ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے کا اچھا انتظام کرنا۔

اسی زمانے میں موضع تمبرو میں محمد قاسم صاحب کے ایک کرانی تھا، جسے لوگ لال کرانی کے نام سے جانتے تھے، جو برمی حکومت کا بڑا گماشتہ تھا، جس نے قاسم صاحب کا مذکورہ خط چھپا کر اور ایک جعلی خط بدیع الزمان صاحب کے نام لکھ بھیجا، جس میں کہا گیا تھا کہ بدیع الزمان! اختر حسین آپ کے پاس پہنچے تو اسے فوراً قتل کر دینا!۔

زمانہ ۱۹۵۳ء کا تھا، اب معاملہ بہت خراب ہو گیا، چنانچہ جب بدیع الزمان کے پاس اختر حسین کو پہنچایا

گیا تو انہی دو دن کے بعد قتل کر دیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد قاسم راجا مشرقی پاکستان کے دورے سے آ کے لال کرانی کو بہت ڈھونڈا، لیکن خبر ملی کہ لال کرانی مغربی پاکستان کو فرار ہو گیا ہے، تاہم انہوں نے بدیع الزمان کو ڈھونڈ نکالا لیکن کرنا کیا تھا، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، بدیع الزمان نے وہی جعلی خط دکھایا تو قاسم صاحب دم بخود ہو گئے، یاد رہے کہ اس مصنوعی خط میں قاسم راجا کے دستخط کے ساتھ مہر بھی ثبت تھا۔

حضرت مولانا اصحاب الدین صاحب زادی فرانگی

حضرت مولانا اصحاب الدین صاحب شمالی بوسیدنگ کی معروف بستی زادی فرانگ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد جناب مرحوم واعظ الدین صاحب اپنے گاؤں کے رؤسا میں ایک دین دار اور عالم پسند انسان تھے، اور آپ کی والدہ مرحومہ شونا بانو بھی ایک پاکیزہ اور نیک صفات خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم سرزمین ارکان کے ایک عظیم بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب منو فاروی بوسیدنگی کے ہاتھ میں ہوئی، ابھی تعلیم کچھ آگے بڑھی تو والدہ کے شوق اور مولانا یعقوب صاحب کی رہنمائی کی وجہ سے آپ کو سرزمین بنگال جانا نصیب ہوا تھا۔

مولانا اصحاب الدین صاحب چاٹگام کی معروف دینی وعلمی درسگاہ دارالعلوم چندن پورہ میں جا داخل ہوئے، جہاں تک جانکاری ملی کہ آپ نے اس درسگاہ میں متوسطہ کی تعلیم بڑی امتیازی شان سے مکمل کر کے اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان چلے گئے تھے۔

چوں کہ اس وقت ہندوستان میں مجموعی طور پر دوطرح کے مدارس قائم تھے، ایک کا تعلق سرکار انگریز سے تھا تو دوسرے کا رشتہ صرف اور صرف عام مسلم عوام سے جڑا ہوا تھا، آپ چوں کہ شروع ہی سے سرکاری مدرسہ سے رشتہ رکھتے تھے اس لئے آپ نے بنگال کی معروف ومشہور سرکاری مدرسہ دارالعلوم کلکتہ کو انتخاب کر کے وہیں جا کے داخلہ لیا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ میں آپ نے طویل المدت پڑھا اور مطالعہ کیا، یہاں ایسا نام پیدا کیا کہ صرف اس مدرسہ میں نہیں بلکہ دیگر مدارس کے حلقوں تک آپ کا بول بالا ہو گیا تھا، آپ بڑے غضب کے ذہین تھے آپ کی ذہانت کا چرچا طالب علمی کے دوران چاردانگ عالم میں ہونے لگا، بات یہاں تک مشہور ہے کہ آپ کے طالبعلمی کے زمانے میں آپ جیسا ذہین طالب علم سرکاری درسگاہوں کے حلقے میں نہیں تھا، آپ کی ذہانت ولیاقت اور علمی استعداد کے حوالے سے درجنوں کہانیاں مشہور ہیں، غرض آپ نے اس علمی درسگاہ سے ۱۹۲۳ء میں فراغت حاصل کی تھی۔

فراغت کے بعد مولانا وطن واپس ئے اور شادی خانہ آبادی کے بعد سرزمین ارکان کی ایک روایت

کے مطابق سب سے پرانی درسگاہ اشرف المدارس راجاربیل راسیدنگ میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں آپ نے مسلسل دو سالوں تک پڑھاتے رہے، اس کے بعد آپ اپنے علاقہ والوں کے اصرار پر دارالعلوم فندوفرانگ آئے، پھر یہاں سے چند سالوں کے بعد مدرسہ عالیہ بوسیدنگ منتقل ہو گئے تھے، جہاں آپ نے طویل مدت تک تدریسی خدمات انجام دی تھیں، چنانچہ سرزمین ارکان کے چپے چپے پر آپ نے اپنے شاگردوں کے ذریعے علوم دینیہ کی روشنی پھیلائی تھی۔

کہتے ہیں کہ مولانا اصحاب الدین صاحب بڑے مناظر قسم کے انسان ہونے کے ساتھ سیاسی اور فکری شعور بھی رکھتے تھے، آپ نے چند مرتبہ ارکان کے عظیم بزرگ مجاہد لیڈر مرحوم اسماعیل تنبیہ شاہ مارکن کی فرمائش پر دارالحکومت اکیاب کا دورہ کیا، وہاں بعض علمی اور سیاسی حلقوں میں تقریریں کی تھیں۔

آپ بڑے جادو بیان انسان تھے، آپ کی تقریر اور گفتگو میں ہمیشہ علمی شان نمایاں رہتی تھی، ایک بیدار مغز سیاسی اور فکری شخصیت کی حیثیت سے آپ اپنے زمانے میں پوری سرزمین ارکان میں معروف ومشہور تھے، آپ کی تقریر سننے کے لئے لوگ دور دراز سے سفر کر کے آتے اور آپ کی جادو بیانی سے محظوظ ہوتے تھے۔

مولانا اپنے اساتذۂ کرام کے بڑے شیدا انسان تھے، اور اساتذہ بھی آپ کو بہت محبت کرتے تھے، استادوں میں حضرت مولانا یعقوب صاحب آپ کے سب سے محبوب استاد تھے، استاد کے سامنے آپ ہمیشہ بڑے تواضع اور انکساری سے پیش ہوتے تھے، اور مولانا یعقوب صاحب بھی آپ کو اتنا پسند کرتے جتنا پانی مچھلی کو پسند کرتا ہے۔

مولانا کے دوستوں اور احباب میں ارکان کے چند نامور بزرگ تھے، جن میں سیاست دان بھی تھی اور انقلابی وعلمی شخصیتیں بھی تھیں، اس حولے سے جہاں تک پتہ چلا کہ جناب مرحوم مولانا عبد الغفار صاحب (پارلیمنٹری سکریٹری آف برمی پارلیمنٹ) آپ کے طالبعلمی کے زمانے کے دوست تھے، اسی طرح مرحوم ابوالبشر صاحب فوئماری، اسماعیل تنبیہ شاہ مارکن، اڈووکٹ فروخ احمد، مولانا غلام قادر رنگیادنگی، سلطان محمود (سابق وزیر برائے امور صحت حکومت برما) ماسٹر سعید احمد مرحوم کیا کتوی (ہڈ ماسٹر بوسیدنگ ہائی اسکول) اڈووکٹ مرحوم ناصر الدین (پھوکائنگ) وغیرے بھی آپ کے دوستوں

میں سے تھے، مگر آپ سب سے زیادہ حضرت مولانا نذیر حسین صاحب ناکھوری سے لگاؤ رکھتے تھے، ان کی محبت پر پیدل درہ پار کر کے ناکھورہ ملنے جایا کرتے، اسی طرح حضرت مولانا نذیر احمد صاحب بھی آپ کی ملاقات کے لئے زادی فرانگ تشریف لایا کرتے تھے۔

آپ فتوی نویسی میں یکتائے روزگار تھے، فتوی آپ کے قلم سے نکلا تو کسی کی کوئی مجال نہیں ہوتی کہ اسے رد کرے یا اس پر قلم لگائے، جب کہ بات یہاں تک مشہور ہے کہ کوئی فتوی کسی عالم دین کا ایسا نہیں ہوتا کہ جس پر آپ کی نظر پڑی اور آپ اس پر قلم چلائے بغیر رہے ہوں۔

سرزمین ارکان کے یہ بزرگ ترین عالم دین ایک روز اپنے بیٹا جناب ماسٹر عزیز صاحب کی پڑھائی کے سلسلے میں بوسیدنگ تشریف لائے اور سرانگ فارہ میں کسی ایک دوست کے گھر تشریف فرما تھے، کہ رات کی اندھیری میں ایک مسلح کافر نے آپ پر گولی چلا کر آپ کو شہادت کا جام پلا دیا، یوں آپ اس رات اپنے خالق حقیقی کے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مفتی امیر حسین صاحب نور اللہ فاروی

مولانا مفتی امیر حسین کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں جنوبی منگڈو کی مشہور بستی نور اللہ فارہ میں ہوئی، آپ کے والد جناب فضل الرحمن صاحب مرحوم بڑے عالم دوست اور نہایت طلباء پسند انسان ہونے کی حیثیت سے علاقے بھر میں مشہور تھے، کہتے ہیں کہ آپ کا گھرانہ نور اللہ فارہ سے منتقل ہوکر پہلے قادربیل جنوبی منگڈو میں آیا اس کے بعد شقدار فارہ میں مستقل سکونت پذیر ہوگیا تھا۔

مولانا امیر حسین صاحب نے ۱۹۳۹ء تک ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں پائی، بعد میں آپ حضرت مولانا سعید عظیم سنبوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن سے چند ضروری کتابیں پڑھ کر مزید دینی تعلیم کے لئے ۱۹۳۴ء میں بنگلہ دیش گئے اور دار العلوم معین الاسلام ہاٹھزاری میں جا داخل ہوئے تھے، وہاں آپ نے کافیہ، اصول الشاشی، نفحۃ العرب اور کنز الدقائق وغیرہ کتابیں پڑھیں، اس درسگاہ میں آپ نے بطور خاص شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ حضرت مولانا عبد الوہاب (مجاز بیعت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ) سے خوب خوب استفادہ کیا، اس کے بعد آپ نے اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور سیدھے دار العلوم دیوبند میں جا داخل ہوئے، چنانچہ آپ نے ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک دار العلوم دیوبند میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی تھی۔

دار العلوم دیوبند میں علوم اسلامیہ کی تعلیم کے تہ بتہ آپ نے اپنی اصلاح کی فکر کی تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے، آپ نے بطور خاص حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی قربت حاصل کر لی تھی، چنانچہ فراغت کے بعد آپ کے وطن واپس لوٹنے کے بعد بھی شیخ کے ساتھ خط وکتابت جاری تھی۔

مولانا ایک ذہن وفطین عالم دین ہونے کے ساتھ ایک معاملہ فہم مفتی تھے، آپ نے زندگی بھر ملک وقوم کی علمی، دینی، فکری اور ثقافتی خدمت کر کے ارکان میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا قاری بدرالاسلام صاحب کولاربیلی

حضرت مولانا قاری بدرالاسلام بن مولانا زین العابدین بن حاجی محمد حنیف بن یوسف علی بن حسن علی داروغہ بن احمد علی بن شاہ عالم کی ولادت باسعادت ۱۹۳۱ء میں موضع کولاربیل میں ہوئی، کولاربیل منگڈوٹاون کے شمال میں تقریبا آٹھ میل کے فاصلے پر ایک معروف مسلم بستی ہے، جو مردم خیزی کے اعتبار سے بھی کافی شہرت رکھتی ہے۔

مولانا کے والد ماجد حضرت مولانا الحاج زین العابدین صاحبؒ ایک عظیم عالم دین اور رہنمائے شریعت و طریقت گزرے ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی کو ملک وقوم کی رہبری اور رہنمائی میں گزارا تھا، قاری صاحب کچھ بڑے ہوئے تو والد ماجد نے بسم اللہ پڑھادیا، بعد میں گاؤں کے مکتب میں پڑھانے والے مولانا عبید اللہ اور میانجی اکبر علی کا حوالہ کیا، چنانچہ ان دونوں بزرگوں کے ہاتھ سے آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔

نو سال کی عمر میں آپ ناروبیل (جہاں آپ کے والد نے بھی پڑھایا تھا) کے مدرسہ میں داخلہ لیا، اور ابتدائی عربی اور فارسی کی کتابیں یہیں پڑھیں، پھر ۱۹۴۲ء تک پرامپرو کے مدرسہ محمد یہ میں پڑھے، اس مدرسہ میں آپ نے بطور خاص مولانا محمد حسین، مولانا جمال الدین، مولانا عبدالحکیم، مولانا شمس الحق اور مولانا بشیر الدین صاحب سے استفادہ کیا، اس کے بعد آپ چالی فرانگ کے مدرسہ گئے، جہاں آپ نے مولانا عبدالجلیل صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا تھا، اس کے بعد برگیا بیل کے مدرسہ میں جا داخل ہوئے، وہاں آپ نے خصوصی طور حضرت مولانا سید عظیم/سعید عظیم سنبوی (اس وقت مولانا سید عظیم صاحب برگیا بیل کے مدرسہ میں مدرس تھے، یہ مولانا کے شقد ارفارہ والے مدرسہ میں منتقل ہونے کے قبل کا واقعہ تھا) اور مولانا تفضّل حسین صاحب سے مستفید ہوئے تھے، اس کے بعد عیدگاہ (جنوبی چاٹگام کا معروف علاقہ) کے ایک مدرسہ میں پڑھے، پھر ۱۹۴۵ء میں جیمنگ خالی والے مدرسہ میں پڑھے، بعد میں وہاں سے منتقل ہو کر دوبارہ پرامپرو کے مدرسہ محمد یہ جا پہنچے تھے۔

اب مولانا کو یہاں کے مدارس میں جی نہ لگا تو آپ نے ہندوستان کے سفر کا عزم کر لیا، ۱۹۴۵ء میں آپ شاہی مراد آباد پہنچ کر وہاں کے مدرسہ میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے کنز الدقائق، مرقات (منطق کی کتاب) اصول الشاشی جیسی کتابیں حضرت مولانا اشفاق حسین سے پڑھیں، اور نفحۃ العرب مولانا محمد شاہ صاحب سے، شرح الوقایہ مولانا انصار الحق صاحب سے، نور الانوار مولانا احترام اسلام صاحب سے، قطبی مولانا محمد شاہ صاحب سے، فوائد مکیہ، خلاصۃ البیان، تعلیم القرآن مولانا محمد کامل ہزاروی صاحب سے پڑھیں۔

مولانا جس زمانے میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں پڑھ رہے تھے، اسی زمانے میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب اسی مدرسے میں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس دیتے تھے، کہتے ہیں کہ سید صاحب قاری صاحب سے بہت شفقت سے پیش آئے تھے، چنانچہ یہاں ایک سال پڑھنے کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں جا داخلہ لیا، ابھی آپ نے ہدایہ اولین، مختصر المعانی، میر قطبی وغیرہ کتابیں شروع کئے کہ اچانک اخبارات میں اعلان ہوا کہ آئندہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لوگوں کی آمد و رفت بغیر پاسپورٹ کے نہیں ہو سکے گی، چنانچہ ابھی یہ اعلان ہوا ہی تھا کہ ارکان کے طلباء کچھ مغربی پاکستان چلے گئے اور کچھ نے مشرقی پاکستان اور کچھ نے دوبارہ ارکان کی راہ لی، ویسے مولانا مغربی پاکستان کا معروف شہر کراچی جا پہنچے۔

مولانا ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم کراچی میں داخل ہوئے، وہاں آپ نے مولانا فضل محمد پشاوری صاحب سے مشکوۃ ثانی اور ہدایۃ ثالث، مولانا منتخب الحق صاحب سے مشکوۃ اول، مولانا محمد شفیع صاحب عثمانی سے مشکوۃ ثانی، مولانا عبدالغفار صاحب سے ہدایۃ رابع وغیرہ کتابیں ایک سال میں پڑھ کر ۱۹۵۳ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور چلے گئے، وہاں بھی آپ نے ایک سال تعلیم حاصل کی، وہاں آپ نے شرح عقائد نسفی، میبذی، متنبی، سلم العلوم اور ملاحسن وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں آپ ہندوستان جا کر مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں دوبارہ داخل ہوئے، اس مدرسہ میں آپ نے مولانا فخر الدین سے صحیح بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھ کر اسی سال کے اختتام میں سند فراغت حاصل کی تھی۔

فراغت کے بعد مولانا نے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور حدیث کی اعزازی سند بھی حاصل کی، یاد رہے کہ آپ نے مولانا مدنی کے انتقال کے بعد ان کے صاحب

زادہ حضرت مولانا اسعد مدنی کی طرف رجوع کیا، اور تادم آخر ان سے وابستہ رہے تھے۔
۱۹۵۴ء میں مولانا بدرالاسلام صاحب تعلیم سے فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے، ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم ناظر فارہ اکیاب میں مدرس ہو گئے تھے، جہاں آپ نصف سال تک رہے، ہدایہ، شرح الوقایہ اور نحومیر وغیرہ کتابیں آپ کے حصے میں تھیں، لیکن اسی سال آپ رنگوں تشریف لے گئے تھے، جہاں آپ نے حفظ خانہ صادقیہ میں شعبہ قرأت وتجوید کا درس دیا، پھر ۱۹۵۶ء میں ارکان چلے آئے، اور جیمنگ خالی کے مدرسہ میں مسلسل چار سال تک تعلیم دے کر ۱۹۶۰ء میں دوبارہ کراچی چلے گئے تھے، وہاں چند روز حیدرآباد اور چند مہینے جامعہ مدنیہ لاہور میں مولانا حامد میاں کے یہاں آپ نے تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ فتوی نویسی کے شعبہ میں بھی کام کیا تھا۔
مولانا ۱۹۶۱ء میں ارکان پہنچے، اور بڑے گارڈ بیل میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ غازی آباد رکھا گیا تھا، اس مدرسہ میں آپ کے ساتھ مولانا عبدالجلیل، مولانا ابوالقاسم رامیو بیلی، مولانا عبدالرحیم چاپلی فرانگی اور مولانا محمد علی کولار بیلی بھی تھے، بعد میں یہاں کی فضاء آپ کے لئے مکدر ہوگئی تو آپ نے اپنے بعض ساتھیوں کے تعاون سے اس مدرسہ کو کولار بیل منتقل کر دیا، اس کے بعد مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ کولار بیل رکھا گیا تھا، جس میں مولا عبدالجلیل صاحب کو مہتمم اور مولانا سعیداللہ صاحب کو نائب مہتمم کا فریضہ سونپا گیا تھا، خود مولانا بدرالاسلام صاحب بھی اس مدرسہ میں مدتوں تک تعلیم دیتے رہے تھے، مگر اچانک ۱۹۶۸ء میں آپ کا دل اچاٹ ہو گیا تو آپ نے کراچی کی راہ لی، اب کی بار کراچی پہنچ کر درجنوں اداروں اور مساجد میں دین کی خدمات انجام دیں، اس حوالے سے تفصیلات یوں ہیں:
(۱) جولائی/ ۱۹۶۸ء تا اکتوبر/ ۱۹۶۸ء حضرت مولانا نور احمد صاحب ارکانی (داماد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) کا علمی اور اصلاحی ادارہ ''مجلس دعوت الحق'' میں کام کیا۔
(۲) جنوری/ ۱۹۷۰ء تا اپریل/ ۱۹۷۰ء دلکشاد مارکیٹ کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔
(۳) اپریل/ ۱۹۷۰ء تا جولائی/ ۱۹۷۰ء فیڈرل بی ایریا کراچی کی ایک مسجد میں امام مسجد اور مدرس کی حیثیت سے فریضہ انجام دیا۔
(۴) جولائی/ ۱۹۷۰ء تا دسمبر/ ۱۹۷۰ء محمدی موسی کالونی میں امام رہے۔

(۵) دسمبر/ ۱۹۷۰ء میں محمدی مسجد کی امامت کے ساتھ جامعہ مدنیہ فخریہ کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور یہاں ستمبر/ ۱۹۷۰ء تک ابتدائی کتابیں پڑھاتے رہے، لیکن چند دن گزرتے نہ گزرتے بعض شرپسندوں اور متعصبین کی مداخلت کی وجہ سے آپ کو اس ادارہ سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔
(۶) اس کے بعد آپ برمی کالونی ۳۶ / جی لانڈھی کراچی منتقل ہو کے دارالعلوم حسینیہ کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی، جہاں آپ صدر المدرسین اور مولانا احمد اللہ بن مولانا سراج الحق رامیو بیلی مہتمم کے عہدے سنبھالے ہوئے تھے، اس کے بعد اکتوبر/ ۱۹۷۳ء میں آپ نے ارکان آنے کی تیاری شروع کر دی، یوں ۱۹۷۴ء میں آپ ارکان پہنچ گئے تھے۔
وطن پہنچے تو آپ کو کولار بیل والے مدرسہ کے اراکین نے بھرپور استقبال کیا تو اپنے بنا کر وہ ادارہ میں مدرس مقرر ہو گئے، لیکن چند دن گزرتے نہ گزرتے آپ مدرسہ احمدیہ سعداللہ سر چلے گئے، پھر لطف کی بات یہ تھی کہ وہاں بھی آپ کو چین نہ آیا تو ایک مہینے کے اختتام پر آپ دارالعلوم میانجانپور چلے گئے، لیکن آپ کچھ عرصہ رہ کر جامعہ اسلامیہ کولار بیل واپس آ گئے تھے۔
۱۹۷۵ء کی بات تھی کہ حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری اور حضرت مولانا عقیل احمد قاسمی کی قیادت میں جمعیت علمائے ارکان کے نام سے بنگلہ دیش میں ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس میں شامل ہو گئے، اس تنظیم میں آپ ارباب بست وکشاد میں شامل تھے، جس کے سائے تلے رہ کر آپ نے قوم وملت کی فلاح وبہبودی کے حوالے سے بہت سے مثبت کام سرانجام دیے تھے۔
بعد میں آپ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے سعودی عرب پہنچے، حج وزیارت سے مشرف ہونے کے بعد آپ یہاں کے چند اداروں میں خدمات انجام دینے کے بعد بنگلادیش پہنچے اور مدرسہ دار السنہ نہلا میں تقریبا دس سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیں، چنانچہ اسی ادارہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔
شنید ہے کہ آپ نے اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا زین العابدین کولار بیلی کی حیات پر ایک کتاب لکھی، جو منتظر عام پر آ چکی تھی۔
آپ کے پسماندگان میں حضرت مولانا حسن محمود، مولانا حافظ محمد، اور مولانا حافظ محمود بڑے لائق علماء ہیں، اللہ تعالی ان کو دینی خدمات کی توفیق سے نوازے، آمین۔

حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب کیوکتوی

حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب ارکان کے مشہور و مردم خیز علاقہ کیوکتو میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم علاقے میں پائی، اس کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل کی خاطر اکیاب کے علاوہ ارکان دیگر شہروں کا سفر کیا، بعد ازاں جہاں تک معلوم ہوسکا کہ آپ نے وقت کے ایک عظیم معلم عالم دین کی خدمت میں رہ کر تفسیر، حدیث اور فقہ اسلامی میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

فراغت کے بعد آپ کا رجحان اسلامی تصوف کی طرف بڑھا، اور جنوبی چاٹگام کے مشہور علاقہ چنوتی میں وقت کے مشہور ومعروف شیخ کامل حضرت مولانا شاہ حافظ منیر احمد صاحب (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڈھیؒ) کی خدمت میں پہنچ کر بیعت کی سنت ادا کی، اور برسوں تک شیخ کی خدمت میں رہ کر سلوک کے مدارج طے کئے، اس کے بعد حضرت شیخ نے آپ کو خرقۂ اجازت بیعت سے نوازا تھا۔

ادھر تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے شادی خانہ آبادی کی سنت ادا کی، اس کے بعد مختلف مدارس اسلامیہ میں تدریس کی خدمات سرانجام دیں، یوں آپ کے بے شمار تلامذہ ارکان اور بنگال میں پائے جاتے ہیں، ادھر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ نے پیری مریدی کا سلسلہ جاری کیا، اور پند ونصیحت اور تبلیغ وتلقین کے ذریعے ہزاروں بندگانِ خدا کی رہنمائی کی تھی۔

آپ بڑے بردبار، حلیم الطبع اور خاموش مزاج کے انسان تھے، باتیں زیادہ نہیں کرتے اور جتنی بھی کرتے سوچ سمجھ کر کرتے تھے، بڑے عاشق صادق تھے، حضرت رسول انسانیت صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی محبت اور عشق میں ہمیشہ ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے۔

آپ جہاد اسلامی کے جذبہ بھی رکھتے تھے، ۱۹۴۲ء کے واقعۂ کرب وبلا کے دوران آپ نے اپنے علاقے سے مجاہدین کی ایک بڑی جماعت تیار کر لی تھی، لیکن آپ اور آپ کی جماعت نے ممکنہ ہزار کوشش کے باوجود ارکانی مسلمانوں کو مگھ ملعونوں کی شرارت اور برمیوں کے مظالم سے بچا نہ سکا تو آپ نے ہجرت کو ضروری سمجھا، اور ایک بڑی جماعت کی رہنمائی کرتے ہوئے بنگال پہنچ کر شوبرنگر

(رنگپور) میں پناہ لی تھی۔

رنگپور میں بھی آپ نے اپنے وعظ ونصیحت، تلقین وارشاد کا سلسلہ جاری کیا، ساتھ ہی ساتھ ایک مدرسہ قائم کر کے ارکانی بچوں کی تعلیم کا بہت خوب بندوبست کیا، اور خود بھی اپنے بنا کردہ اس مدرسہ میں تعلیم دی تھی۔

بعد میں رنگپور سے آپ وطن واپس لوٹے تو تھے مگر علاقے کے بعض شر پسند ظالموں نے آپ کو دوبارہ اپنے علاقہ میں بسنے نہ دیا تو بالآخر آپ نے مجبور ہو کر ارکان کے دارالحکومت کو اپنا مستقر بنایا، یہاں بھی آپ نے درس وتدریس، تلقین وارشاد کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی کی اور طویل مدت تک اس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

بعد میں آپ کے لئے وطن کی زمین تنگ ہوگئی یا تنگ بنادی گئی تو آپ نے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں پناہ لی، چنانچہ مدت دراز تک اوکیہ کے علاقے میں اللہ کے اس نیک بندے نے دین اسلام کی خدمت کی، بالآخر رشد وہدایت کا یہ روشن چراغ جلتے جلاتے ہمیشہ کے لئے بجھ کر علاقہ اُوکیہ میں مدفون ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے تصوف کے موضوع پر ایک نہایت اچھی کتاب لکھی ہے، جس کا نام ''غذائے روح'' ہے، یہ کتاب میری نظر سے گزری ہے، حضرت شیخ جمال حسین صاحب نائچونگی سے ملی تھی، زمانہ ۱۹۸۳ء یا اس کے بعد کا تھا، دراں حالیکہ اس موضوع پر میری معلومات بہت کم تھیں، جتنا بھی اندازہ ہوا تھا کہ مصنف رحمہ اللہ ایک زندہ دل شیخ کامل تھے، طریقت وسلوک کے حوالے سے ان کی معلومات بہت وسیع تھیں، علوم اسلامیہ میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے، یہ سلاسل طریقت پر بڑی جامع کتاب ہے، جس میں حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی کی زندگی اور حالات وکمالات پر خاصی بحث ہے، مصنف نے حضرت کی تعلیمات پر خاصی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ ۱۹۹۹ء میں راقم نے حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی پر قلم اٹھایا تو اس کتاب کی بڑی تلاش کی گئی تھی، مگر نہیں ملی، چنوتی، ساتکانیہ وغیرہ علاقوں کا اس حوالے سے سفر کیا گیا تھا، مگر تلاش بسیار کے باوجود ناکامی ہوئی تھی، اگر یہ کتاب مل جاتی تو حضرت ارکانی صاحب کے حالات کے علاوہ اور بھی ساری کارآمد چیزیں میسر ہوجاتیں۔

حضرت مولانا بشیر احمد صاحب نلبنوی

مولانا بشیر احمد بن امیر حسین کی ولادت با سعادت ۱۹۲۳ء میں جنوبی منگڈو کے مردم خیز گاؤں نلبنیہ میں ہوئی، آپ کا کنبہ بڑا دین دار لیکن دنیاوی اعتبار سے متوسط حیثیت کا مالک تھا۔

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مکاتب سے حاصل کی، اس کے بعد با قاعدہ علوم دینیہ کے حصول کے لئے ارکان کے سب سے بڑے دینی ادارہ ام المدارس مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں داخلہ لیا، یہاں چند سال پڑھ کر آخر میں علوم حدیث وتفسیر کی تکمیل بنگلا دیش کی معروف علمی درسگاہ مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ سے کی تھی۔

فراغت کے بعد آپ نے تدریسی خدمات اور تبلیغ دین کے لئے دور دراز کا طویل سفر کیا، آخر میں اپنے آبائی گاؤں سے میلوں دور کیوکتو کو وہاں کے باشندوں کی بے پناہ محبت اور حسن سلوک کی بنا پر اپنی دینی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا، کہتے ہیں کہ آپ کے فیوض وبرکات ابھی تک وہاں جاری ہیں۔

مولانا نے شادی بھی کیوکتو کے ایک معروف دینی گھرانے کی ایک صالحہ متقیہ خاتون سے کی، لیکن دو بچوں کی ولادت کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ دنیا سے چلی گئی تو اس واقعہ سے مولانا کو اتنا صدمہ پہنچا کہ دونوں بچوں کو لے کر آپ اپنے آبائی گاؤں تشریف لے آئے، واپسی کے بعد یہاں عرصہ تک منگڈو کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فریضے انجام دیتے رہے، اس دوران آپ اپنے بچوں کی خاطر ایک طویل مدت تک دوسری شادی سے کنارہ کشی کی، لیکن بعد میں لوگوں کے شدید اصرار پر منگڈو کی معروف شخصیت ماسٹر مسلم صاحب کی صاحبزادی سے نکاح کیا تھا۔

بری حکومت کی طرف سے ارکانی مسلمانوں پر شدید مظالم اور ان کے عرصۂ حیات تنگ کرنے کی پالیسی سے دل برداشتہ ہوکر مولانا ۱۹۷۸ء میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچے، یہاں پہنچنے کے ابتدائی چند سال جوار حرم میں تجارت سے وابستہ رہے، لیکن بعد میں تجارت کو خیر باد کہہ کر یکسوئی کے ساتھ عبادت الہی اور اصلاحی کاموں میں مشغول ہوگئے، مولانا کو قومی امور سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، ہمیشہ لوگوں کو سچی اسلامی سیاست کی تلقین فرماتے تھے، نیز مجاہدین ارکان کے متعلق آپ کا خیال بڑا نیک تھا، ہمیشہ

مجاہدین کی حوصلہ افزائی فرماتے، اور ان سے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار فرکیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے آپنی پوری زندگی عام لوگوں کی خیر خواہی، تدریس وتبلیغ اور اصلاحی پروگرام میں گزار دی، آخر کار بروز دوشنبہ ۱۷/صفر المظفر / ۱۴۱۵ھ کو شام کے وقت دل کا دورہ پڑا، جس کے کچھ وقت بعد مغرب سے پہلے چھ بج کر پچاس منٹ میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے آپ کا انتقال ہوگیا۔

مولانا مرحوم بڑے متقی، صالح، عبادت گزار ہونے کے علاوہ عزیز واقارب اور دیگر عام لوگوں کی بہبودی اور اصلاحی معاملات میں ہمیشہ اخلاص وللّٰہیت سے حصے لیتے تھے، علاقے کی فلاحی کاموں میں آپ کی بڑی بڑی قربانیاں تھیں، علاوہ ازیں انفاق فی سبیل اللہ کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مہمان نوازی گویا آپ کی فطرت ثانیہ تھی، نہایت خوش اخلاق اور ملنسار بزرگ تھے۔

مولانا کے پسماندگان میں چار فرزند، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ تھی، نہ جانے آج کل ان کے حالات کیا ہیں، اللہ تعالی سب کا بھلا کرے۔ آمین۔

حضرت مولانا حافظ جمال احمد صاحب کوانچی بنگی

مولانا حافظ جمال احمد بن ہدایت علی شمالی منگڈو کے مردم خیز گاؤں کوانچی بنگ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک زمیندار اور درویش صفت انسان تھے، اور والدہ بھی ایک عالم پسند دیندار خاتون تھی۔

حافظ جمال احمد صاحب نے اپنے گاؤں کے مکتب سے ناظرۂ قرآن کریم کے اختتام پر تعلیم کی خاطر ہندوستان کا رخ کر کے سیدھے دارالعلوم دیوبند میں جا داخلہ لیا، آپ نے وہیں قرآن کریم کا حفظ کیا، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جماعت ششم تک تعلیم پا کر بنگلا دیش آئے اور مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں داخلہ لیا، چنانچہ آپ نے مدرسہ ضمیریہ ہی سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند ہو یا مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ، جہاں بھی آپ نے پڑھا، آپ اساتذۂ کرام کے نور نظر رہے تھے، آپ ہر کہیں بھی اساتذۂ کرام کی خدمت سے اپنے آپ کو پابند رکھے ہوئے تھے، اساتذہ بھی آپ سے نہایت محبت کرتے اور دعائیں دیتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حافظ جمال احمد صاحب وطن واپس آئے، آپ نے ابتدا میں مکتب کی تعلیم کو فروغ دینا اپنا نصب العین بنا رکھا تھا، بعد میں سرزمین ارکان کو اسلامی علوم سے منور کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، اس سلسلے میں آپ نے ملک کے بڑے بڑے جیداور روشن ضمیر علماء سے تعلقات استوار کئے، چنانچہ مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدوی سے مل کر دارالعلوم میانجا پور کی تاسیس کی، ویسے آپ اس محسن ادارہ کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔

بعد میں آپ نے اپنے گاؤں کے مکتب کو فروغ دیا، آپ کی زندگی میں یہ مدرسہ اشرف العلوم کے نام سے کافی شہرت کا حامل رہا، وہاں ملک کے طول وعرض سے طلباء امڈ پڑے تھے، آج کل بھی ماشاء اللہ یہ مدرسہ علم واخلاق کے حوالے سے بڑی شہرت کا حامل ہے، یہاں قرآن کریم کے ناظرہ اور حفظ سے لے کر جماعت اولی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں حافظ صاحب ایک سماجی انسان بھی تھے، رفاہی کاموں سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، غریبوں، مسکینوں، رانڈوں اور مہاجرین سے بہت محبت کرتے تھے، امانت ودیانت کے حوالے سے

آپ یکتائے روزگار تھے، ملک کے طول وعرض میں ایک مثالی انسان کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، بڑے داعی اور خدا ترس انسان تھے، ساتھ ہی ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، آپ جمعیت علمائے ارکان کے لیڈروں میں سے تھے، آپ پر حکومت کی طرف سے مختلف الزام عاید کئے گئے تھے، ویسے آپ کو بڑی بڑی آزمائشوں سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔

بالآخر سرزمین ارکان کی اس مثالی شخصیت نے ذی قعدہ/ ۱۴۲۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مظاہری پکتلوی

حضرت مولانا حبیب اللہ بن شاہ عبد المطلب بن احمد علی بن حاجی مھیمن علی بن تراب علی کی ولادت ۱۹۱۳ء میں جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، ابھی لڑکپن کی رنگ رلیوں کا زمانہ تھا کہ مولانا کے گھرانے کے لئے گدوسرا کی زمین تنگ ہوگئی، یوں اس گھرانے نے گدوسرا کو خیر باد کہہ دینے کا فیصلہ کرلیا، اول اول اس گھرانے نے ارکان سے ہجرت کر کے دنیا کے کسی گوشے میں جا چھپنے کی راہ ڈھونڈی تھی، مگر بعد میں جنوبی مشرقی ارکان کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا تھا، یوں اس گھرانے کے لئے کیوکتو کی زمین مناسب ٹھہری، وہاں کے ایک گاؤں پکتلی میں یہ گھرانہ جا آباد ہوگیا، ظاہر ہے کہ مولانا کی ولادت جس طرح پچھلی سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ گدوسر میں ہوئی، اس لئے آپ کو گدوسراوی کہنا مناسب تھا، لیکن آپ کی شہرت پکتلی سے ہوگئی ہے، اس لئے تعارف کے لئے راقم السطور کو بھی پکتلوی لکھنا پڑا ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گدوسر میں ہوئی، اس مردم خیز بستی میں آپ نے اردو کی تیسری جماعت تک تعلیم پائی، اس کے بعد بہار فارہ کے مدرسہ (اسکول) میں تین سال پڑھتے رہے، آپ نے ۱۹۲۹ء میں علوم اسلامیہ وعربیہ کی تعلیم کے لئے جنوبی منگڈو کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے مسلسل تین سال تعلیم حاصل کی، پھر ۱۹۳۲ء میں ام المدارس آف ارکان اشرف المدارس راجار بیل راسیدنگ پہنچے، یہاں ایک سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ پھر بہار فارہ کے مدرسہ میں واپس گئے، یہاں مزید ایک سال پڑھ کر ۱۹۳۴ء میں دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام میں جا داخلہ لیا، چنانچہ آپ نے وہاں تین سال تک تعلیم حاصل کر کے دورۂ حدیث کی خاطر ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جا داخل ہوئے، یہاں مولانا نے ایک سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی تھی۔

فراغت کے بعد کچھ مدت تک مولانا حبیب اللہ صاحب نے فنونات عالیہ کی کتابیں پڑھیں، اسی سال کے اواخر میں رمضان المبارک سے ذی الحج تک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

کی خدمت میں وقت گذارا، اس کے بعد وطن کی راہ لی، چنانچہ ۱۹۳۸ء میں آپ پکتلی پہنچ گئے تھے۔

وطن پہنچنے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا آغاز کردیا اور اکیاب ٹاؤن کی معروف مسلم بستی روہنگیا فارہ تشریف لے گئے، یہاں شاہ صاحب والی مسجد سے ملحق مدرسہ امدادیہ میں درس دینا شروع کردیا، آپ نے اس مدرسے میں ۱۹۴۱ء تک تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد بہار فارہ کے مدرسہ میں اگلے تین مہینے تک علوم دینیہ کی چند کتابیں پڑھائیں، ۱۹۴۲ء کے قومی فسادات کے دوران آپ اپنی جائے پیدائش گدوسرا آگئے تھے لیکن بعد میں ۱۹۴۳ء میں مہاجرین کے ساتھ رنگپور (حالیہ بنگلہ دیش میں) ہجرت کی، تقریبا آپ نے رنگپور میں چار سال تک ہجرت کی زندگی گزاری، اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ارکان واپس آکے بوسیدنگ کی جنوبی بستی گودام فارہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

گودام فارہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد آپ نے اس بستی کے مکتب میں دینی تعلیم دینا شروع کردیا تھا، ۱۹۴۹ء میں آپ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ آکے ۱۹۵۲ء تک طالبان علوم دینیہ کو سیراب کرتے رہے تھے، اس کے بعد بوسیدنگ ٹاؤن میں آکے ۱۹۵۳ء میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کی بنیاد رکھی، آپ نے یہاں ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک تعلیم دی اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، مولانا ۱۹۶۵ء میں اپنے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر پاکستان کے معروف شہر کراچی جا ٹھہرے تھے۔

یوں تو مولانا کی زندگی مختلف پریشانیوں، کلفتوں اور ہجرتوں سے عبارت ہے، آپ کی آخری ہجرت کے اسباب ہجرت کے حوالے سے مولانا حافظ صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ”حکومت برما با قاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مدارس ومساجد کو عرصۂ دراز سے شہید کررہی ہے، اپریل ۱۹۶۵ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ بوسیدنگ ٹاؤن کے نیا بازار کی مسجد ڈھادی جائے گی، کیوں کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت کے بغیر غیر قانونی طور پر بنائی گئی ہے، یہ اعلان منظر عام پر آتے ہی مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی، منگڈو اور بوسیدنگ میں قائم جمعیت العلماء کا اجلاس منعقد کیا گیا، اجلاس میں پاس شدہ قرار دادیں مختلف محکموں میں بھیجی گئیں، لیکن ساری قرار دادیں بے سود ثابت ہوئیں، چونکہ مولانا ممدوح جمعیت العلماء بوسیدنگ کے صدر تھے، اس لئے اجلاس

بلانے اور قرار دادیں پاس کرانے میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا،عوام کوحکومت کے خلاف تیار کرنے میں مولانا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ۲۹ / اپریل ۱۹۶۵ء کومولانا حسب معمول مدرسہ عالیہ میں بیضاوی شریف کا درس دے رہے تھے، کہ اچانک محمد حسین نامی ایک شخص نے آ کر مولانا سے کہا کہ آپ کوملٹری ڈی، ایچ ایم بلا رہے ہیں ،مولانا فورا چل پڑے، چونکہ مولانا برمی زبان سے ناواقف تھے،اس لئے ترجمانی کے فرائض انجام دینے کے لئے ماسٹر محمد یوسف کوبھی ساتھ لے کر ڈی ایچ ، ایم کے دفتر میں جانا چاہ رہے تھے، لیکن ماسٹر صاحب کو دفتر کے اندر جانے نہیں دیا گیا، مولانا کوتنہا دفتر کے اندر لے جایا گیا، ڈی ایچ ایم نے یعقوب نامی مسلمان کے توسط سے سوالات کئے، اور مولانا نے جوابات دیئے ان کی تفصیل یہ ہے کہ:

ڈی ایچ ایم: اپنے حالات بیان کریں؟

مولانا: مولانا نے اپنی سوانح عمری تفصیل سے بیان کی۔

ڈی ایچ ایم: مولوی حضرات حکومت کا قانون نہ خود مانتے ہیں نہ دوسروں کو ماننے دیتے ہیں، حکومت کا اعلان ہے کہ چونکہ نیا بازار کی مسجد غلط جگہ پر غیر قانونی طور پر بنائی گئی ہے، اس لئے یہ توڑ دی جائے گی۔

مولانا: یہ مسجد بالکل قانون کے مطابق صحیح جگہ پر حکومت کی اجازت سے بنائی گئی ہے، جس کا ثبوت اور دستاویز مسجد کے پیش امام کے پاس موجود ہے۔

اس کے بعد امام صاحب کو بلایا گیا، اور امام صاحب نے بھی تمام قانونی دستاویز حاضر کردی، دستاویز دیکھ کر ڈی ایچ ایم بول پڑا کہ ہمارے پونجی شافی (افسران) بھی تو ایسے ہوتے ہیں، اس کے بعد مولانا کو چھوڑ دیا گیا، چنانچہ مولانا بخیر وعافیت گھر پہنچ گئے تھے''۔(۱)

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۲۲۱۔ ۲۲۲۔

حافظ محمد صدیق صاحب نے مولانا کی اس ہجرت کے حوالے سے اور دو باتین یعنی دو واقعات بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک مراقبہ کی بات تھی جب کہ دوسری ایک پریشان کن کہانی، اب موخر الذکر کہانی یہاں پہلے درج کی جاتی ہے، بعد میں وہ چیز جو مولانا مرحوم کو مراقبہ میں نظر آئی تھی، مولانا صدیق صاحب سے مستعار لے کر من وعن بیان کی جائے گی:

''اپریل/ ۱۹۶۵ء میں مستفیض الرحمن پارٹی کے مجاہدین جو بوسیدنگ کے شمال میں واقع ''پونجی چھاؤنی'' سے رات کے وقت کچھ ٹھاکروں (مگھوں کے مذہبی رہنماؤں) کو گرفتار کر کے پہاڑ کی طرف لے گئے، صبح تڑکے حکومت کے اہل کار مولانا کے پاس آئے اور گرفتار کر کے لے گئے، اور کہا کہ جب تک ٹھاکروں کی رہائی نہیں ہوتی، تب تک مولانا کی بھی رہائی نہیں ہوگی، اس کے بعد بوسیدنگ کے چند سرکردہ مسلمان (ماسٹر محمد یوسف، داروغہ عبد الرحیم اور کرانی نصرت علی وغیرہ) نے مگھ لیڈر، سنتو دنگ کو ضامن بنا کر اس شرط کے ساتھ مولانا کو رہا کیا کہ مولانا جمعیت العلماء کے توسط سے گرفتار ٹھاکروں کو رہا کرانے میں حتی المقدور کوشش کریں گے''۔(۱)

اور لیجئے مولانا کی مراقبہ والی بات کہ:

''مولانا اپنی عادت مستمرہ کے مطابق مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے محراب میں مراقبہ کررہے تھے کہ نیند کے غلبہ سے اونگھ آ گئی، اس حالت میں مولانا دیکھتے ہیں کہ سفید کپڑوں میں ملبوس کرتا اور شلوار پہنے ہوئے ایک بزرگ تشریف لائے، جن کے بال اور داڑھی سفید تھی، انہوں نے مولانا سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ، جب آنکھیں کھلیں تو مولانا کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے، اس فرمان غیبی کی وجہ سے مولانا ہجرت کے لئے تیار ہو گئے، (۲)

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۲۲۲۔ ۲۲۳۔

(۲) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۲۲۲۔ ۲۲۳۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین اور بڑے پائے کے بزرگ تھے،مولانا نے اپنی زندگی میں ملت عزیز اور وطن مقدس ارکان کے حوالے سے بہت سارے کارنامے انجام دیئے،تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آکر طلبائے علوم نبوت کو عرصۂ دراز تک سیراب کرتے رہے، مدارس میں پڑھائے اور مدرسہ کی بنیاد بھی ڈالی،مسلمانوں کی مختلف انجمنوں میں شامل ہوکر دین وملت اور وطن وقوم کی خدمات انجام دیں،ان انجمنوں میں جمعیت علمائے اسلام ارکان ناقابل فراموش ہے۔

مولانا ایک دل جلے، ذی شعور، غیرت مند، دور بین ودور اندیش مذہبی رہنما تھے، ارکان میں آپ جب تک رہے،مسلمانان ارکان کی فلاح و بہبودی کے حوالے سے ہونے والے کاموں میں شریک ہوتے رہے تھے،ان کے علاوہ مولانا ایک صاحب دل بزرگ اور مستعد عالم ہونے کے ساتھ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے،اور صاحب بصیرت قلم کار بھی،مولانا نے اپنی زندگی میں سرزمین ارکان میں بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھا،ان میں سے سب سے بڑا ہولناک واقعہ جوانہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ تھا ۱۹۴۲ء کے قتال اور خونریز لڑائی، یوں تو اللہ تعالی کے فضل سے مولانا اس لڑائی میں بال بال بچ گئے تھے،مگر اس واقعۂ کرب بلا کی وجہ کے مولانا کو پریشانیوں اور کلفتوں کے سات سمندر پار کرنا پڑا تھا۔اس حوالے سے ہماری خوش قسمتی تھی کہ مولانا نے اس دوران اپنے مشاہدے کی ساری چیزیں بڑی حد تک بیان کردی ہیں، بعد میں ان کے مخطوطات سے بعض چیزیں حافظ مولانا محمد صدیق صاحب کی کوشش سے چھپ کر منظر عام پر آئیں، اللہ تعالی مولانا کے ساتھ ساتھ حافظ صاحب کو بھی جزائے خیر دے، چنانچہ حافظ صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۹۴۲ء میں قومی فساد کا آغاز ہوا،جس میں سینکڑوں مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، بے شمار افراد لقمۂ اجل بنے، ہزاروں مسلم بستیاں اجڑ گئیں، لاکھوں گھرانے برباد ہو گئے، دریاؤں کے پانی عرصۂ دراز تک مسلمانوں کے خون سے رنگین رہے، اس ہو کے عالم میں مولانا نے خود اس اس مقدس جہاد میں شریک ہوکر بے یار و مددگار مسلمانوں کی خوب رہنمائی کی، اور مظلوم قوم کی جان اور عزت کی خاطر ہر قسم کی قربانی دی، اس کی کچھ جھلک مولانا کی غیر

مطبوعہ کتاب ''داستان ارکان'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) ۱۹۴۳ء میں جاپان اور برطانیہ کی جنگ کے دوران کافی برمی مسلمان ہجرت کرکے رنگپور چلے گئے تھے،ان مہاجرین میں مولانا بھی تھے،ان نہتے اور بے زبان مہاجرین کی خدمت، مدد،نصرت، رہنمائی اور تعاون کے لئے ایک دیانتدار، امانت دار،تقوی دار اور تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی،سو یہ ضرورت اللہ نے مولانا کی ذات با برکت سے پوری کردی،مولانا نے رنگپور خیموں میں برمی مہاجرین کی جو خدمات کیں، وہ ناقابل فراموش ہیں،تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا کی غیر مطبوعہ کتاب ''داستان ارکان'' اور راقم الحروف کی کتاب ''اشک مسلمانان ارکان برما''۔

(۳) داستان ارکان یہ غیر مطبوعہ (قلمی) نسخہ بڑی تقطیع کے ۳۴۶ صفحات پر مشتمل ہے، یوں تو اس کتاب میں بہت سی اہم باتیں، نایاب مباحث، اور مفید مضامین موجود ہیں، البتہ دو بحثیں ایسی ہیں جو اتنی تفصیل سے شاید ہی کسی اور کتاب میں موجود ہوں، اول قتال مگھ و مسلم (مگھ کاڑا کاڑی) کے واقعات، دوم رنگپور مہاجرین کے مفصل حالات، چونکہ مولانا بذات خود ان دونوں حادثات میں شریک تھے، اس لئے انتہائی تفصیل سے تحریر کئے، راقم نے اپنی کتاب ''اشک مسلمانان ارکان برما'' اور ''ارکان کی خونی داستان'' میں اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے''۔(۱)

داستان ارکان میں مولانا حبیب اللہ صاحب پٹکلوی لکھتے ہیں کہ:

''عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لئے دنیا کی سیر وتفریح کریں، اگلے زمانے کی حالت پر نظر ڈالیں اور قلمبند کریں، جیسے ہمارے علماء میں سے کثیر التعداد بزرگوں نے،عقلمندوں نے، مدبروں نے اپنے اپنے متقدمین کے اور ملک کے حالات قلمبند

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۲۳۔۲۲۴۔

کر کے لوگوں کو واقف کرایا ہے، اس بنا پر ہمیں بھی چاہئے کہ اپنے ملک کی حالت پر تبصرہ کریں، اور اہم واقعات اور حالات کو حتی المقدور قلمبند کریں، اب چونکہ گذشتہ مارچ/ ۱۹۴۲ء بمطابق ربیع الاول/ ۱۳۶۱ھ سے برما اور ارکان ڈویژن میں انقلاب عظیم اور قومی فساد برپا ہوا، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو جن جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کی پوری داستان بیان کرنا اور قلمبند کرنا قاصر اور زبان سے باہر ہے۔

لیکن بعض محبین وطن اور ہم درد بھائیوں کے اصرار کی وجہ سے اللہ جل شانہ پر پورے توکل کرتے ہوئے عزم بالجزم کیا ہوں، اور اپنے بھائیوں کے حکم کی تعمیل کے لئے اپنی یادداشتیں اور چشم دید واقعات کو ملا کر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں“۔

مولانا بڑے پائے کے عالم دین، جلیل القدر بزرگ، بڑے عالی دماغ وباریک بین سیاست دان تھے، صفات کی پاکیزگی کے ساتھ لوگوں کی خیرخواہی میں یکتائے روزگار بھی۔

مولانا نے اپنے وطن عزیز سے ستمبر/ ۱۹۶۵ء میں اپنے گھرانہ سمیت ہجرت کی اور صحیح سلامت پاکستان کے شہر کراچی پہنچ گئے، وہاں کے مدرسہ خلیلیہ موسی کالونی میں عرصۂ دراز تک تدریسی خدمات انجام دیں، اس دوران آپ نے ایک رسالہ لکھا، جس کا نام ”برمی مسلمانوں کی ہجرت اور روہنگیا قوم کی قسمت“ تھا، حافظ محمد صدیق صاحب کے مطابق یہ رسالہ مدرسۂ مذکورہ نے ۳۲ صفحات پر مشتمل شائع کیا تھا، اس درسگاہ میں آپ نے ۱۹۶۸ سے لے کر ۱۹۸۵ء تک تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔

بعد میں آپ حج وزیارت مدینہ منورہ کی نیت سے حجاز مقدس پہنچے اور مکہ مکرمہ میں تقریباً ۱۹۸۵ء میں انتقال کیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آسمان ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے

حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب سنبنوی

مولانا حافظ حبیب اللہ بن ماسٹر تاج الملوک بن امیر الدین منگڈو ٹاؤن شپ سے گیارہ میل جنوب میں واقع مشہور بستی سمبنیہ فارہ میں ۱۹۳۷ء بمطابق ۱۳۵۸ھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماسٹر تاج الملوک مقامی پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، آپ کا نانا مولانا الحاج ابوالخیر رحمہ اللہ ایک خدا ترس عالم اور انسانیت کے خیرخواہ آدمی تھے، جو مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری کے فارغ التحصیل اور ایک روایت کے مطابق حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بعد میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید تھے، مولانا ابوالخیر کا سلسلۂ نسب حسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، جن کا مزار اب بھی اکیاب میں موجود ہے۔

حافظ حبیب اللہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے محلہ کے مکتب میں اپنے والد بزرگوار اور نانا جان کی زیر نگرانی حاصل کر کے مدرسہ امداد العلوم علی تانجو میں عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

یہ دور چونکہ برمی اور مگھ غنڈے پی ٹی ایف کا دور تھا، جن کی ستم رانی اور غنڈہ گردی سے تنگ آ کر ارکان کے بہت سارے مسلمان مشرقی پاکستان میں پناہ گزین ہو گئے تھے، اس دوران آپ کے خاندان نے بھی ہجرت کر کے بدر مقام (مشرقی پاکستان) آ گیا تھا، آپ کے نانا جان کو تعلیم وتربیت کا بہت شوق تھا، چنانچہ نانا جان نے اپنے نواسے کو مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں شعبۂ تحفیظ القرآن میں داخلہ دلوایا تھا، یوں آپ چند سال کے بعد قرآن کریم کے جید حافظ بن گئے، چوں کہ اس زمانے میں آپ کے آبائی علاقے میں معدودے چند حفاظ کرام تھے، ایک روایت کے مطابق حافظ محمد یعقوب گدوسراوی اور حافظ ابوالخیر کے بعد آپ کا نمبر آتا تھا، لہذا علاقے میں آپ کا بڑا شہرہ ہو گیا، اور آپ کی امامت میں مدت دراز تک سنبنیہ کے وسطی میدان میں ختم تراویح کا عروج رہا تھا، بعد میں آپ نے مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں متوسطہ اور ثانویہ کی جماعتوں کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے، اور یہیں سے دورۂ حدیث نبوی کی تکمیل کے بعد شعبۂ تحفیظ القرآن کے مدرس ہو گئے، ساتھ ہی مدرسہ اشرف العلوم کے ناظم اعلی اور دار الطلبہ کی نگرانی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے تھے، چونکہ حافظ صاحب مدرسہ کے ناظم صاحب مولانا الحاج مستفیض الرحمن نلبنوی کے شاگرد رشید تھے،

چنانچہ درس نظامی سے کئی اہم کتابوں کے اسباق آپ کا ذمہ کر دیے گئے، یوں مدرسہ اشرف العلوم کی تعلیمی، تربیتی، مادی اور روحانی ترقیوں میں حافظ صاحب کی محنت وذکاوت کو بڑا دخل تھا، آپ نے یہاں تقریبا پندرہ سالوں تک تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دی تھیں، بعد ازاں ۱۹۷۶ء میں حج بیت اللہ کی نیت سے حجاز مقدس تشریف لے گئے، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں ۱۹۷۶ء تک مقیم رہے، اب مناسب معلوم ہوتا کہ حضرت کے چند نامور اساتذہ کے اسمائے گرامی یہاں درج کردئے جائیں:

(۱) حضرت مولانا الحاج نور احمد صاحب مظاہری گدوسراوی۔(۱)

(۳) حضرت مولانا نجم الدین صاحب نلبنوی۔

(۴) حضرت مولانا نثار احمد صاحب بانگلونوی، منگڈوی۔

(۵) حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فقیرہ فاروی۔

(۶) حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب نلبنوی۔

(۷) حضرت مولانا منیر اللہ صاحب گدسراوی۔

مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب کے بہت سے تلامذہ ہیں، جن کی اکثریت درس وتدریس، تعلیم وتعلم، قومی سیاست اور میدان جہاد وکفاح میں مصروف عمل ہے، آپ کے تلامذہ اندرون وطن کے علاوہ بنگلا دیش، پاکستان، سعودی عرب، کویت، عرب امارات، تھائی لینڈ، ملائشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا تک پہنچ گئے ہیں، غرض قومی ودینی خدمات کے حوالے سے آپ کی گرانقدر کوششیں اور کارنامے تھے۔

مدرسہ قاسم العلوم چارکمبو جس کے بانی اول حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مظاہری تھے، جنہوں نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں دینی علوم کے فروغ کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا تھا، اس وقت مولانا

(۱) حضرت مولانا الحاج نور احمد صاحب مظاہری گدوسراوی سابق شیخ الحدیث مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ ایک جلیل القدر عالم دین تھے، جنہوں نے ارکان کی اس مایۂ ناز درس گاہ میں دورۂ حدیث کا اجراء فرمایا تھا، تقریباً اٹھارہ سالوں تک بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس دیئے تھے، بالآخر اپنی دلی تمنا کے مطابق آپ اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے پہلو میں جنت البقیع میں مدفون ہوئے، کہتے ہیں کہ حضرت سہارنپوری کی تجہیز وتکفین بھی آپ کی وصیت کے مطابق مولانا نور احمد صاحب نے کی تھی۔

مرحوم کے دست راست ان کے داماد مولانا محمود اللہ صاحب تھے، رفتار زمانے کے ساتھ ساتھ مالی مشکلات اور انتظامی صورت حال ناگفتہ بہ ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء کی ناگامن انکوائری کے دوران مدرسہ مذکورہ کی حالت ابتر سے ابتر ہوگئی تھی، یہ مدرسہ بوسیدہ حالت میں تقریبا ناقابل استعمال ہوگیا تھا، تو ۱۹۷۹ء میں حضرت حافظ حبیب اللہ صاحب نے اکابر علماء اور اطراف واکناف کے چیدہ ترین حضرات سے صلاح ومشورے کے بعد اس مدرسہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا، اور ایک مجلس شوری کی تشکیل دی، مدرسہ کے اہداف واغراض میں کتاب وسنت کے مطابق صحابہ اور تابعین کے طریقے کو اپنایا گیا، مسلک اہل السنت والجماعت اور سلف صالحین کے عقائد کے موافق سختی سے عمل کرتے ہوئے دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کو بھی لازم قرار دیا گیا، اس طریقے سے کہ دین اور دنیا کی تفریق اور مسٹر ملا کا تفارق ختم ہوجائے، یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ اپنے عقیدے اور مسلک پر ثابت قدم رہیں اور ذاتی دنیاوی مفاد کی خاطر ضمیر فروشی نہ کریں، حافظ صاحب نے اس مدرسہ کو دینی روحانی، مادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور تربیتی غرض ہر لحاظ سے جامع ومانع بنادیا تھا، جس کی شہادت آپ کے مخالفین بھی دیا کرتے ہیں۔

۱۹۹۷ء کے بعد حافظ صاحب کی ذہنی کیفیت بدل گئی، آپ کی فکر ونظر میں قومی درد اور ملی سوز کے ساتھ ساتھ دور اندیشی پیدا ہوگئی، آپ مسلمانوں کے آئے دن کے زوال وانحطاط پر بڑے فکر مند ہوگئے، اس زمانے میں آپ اکثر پریشان، نالاں اور مغموم رہا کرتے تھے، ارکان کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے اندر پائی جانے والی بیماریوں کے علاج کے لئے فکر دامن گیر ہوگئی، اس سوز وساز سے لبریز اس عالم دین نے اب اکابرین امت کی کتابوں کا مطالعہ شروع کردیا، اس سلسلے میں آپ نے حضرت شاہ اسماعیل شہید، اکابرین علمائے دیوبند کی تصانیف وملفوظات اور سوانح حیات پر مذاکرہ ومطالعہ کیا، چنانچہ ان کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ آپ مزید وسیع النظر ہوگئے، اس کے بعد آپ نے اسلامی انقلابی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تھا۔

چنانچہ اس سلسلے میں حسن البناء شہید، سید قطب شہید، بدیع الزمان سعید نورسی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تصانیف سے تحریکی، دعوتی، انقلابی، فکری اور روحانی

غذائیں حاصل کیں، آپ مطالعہ کا خاص ذوق رکھتے تھے، کبھی کبھار عشاء کے بعد سے مطالعہ شروع کرتے اور تہجد تک اس کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔

۱۹۸۲ء کے بعد روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی دعوت شروع ہوئی تو آپ بھی اس دعوتی پروگرام کے ساتھ منسلک ہوگئے، علمائے کرام اور دانشوران قوم اور تجار حضرات کو اسلام کی دعوت منصوصہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، خدمت خلق اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرنے کی انتھک کوشش شروع کردی، مجلس خاص میں درس قرآن وحدیث جب کہ مجلس عام میں مواعظ حسنہ اور نصائح بلیغہ سے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ اور فراموش کردہ تاریخ کی یاد دہانی کرائی، اور احساس کمتری میں مبتلا تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی ذمے داری کا احساس دلایا، بعد میں آپ روہنگیا سالیڈیریٹی آر گنائزیشن کی مجلس شوری وعاملہ کے رکن رکین چن لئے گئے تھے۔

۱۹۸۸ء میں جنرل سومونگ کی نام نہاد سیاسی آزادی کے دوران روہنگیا مسلمانوں کی اندرون ملک میں ایک علیحدہ تنظیم بنانے کے سلسلے میں حافظ حبیب اللہ صاحب نے بڑی محنت کی، بالآخر ایک تنظیم جمہوریت برائے انسانی حقوق جو بنی اور جسے رجسٹریشن کرنے میں مسلمان کامیاب بھی ہوگئے تھے ،اس میں حافظ صاحب مرحوم کا کلیدی کردار رہا تھا۔

حافظ صاحب نہایت ذکی، حلیم الطبع، صابر، مدبر، منتظم، معاملہ فہم، شب بیدار اور دور اندیش انسان تھے ، دوست تو دوست بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی حسن برتاؤ وحسن سلوک میں یکتائے روزگار تھے، مدرسہ قاسم العلوم چارکبو میں آپ تقریبا دس سال تک رہے، طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ آپ کا سلوک ایک رحم دل مربی وشفیق باپ جیسا تھا، موصوف نے اپنی زندگی میں آٹھ مرتبہ حج ادا کیا۔

بالآخر یہ سیرت وصورت کے جامع شخصیت ۵۵ /سال کی عمر میں ۲۴/ جمادی الثانی / ۱۴۱۳ھ۔۱۸ / دسمبر/ ۱۹۹۲ء میں بروز جمعہ بعد صلاۃ الفجر اپنے خالق حقیقی جا ملی، ظلم واستحصال اور ناانصافی کے خلاف صف آراء اس مرد مجاہد نے عین حالت رباط میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے اپنے پیچھے ہزاروں تلامذہ، سینکڑوں احباب وخیر اندیش اور ایک بیوہ، پانچ صاحب زادیاں

اور دو صاحب زادے چھوڑے، آپ کے انتقال پر ملال پر ماہ نامہ ''انصاف'' کے لائق ایڈیٹر مولانا سیف اللہ خالد صاحب نے مذکور ماہنامہ کے ایک شمارہ میں بہت خوب لکھا ہے کہ:

''جمعہ ۱۸ / دسمبر کو یہ اندوہناک خبر نہایت رنج والم کا باعث بنی کہ جید عالم اور معروف حافظ مولانا حبیب اللہ وفات پا گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک وسیع النظر اور کشادہ مشرب عالم دین تھے، عمر بھر قرآن وحدیث اور علوم دین کی اشاعت وتدریس میں مصروف رہے، کئی مدرسوں اور دار العلوموں سے وابستہ رہے، بعض کی سربراہی بھی کی، جس ادارے سے آپ متعلق رہے، اسے شہرت وترقی کے بام عروج تک پہنچا دیا، نہایت ذہین، زیرک، معاملہ فہم، خوش خلق، صلح جو دیانتدار، خداترس اور متقی شخص تھے۔

الحمد للہ روہنگیا قوم میں علمائے دین کی تو ہمیشہ سے کوئی کمی نہیں رہی، مگر کوئی دو تین عشرے پہلے تک حفظ قرآن بہت کم ہوا کرتے تھے، اور ایسا شخص تو بہت شاذ ونادر ہی ملتا تھا، جو بیک وقت حافظ قرآن بھی ہو اور فارغ التحصیل مستند عالم دین بھی (اب یہ کیفیت نہیں رہی) حافظ صاحب ان اولین افراد میں سے تھے جن میں یہ دونوں خصوصیات جمع تھیں، اور خود مرحوم نے بھی ان دونوں جوہروں کا تا حیات خوب خوب استعمال کیا، اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، وہ جتنے اچھے حافظ تھے اتنے ماہر درسیات بھی تھے، چنانچہ دار العلوم معین الاسلام (۱) سے فراغت کے بعد ارکان کے جس مدرسے میں انہوں نے پڑھانا شروع کیا تو جہاں ان کے ذمے درس نظامی کے مختلف کتب کے اسباق تھے، وہ وہیں تحفیظ القرآن کے بھی استاد تھے، گو آخر میں ان کو انتظام واہتمام کی بھاری ذمے داریوں کے سبب صرف اعلی جماعتوں کی بعض

---

(۱) میں نے حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب کی فراغت کی تفصیلات چند حضرات سے سنیں کہ آپ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کے فارغ تھے، لیکن خالد صاحب نے کسی معین الاسلام کی بات لکھی ہے، ہوسکتا ہے کہ ہاٹہزاری والا مدرسہ معین الاسلام ہو۔ (مولف)

کتب کی تدریس پر ہی اکتفا کرنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ آج ان کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں سے بعض ان کی طرح بیک وقت حافظ القرآن و عالم ہیں، اور بعض صرف عالم اور بعض صرف حافظ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدا بخشندہ

حافظ صاحب مرحوم حق کے معاملے میں کسی مداہنت یا گروہی عصبیت کے قائل نہ تھے، بلا خوف لومۃ لائم حق کو حق کہتے تھے، اور اسے قبول کرتے تھے، ہر چیز کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، اور ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں جانچتے تھے، انہوں نے اپنے علم وفہم، اخذ وتجربہ اور نقد وبصر کی دولت کو کسی دوسرے کے ہاتھ گروی نہیں رکھ دیا تھا، اس وجہ سے وہ مطالعے کے خوگر تھے، دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تاریخی موضوعات پر قدیم وجدید مصنفین ومفکرین کی کتب کا خالی الذہن ہوکر مطالعہ کرتے تھے، اور ہر ایک کی قدر وقیمت سے واقف تھے، اور اس کے حقیق برملا اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

۱۹۸۲ء میں ار ایس او کے قیام کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ اس سے منسلک ہو گئے تھے، جلد ہی رکن بنائے گئے، انہوں نے ارکان میں دور دور تک تنظیم کی دعوت کو عام کیا، ۱۹۸۸ء میں مرکزی شوری وعاملہ کے رکن چنے گئے، دوبارہ ۱۹۹۱ء میں بھی عاملہ کے رکن منتخب ہوئے، اور ار ایس او کے مرکزی شعبۂ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری سنبھالی، اس سال اہل وعیال کے ہمراہ مجاہدین کیمپ میں آ گئے، اور مجاہدین کی تعلیم وتربیت کے لئے قائم ادارہ کی نگرانی اور منتہی مجاہد طلبہ کے اسباق کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

سیف وقلم کے حامل، دعوت وجہاد کے عامل، کلام اللہ کے حافظ اور سنت رسول اللہ کے عالم اس حقیقی مجاہد فی سبیل اللہ نے عین محاذ پر حالت رباط میں اس طرح داعی اجل کو لبیک کہا اور شہادت کی موت پائی کہ زبان تلاوت قرآن میں مصروف تھی:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را''۔

حافظ محمد صدیق صاحب حافظ حبیب اللہ صاحب کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

''حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا مودودی کی ذات اور ان کے نظام سے متاثر ہوکر RSO میں شامل ہوئے، اور فکر مودودی کو ارکانیوں میں لانے کی بے انتہا کوشش کی، جنوبی منگڈو (بلکہ پورے ارکان میں) یہ پہلا شخص تھا، جو فکر مودودی صاحب سے زیادہ متاثر تھا(۱) اور باقاعدہ تفہیم القرآن کی تبلیغ کرتا تھا، اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ارکان میں فکر مودودی کی تبلیغ میں حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وافر حصہ ہے، اور یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ایسے حفاظ کرام بے شمار ہیں جو ایک رات میں قرآن پاک ختم کرتے ہیں، اور ایک غلطی بھی نہیں ہوتی، اور ایسے بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں، جن سے کوئی بھی آیت پوچھ لی جائے تو سوال ختم ہونے سے پہلے جواب حاضر، ایسے بھی سینکڑوں ہیں جو قرآن پاک کو الٹ پڑھ سکتے ہیں، پھر بھی غلطی نہیں آتی''۔(۲)

---

(۱) میرے ناقص خیال میں مولانا حافظ حبیب اللہ کے علاوہ بھی بہت سے علماء اور دانشور حضرات تھے جو مولانا سید ابو الاعلی مودودی رحمہ اللہ کے افکار سے متاثر تھے، البتہ یہی سچ ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت کو ارکانیوں میں عام کرنے میں حافظ صاحب کی کوشش ناقابل انکار اور ناقابل فراموش ہے، انہوں نے اس حوالے سے اپنی زندگی کو داؤ پر لکھا رکھا تھا۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص:۵۸-۵۹۔

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب تمبر ووی

مولانا حبیب اللہ بن مولانا عبدالکریم کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں شالی منگڈو کی معروف بستی تمبر و میں ہوئی ،آپ کے والد عبدالکریم صاحب ایک درویش صفت اور ہر دلعزیز عالم دین تھے، اور والدہ مرحومہ بھی عالم دوست اور شریف خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم علاقے کے چند مدارس میں ہوئی ، کچھ بڑے ہوئے تو اعلی تعلیم دینی کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور ۱۹۴۹ء میں مدرسہ امینیہ دہلی میں جا داخل ہوئے ، وہاں آپ نے مفتی اعظم ہندوستان حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، خاص طور پر فتوی نویسی کے فن میں آپ نے مفتی صاحب سے خوب فیض حاصل کیا، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کو فتوی نویسی میں جو کچھ مہارت حاصل ہوئی، وہ مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کی مرہون منت ہے''۔(۱)

مولانا ممدوح مدرسہ امینیہ میں تین سال تک تعلیم حاصل کر کے ۱۹۵۱ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تشریف لے گئے، اور وہاں دو سال پڑھ کر آپ نے ۱۹۵۲ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی تھی۔

جہاں تک پتہ چلا کہ مولانا ایک جلیل اللہ عالم دین اور دور اندیش مفکر اور عمیق النظر فقیہ النفس انسان تھے، آپ کو مناظرہ میں خاص ملکہ حاصل تھا، آپ مناظرہ میں فریق مخالف کو بڑی خوبی سے مات دے سکتے تھے، اس لئے خاص طور پر اہل بدعت وخرافات آپ سے بہت ڈرتے تھے، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا ممدوحؒ فراغت کے بعد ۱۹۵۳ء میں ارکان واپس تشریف لائے اور اپنے آبائی علاقہ (گاؤں) تمبر و کو درس وتدریس اور فیض رسانی کا مرکز بنالیا، چونکہ اس

(۱) حافظ مولانا محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۱۷۶۔

وقت تمبر و میں ضلالت وبدعت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اہل بدعت وعلمائے سوء کی کثرت تھی، اس لئے مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے درس وتدریس کی بہ نسبت مناظرہ کی طرف زیادہ توجہ دی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی ایک سنگِ گراں تھے، اس لئے اہل بدعت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جان لینے کے درپے ہو گئے، جب تمبر و اور ارکان کی سرزمین مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے لئے تنگ ہوگئی تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ لگ بھگ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۹ء میں ارکان کو خیر باد کہہ کر اپنے بال بچوں سمیت ہجرت کر کے کراچی تشریف لائے ، پھر رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۲ء بغرض حج و ہجرت مکہ المکرمہ تشریف لے گئے ، اور بقول مولانا محمد ادریس صاحب مظاہری وہاں انتقال فرماگئے اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے''۔(۱)

مولانا مرحوم کی گرانقدر خدمات میں ایک ان کی مایۂ ناز تصنیف ''فتاوائے حبیبیہ'' ہے، حضرت نے اس فتاوی میں روز پیش آنے والے مسائل ومشکلات کو سامنے رکھ کر ان کا دینی، علمی وفقہی حل پیش کر دیا ہے، اس کتاب کی تصنیف وترتیب میں جس باریک بینی اور آگہی سے کام لیا ہے، وہ ان کا حصہ ہے، یہ کتاب میری نظر سے مکہ المکرمہ میں فقیر شیخ مختار احمد کے گھر گزری ہے ، ماشاء اللہ بڑی جامع مانع تصنیف ہے، اللہ تعالی مولف مرحوم کے مراتب بلند کرے ، اور ان کو اس خدمت کے صلہ میں جنت الفردوس میں جگہ ملے، کتاب کا ناشر مولانا محمد ادریس صاحب مظاہری اور سن طباعت ۲۰۰۴ء ہے، اللہ تعالی محترم جناب امان اللہ بن مولانا علیم الدین قربان الصائغ اور فقیر مختار احمد مقیم حال مکہ المکرمہ کی حیات اور دولت میں برکت دے کہ ان دونوں نے اس جاندار کتاب کی طباعت میں مالی تعاون کیا تھا ،ان میں سے اول الذکر نے بیس ہزار اور ثانی الذکر نے سولہ ہزار پاکستانی روپیہ دے کر اس دینی اور علمی کام میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

کتاب کی تصحیح اور نظر ثانی حضرت مولانا عبدالسلام چاٹگامی سابق رئیس دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ

(۱) حافظ مولانا محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۱۷۶۔۱۷۷۔

علامہ بنوری ٹاون وحضرت مولانا مفتی عبد اللہ ارکانی فاضل دار العلوم کراچی ومفتی واستاد الحدیث دارالعلوم کراچی نے کی ہے، اوراس جاندار کتاب میں حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد اسماعیل ارکانی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی سعید الرحمن صاحب مفتی جامعہ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاون، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب، حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی کی تصدیقات موجود ہیں، اللہ تعالی نے مولف کی اس گرانمایہ تالیف کو شرف قبولیت بخشا ہے، دعا ہے کہ آخرت میں بھی ان کا مرتبہ بلند ہوجائے آمین۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب تمنگ چنگی

مولانا رشید احمد صاحب شمالی مغربی بوسیدنگ کے مردم خیز علاقہ تمنگ چنگ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، آپ کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں ہوئی، بڑے ہوئے تو چاٹگام گئے اور مدرسہ حکیمیہ عالیہ چنوتی میں داخل ہوگئے، وہیں سے مدرسہ عالیہ کلکتہ گئے، جہاں سے فراغت کی سند حاصل کی تھی۔

آپ فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور گاؤں کے مکتب میں دینی تعلیم دیتے رہے، ۱۹۴۲ء کے جہاد میں شریک ہوئے، بعد میں جہاد کونسل کی بنیاد پڑی تو آپ جہادی قافلے میں شریک ہوگئے تھے۔

جہاد کونسل میں آپ جہادی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلم اور تبلیغ وارشاد کی خدمات انجام دیتے رہے، مزاج عالمانہ اور مبلغانہ تھا، ہروقت جہادی قافلے کو اتحاد واتفاق کی تلقین کیا کرتے تھے۔

مولانا بعد میں جہاد کونسل کے مفتی مقرر ہوئے، ساتھ ساتھ انجمن مشیران میں رکن چن لئے گئے تھے، آپ بڑا پختہ اور صائب الرائے انسان تھے، کسی بھی معاملہ کو دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے سوچتے، اور مجاہدین کو شریعت اسلامیہ کے آگے سر جھکائے رکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

جہاد کونسل میں پھوٹ پڑنی شروع ہوئی تو آپ نے ہر قیمت پر مجاہدین کے اتحاد کے لئے جدوجہد کی، لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ مجاہدین میں پھوٹ پڑ ہی گئی، آپ نے اس حالت میں بھی مجاہدین کو ایک ہی جھنڈا تلے جمع کرنے کی ممکنہ کوشش کی، اور اتحاد و یک جہتی کی دعوت لئے ہر گروہ کے پاس پہنچے تھے۔

اس جہادی قافلے کے حوالے سے آپ کی بڑی بڑی خدمات کی باتیں سنتے میں آئیں، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ کی نظر شریعت اسلامیہ کے حوالے سے کتاب وسنت پر بڑی گہری تھی، سیاسی نقطۂ نظر سے بھی آپ بڑے صاحب بصیرت معلوم ہوتے ہیں، اور ہر مسئلہ کو بڑی باریک بینی اور بصیرت سے فیصلہ دیتے تھے۔

آپ کا دماغ بڑا متوازن، اور طبیعت جذباتیات سے گویا پاک تھی، ساتھ ساتھ تقوی اور پرہیزگاری اتنی تھی کہ ایک طویل زمانے تک آپ کو لوگ ہادئ قوم سمجھتے اور ان کے سامنے بلند آواز سے گفتگو سے پرہیز کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فندوفرانگی

مولانا سلطان احمد صاحب موضع فندوفرانگ بوسیدنگ میں ۱۹۰۰ء پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب ایک نہایت دین دار، سادہ لوح اور اپنی بستی کے ہر دل عزیز بزرگ تھے، لوگوں کے ساتھ تعاون اور خیر خواہی کرنے میں بہت ہی مشہور تھے، مولانا کی والدہ بھی ایک پرہیز گار اور طلبائے دین پسند خاتون تھی، ان دونوں بزرگوں کی آرزو تھی کہ ان کا بیٹا ایک عالم دین اور قوم کا خادم بنے۔

مولانا سلطان احمد کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے گاؤں کے ساتھ علاقے کے مدارس میں ہوئی اور اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، ایک اطلاع کے مطابق آپ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ جب کہ دوسری اطلاع کے مطابق مدرسہ عالیہ ڈھاکہ سے پڑھائی کی تکمیل کی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سلطان احمد صاحب وطن واپس آئے اور اپنے علاقے میں درس و تدریس کا آغاز کیا، کہتے ہیں کہ آپ علم وثقافت کے بڑے رسیا تھے، چنانچہ آپ نے اپنے علاقے میں علم دین کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

مولانا سلطان احمد صاحب ایک مرد مجاہد تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں آپ نے مجاہدین میں شامل ہوکر عبد المجید معروف بہ لنگڑا راجا کے لشکر میں شامل ہوئے جہاد اسلامی کا فریضہ انجام دیا، بعد ازاں پیس کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو آپ نے اس میں شامل ہوکے قوم کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، بوسیدنگ میں پیس کمیٹی کے تحت جناب ظہیر الدین بی اے علیگ کی سربراہی میں انجمن اسلامی عدالت قائم ہوئی تو مولانا اس کے رکن رکین رہے، انصاف پسندی کے حوالے سے آپ کی خدمات مشہور ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد حضرت مولانا محمد جعفر حسین قوال کی قیادت میں جہاد کونسل کی تشکیل ہوئی تو مولانا سلطان احمد صاحب اس میں شامل ہوگئے، جہاد کونسل میں آپ نے وہ خدمات انجام دیں جو ایک صحیح معنی کے عالم دین کی شایانِ شان ہوتی ہیں۔ مولانا سلطان احمد صاحب نہایت باشعور عالم دین ہونے کے ساتھ ایک زندہ دل مرد مجاہد تھے، آپ نے تقریبا ۱۹۶۵ء میں انتقال کیا، اور اپنی بستی میں مدفون ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید عظیم صاحب سنبوی منگڈوی

دور آخر میں سرزمین ارکان کے عظیم و معروف عالم دین، شیخ الحدیث حضرت مولانا سید عظیم/سعید صاحب کی ولادت باسعادت ۱۹۰۴ء میں سنبنیہ فارہ منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد ایک نہایت دین دار، خدا ترس، خود دار اور علماء وطلباء دوست انسان تھے اور والدہ بھی اطلاع کے مطابق بڑی سیدھی سادی اور نہایت پارسا و عابدہ خاتون تھی، والدین کی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا سید عظیم ایک دن بڑے عالم دین بن کر ملت وقوم کا خادم بنے۔

مولانا سید عظیم صاحب نے ابتدائی تعلیم علاقے کے مختلف دینی درسگاہوں میں پائی، کچھ بڑے ہوئے تو ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے جاکر مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی میں جا داخل ہوئے، چنانچہ وہاں چند سال پڑھ کر ۱۹۲۵ء میں سند فراغت حاصل کی اور وطن واپس آگئے تھے۔

حضرت مولانا سید عظیم صاحب فراغت تعلیم کے بعد سیدھے وطن واپس آئے اور اپنی آبائی بستی میں ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں دینیات کی ابتدائی تعلیم دی جاتی رہی تھی، اس کے بعد بر گیا بیل والے مدرسہ (شاید یہ مدرسہ اب نہیں ہے) میں چند سال درس دیئے، بعد میں مدرسہ عالیہ شقدار فارہ ((جس کا اصل نام جامعۃ العلوم الاسلامیہ تھا) میں منتقل ہو گئے، چنانچہ آپ ہمیشہ کے لئے اس مدرسہ کے ہو گئے، اور مدرسے کے سرپرست اعلی ہونے کے ساتھ شیخ الحدیث کے بطور عرصۂ دراز تک اس درسگاہ میں پڑھاتے رہے تھے۔ آپ کی نیک نیتی اور خلوص کا کرشمہ تھا کہ آپ کے دور میں یہ مدرسہ نہ صرف ارکان بلکہ پورے برما میں ایک مثالی دینی درسگاہ کی حیثیت سے شہرت پا گئی تھی، یوں ملک کے طول وعرض میں آپ کے بے شمار تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں، جنھوں نے بھی علم ودین کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، مولانا عبد الحمید شجاع فاروی، مولانا بدر الاسلام بن مولانا زین العابدین کولار بیلی، مولانا حبیب اللہ پکتلوی، مولانا مفتی امیر حسین صاحب وغیرہ جیسے نادرۂ روزگار کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

علاوہ ازیں آپ نے تحریک آزادی کے حوالے سے بھی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، جہاد اسلامی

سے لولگانے والوں کی ہر امکانی مدد اور تعاون کیا تھا، خاص طور پر جمعیت علماء کے ساتھ (اس کا تعلق مسلح سے ہو یا غیر مسلح سے) بہت زیادہ تعاون کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے واقعہ کرب بلا میں آپ نے بذات خود جہادی فریضہ انجام دیا، مجاہدین اسلام کی سر پرستی بھی اور قیادت بھی کی تھی، جبھی شہر بوسیدنگ میں مگھوں کی یورش ہوگئی تو آپ نے منگڈو کے مسلمانوں کو جہاد اسلامی کے لئے آواز دی تبھی یہاں کے مسلمان آپ کی آواز میں لبیک کہتے ہوئے بوسیدنگ کے مسلمانوں کی مدد اور تعاون کو نکلے تھے، اور مگھوں پر ایسا مجاہدانہ حملہ کیا کہ بالآخر نہ صرف بوسیدنگ سے خون خوار مگھوں کو پسپا ہونا پڑا بلکہ مگھوں کو ایسی شکست فاش ملی کہ بھاگتے بھاگتے ہزاروں مگھ جہنم رسید ہوگئے تھے، دراصل مگھوں کی یہ شکست مسلمانوں کے لئے ایک ایسا واقعۂ فتح تھا، جس کے بعد الحمد للہ آج تک مسلمانوں پر از سر نو حملہ کرتے وقت ان خون خواروں کو ۱۹۴۲ء کا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

مگھوں کی اس شکست و ریخت اور پسپائی کے بعد یہاں شمالی مغربی ارکان میں مسلمانوں کی ایک حکومت بنی، جس میں حضرت مولانا سید عظیم صاحب ارباب بست و کشاد میں شامل تھے، اس وقت آپ نے مسلمانوں کے ساتھ اس نوزائدہ حکومت کی نہ صرف سر پرستی کی بلکہ ایک دینی رہنما کی حیثیت سے اس حکومت کو اپنے نیک مشوروں سے نوازنواز کر چلایا تھا۔

آپ بڑے خوش طبع، حاضر جواب، دور اندیش اور دور بین رہنما انسان تھے، آپ کے مزاحیہ کلمات اور حاضر جوابی کی شہرت اور کہانیاں اب بھی وطن کے لوگوں کی زبانی سنی جاتی ہیں، باد جود ان چیزوں کے کہ آپ ایک عظیم عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خدا رسیدہ درویش بھی تھے، آپ کی بعض کرامات کی کہانیاں لوگوں کی زبانی سنی گئیں اور اب بھی سنی جاتی ہیں۔

مولانا سید عظیم صاحب عرصۂ دراز تک شقد ارفارہ کی اس نامور درسگاہ میں قال اللہ وقال الرسولؐ کے درس دیتے ہوئے ۱۹۹۷ء میں انتقال کر کے اپنی آبائی بستی کی قبرستان میں دفن ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا صدیق الرحمن صاحب شہید کلونگی

صدیق الرحمن بن جلال احمد بن شفیق الرحمن بن علیم الدین ۱۹۶۱ء میں جنوبی منگڈو کی بستی کلونگ میں پیدا ہوئے، ۱۹۶۶ء میں آپ کے گھر والوں نے ارکان سے ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی میں پناہ لی تھی، اسی دوران صدیق الرحمن نے مدرسہ خلیلیہ موسی کالونی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، ساڑھے تین سال پاکستان میں مہاجرت کی زندگی گزارنے کے بعد وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ارکان واپس آ گئے، اور اسکول میں برمی اور مدرسہ میں اردو، فارسی، عربی اور دین کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے، پھر چار سال کے بعد تبلیغی مرکز منگڈو میں واقع مدرسہ بدر العلوم میں داخل ہو گئے اور مولانا احمد حسین کی نگرانی میں جماعت ششم تک تعلیم حاصل کی، وہ ۱۹۸۰ء میں مدرسہ دار السنہ نہلا بنگلا دیش میں زیر تعلیم رہے، اور وہاں سے ۱۹۸۳ء میں منگڈو کے معروف مدرسہ جامعہ محمدیہ فرامفورو میں ایک سال جماعت اولی کی تعلیم پا کر اگلے سال حضرت مولانا ابو الحسین صاحب عرب شاہ فاروی کے ہم راہ مدرسہ عالیہ شقد ارفارہ منگڈو میں جا کے دورۂ حدیث پڑھ کر تعلیم کی تکمیل کی تھی۔

طالب علمی کے دور میں صدیق الرحمن وعظ و نصیحت، تبلیغ و تلقین کا خصوصی ذوق رکھتے تھے، آپ فراغت کے فورا بعد مدرسہ بدر العلوم شیتا فوریکہ میں مدرس کی حیثیت سے مقرر ہو گئے، ایک سال کے بعد کلونگ کے علماء اور معززین نے پر زور اصرار کیا کہ آپ کی آبائی بستی کو آپ کی ضرورت زیادہ ہے، چنانچہ آپ نے کلونگ میں اپنی نگرانی میں ایک دو منزلہ مکان تعمیر کروایا، اور ساتھ ایک مسجد کی بنیاد رکھ کے دعوت و تبلیغ، تعلیم و تلقین اور درس تدریس کا بھر پور کام شروع کر دیا، ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ امر بالمعروف نہی عن المنکر اور مستقبل میں درپیش جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری اور اعداد کے فریضے سے بھی غافل نہ رہے، اس کے لئے اندر ہی اندر خفیہ طریقہ پر تعلیم و تربیت کا کام بھی جاری رکھا تھا۔

صدیق الرحمن کی یہ جد و جہد اور کوششیں رنگ لائیں، بستی میں ایک عمومی بیداری کی فضا پیدا ہو گئی تھی، خاص طور پر نوجوانوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا، اس صورت حالات کو دیکھ کر برمی فوج بھی چوکنی ہو گئی تھی، بستی میں فوج نے اپنے ایجنٹ چھوڑے، جو پل پل کی کیفیت اور خبریں

پہنچاتے تھے، جن میں سچ کے ساتھ بہت کچھ مبالغہ بھی شامل ہوتا تھا، مقامی حکومت نے بستی میں موجود اپنے دلالوں اور بعض حاسدین کو آپ کے خلاف جمع کر کے استعمال کیا، اور آپ کے گھر والوں پر رات کی تاریکی میں حملہ کروایا گیا، صدیق الرحمن نے اس کا بے جگری سے مقابلہ تو کیا لیکن مقابلے میں آپ کے دو دانت ٹوٹ گئے اور ان کے والد بھی شدید زخمی ہو گئے تھے، بعد میں زخموں کی تاب نہ لا سکے اور زخموں سے پیدا ہونے والی بیماری کے تحت ۱۹۹۲ء میں سفر حج کے دوران کوتو پالنگ کے مقام پہ وفات پا گئے ۔

اس سانحہ کے باوجود صدیق الرحمن کے قدم متزلزل ہونے کہ بجائے ثابت قدم رہے، آپ نے مدرسہ کا انتظام دوبارہ سنبھال لیا، اس دوران بستی میں ایک حادثہ رونما ہوا کہ ایک بدنام زمانہ مخبر کو کسی نے قتل کر دیا تھا، صدیق الرحمن کے وشمنون نے آپ پر الزام لگایا تو پولیس نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، لیکن صدیق الرحمن ان کے ہاتھ نہ آئے، بڑی بہادری اور بے جگری سے پولیس کے محاصرہ سے وہ سے باہر نکل جانے پر کامیاب ہو گئے تھے، یوں اکیلے جنگل میں داخل ہوئے، اور جنگل میں متواتر تین دن اور تین رات کا سفر کر کے جنوب سے شمال مغرب کی طرف چلتے ہوئے مجاہدین ار ایس او کے مرکز میں پہنچ گئے، جہاں انہوں نے عملی جہاد کی تربیت حاصل کی، اور اس کے بعد دوسروں کو بھی تربیت جہاد سے آراستہ کرتے رہے تھے۔

باالآخر وہ گھڑی آن پہنچی کہ جس دن آپ کی آرزو پوری ہونے جا رہی تھی، اب صدیق الرحمن جو کمانڈر صدیق الرحمن بن چکے تھے، اپنے ساتھی مجاہدین کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کے خلاف نبرد آزما ہو گئے، صدیق الرحمن کے حصے میں اس تگ وتاز کے لئے وہی میدان آیا جسے چھوڑ کر وہ مجاہدین کے ساتھ آملے تھے، چنانچہ ۲۰/مئی/ ۱۹۹۴ء تک وہ دشمن کے درپئے رہے، گھات لگا کر ان پر حملے کرتے اور بھاگتے رہے، اور دشمن کی چوکیوں پر شب خون مارتے اور ان کی گزرگاہوں پر بارودی سرنگیں بچھاتے رہے تھے، غرض آپ نے ان تھوڑے سے دنوں میں برمی حکومت اور فوج کی ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا، باالآخر عاجز آکر برمی فوج کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے چھاتہ بردار فوج میدان میں اتارنی پڑی تھی، بھاری تعداد کے فوجی اور نیم فوجی دستوں نے مٹھی بھر مجاہدین کا محاصرہ کر لیا، ان کی خوراک اور رسد کی ترسیل کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے، مقامی دیہاتیوں کو بھی زبردستی

مجبور کیا گیا کہ وہ فوج کا ساتھ دیں، اور ہر چند قدم کے فاصلے پر چوبیس گھنٹے کھڑی رہنے والی انسانوں کی دیوار نما باڑ کھڑی کر دی گئی، صدیق الرحمن اور آپ کے مجاہد ساتھی صبر وشکر کے ساتھ اس گھیراؤ سے نکلنے اور مصیبت کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سوچتے رہے، ابھی ان کے پاس خوراک کا ذخیرہ بالکل ختم ہو گیا اور بچنے کی صورت بالکل نہیں رہی تو آپ نے سوچا کہ کیوں نہ دشمن پر ٹوٹ پڑا جائے، مرنا تو ویسے بھی ہے، آخر میں کچھ کر کے اور دشمن کو جتنا بھی ممکن ہو نقصان پہنچا کر کیوں نہ جان قربان کی جائے۔

اس فیصلے کے بعد صدیق الرحمن اور آپ کے ساتھی مجاہدین ۹ / ذوالحجۃ/ ۱۴۱۴ھ بمطابق ۲۰ /مئی ۱۹۹۴ء کو محاصرہ توڑ کر باہر نکل آئے، برمی فوج کے ساتھ دست بدست مقابلہ کیا، اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک تن اور جان کا رشتہ باقی رہا، چنانچہ اس حالت میں آپ نے جان جان آفرین کا حوالہ کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا صدیق الرحمن بڑے دلیر، بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مجاہد اور داعی تھے، اللہ تعالی آپ کی شہادت کی برکت سے سرزمین ارکان کو اوباشوں کے پنجے اور غلامی سے رہا کرے، آمین۔

حضرت مولانا قاری عبدالامین صاحب نندا خالوی

مولانا عبدالامین بن مولانا عبدالرحیم کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں شمال منگڈو کی معروف بستی نندا خالی میں ہوئی، مکتب نشینی کے بعد آپ نے درسیات کی تعلیم مولانا احمد اللہ بن مولانا سراج الحق صاحب وغیرہ سے چھوٹے گوجربیل کے مدرسہ میں پائی، وہاں سے جماعت پنجم کے اختتام کے بعد عاشقہ فارہ کے مدرسہ میں جا داخل ہوئے، وہیں آپ جماعت چہارم تک کی تعلیم مکمل کر کے پاکستان چلے گئے اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں جا داخل ہوئے، وہاں سے آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد اس جامعہ کے شعبۂ قرآت میں داخلہ لیا، چنانچہ آپ نے شعبۂ قرآت میں بھی بڑا نام پیدا کیا تھا، کہتے ہیں کہ آپ کی آواز میں جادو جیسا اثر تھا، آپ نے جہاں بھی کلام اللہ کی تلاوت کی لوگ کلام اللہ کی تاثیر اور آپ کی آواز کی دلکشی سے محظوظ ہوتے رہے تھے۔

فراغت تعلیم کے معا بعد مولانا وطن واپس آئے، اور اپنے علاقے کے ایک مدرسہ میں عرصۂ دراز قرآت کلام اللہ کا درس دیتے رہے، بدنام زمانہ ناگامن آپریشن کے دوران ۱۹۷۸ء میں آپ نے ترک وطن کیا اور مکہ مکرمہ کی بستی جروال میں مع اہل وعیال جا ٹھہرے، وہاں جروال کی ایک مسجد جسے لوگ حاجی عثمان کی مسجد کے نام سے پہچانتے ہیں میں امام اور خطیب مقرر ہونے کے علاوہ بستی کے بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے رہے تھے۔

مولانا امامت اور خطابت کے علاوہ تقریبا تیس سالوں تک کلام اللہ کی تعلیم اور لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے بالآخر ۲۰۱۰ء میں انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالامین صاحب بڑے پائے کے بزرگ اور نہایت اخلاقی آدمی تھے، لوگوں سے بڑی شرافت کے ساتھ ملا کرتے تھے، داعی ومبلغ بھی تھے، ہر کہیں لوگوں کو وعظ ونصیحت کے ذریعے راہ راست پر لانے کوشش کیا کرتے تھے، ویسے لوگ آپ کی بڑی عزت کیا کرتے آپ کی باتوں کو ٹالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، اللہ تعالی حضرت مرحوم کو اپنی خاص نعمتوں سے بہرہ ور کرے، اور آپ کے لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا عبدالجبار المعروف بہ فقیر مولوی صاحب

مولانا عبدالجبار بن احمد علی/علی احمد میاں کی ولادت با سعادت ۱۳۰۰ھ میں شمالی منگڈو کی معروف و مشہور بستی سعد اللہ سر میں ہوئی، علم وعمل کے حوالے سے آپ کا خاندان علاقہ بھر میں بہت معروف تھا، حضرت مولانا کے والد احمد علی مرحوم نہایت دین دار، علماء پسند، سخی اور خدا ترس انسان تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا کا خاندان کسی زمانے میں ارکان میں ہونے والے مظالم سے تنگ آ کر کوکس بازار کا علاقہ عیدگاہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا، چنانچہ حضرت کے والد بزرگوار جناب مرحوم احمد علی میاں کی ولادت بھی وہیں ہوئی تھی، برطانوی دور حکومت کے اواخر میں ارکان کے حالات کچھ سدھر گئے تو یہ خاندان دوبارہ اپنے آبائی علاقہ میں جا بسا، چونکہ حکومت برطانیہ کی تھی، سیاسی اعتبار سے ملک ایک ہی تھا، یوں آپ کے خاندان کے بعض افراد سعد اللہ سر سے لے کر عیدگاہ کے درمیانی علاقے میں بسے ہوئے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی، پھر آپ نے مزید تعلیم کے لئے مدرسہ حسینیہ چاٹگام میں داخلہ لیا، جہاں چند سال پڑھنے کے بعد اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کی راہ لی اور سیدھے جا کر مادر علمی دارالعلوم دیوبند جا داخل ہوئے تھے۔

طبعا آپ ایک ذہین وفطین طالب علم تھے اور محنتی بھی، ساتھ ہی ساتھ حلم وبردباری، شرافت ونجابت کے پیکر بھی، آپ دارالعلوم دیوبند میں یوں تو وقت کے تمام اساتذۂ گرامی سے مستفید ہوئے، تاہم آپ کی تعلیم وتربیت کے ساتھ دینی اور روحانی تسکین حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی کے یہاں ہوئی تھی، حضرت مولانا اصغر حسین میاں جی وقت کے بڑے امام، فقیہ، محدث ومورخ ہونے علاوہ ایک عظیم المرتبت مادر زاد ولی کامل تھے، جن کی تعلیم وتربیت نے مولانا عبدالجبار صاحب کی فطری صلاحیت وجواہر کو مزید نکھارا اور سنوارا تھا، آپ نے ایک طویل مدت تک حضرت میاں صاحب سے علمی اور روحانی استفادہ کیا، اور اپنے مرشد کامل کی صحبت وخدمت میں عرصۂ دراز تک رہ کر اجازت بیعت سے سرفراز ہوئے، چنانچہ اس حوالے سے ایک تفصیلی بیان مولانا حافظ محمد صدیق سے سنئے کہ:

''علامہ موصوف ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم اور روحانی تربیت کے حصول کے لئے ہندوستان چلے گئے، وہاں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم ہستیاں اپنی اپنی فیوضات سے علوم نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیاسوں کو سیراب کر رہی تھیں، تاہم علامہ موصوف نے زیادہ استفادہ امام وقت، عظیم مورخ اور محدث زمان مولانا اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (معروف میاں صاحب) سے کیا، جو مادرزاد ولی تھے، میاں صاحب کو شاہ عبداللہ عرف میاں جی مناشاہ سے خلافت ملی، جن کے اندر جذب اور استغراق کی کیفیت رہتی تھی، شاید یہ کیفیت و حالت فقیر مولوی کے اندر منتقل ہوئی ہو، بہر حال علامہ موصوف نے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو کر سلوک کے منازل طے کرنا شروع کیا، میاں صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی صلاحیتوں اور موروثی شرافتوں کو دیکھ کر بہت ہی کم مدت میں خرقۂ خلافت عطا کر کے بیعت کی اجازت دے دی، بہر حال علامہ موصوف وارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن مالوف واپس آ گئے، سن فراغت لگ بھگ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء ہے''۔(۱)

تعلیم و تربیت اور اجازت بیعت کے بعد مرشد کامل کی چاہت اور حکم سے آپ وطن واپس آئے، یہاں پہنچتے ہی آپ نے نکاح کی سنت ادا کی، پھر کوکس بازار کی جانب مشرق میں واقع معروف علاقہ کھروشکول میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جہاں آپ نے مدتوں خدمات دینیہ انجام دیں، ماشاء اللہ اللہ اس پاک اور برگزیدہ بندہ کی تاسیس کردہ یہ درسگاہ اب بھی دین وملت کی خدمات انجام دے رہی ہے، پھر راموکی مشرقی جانب پر واقع گرجنیہ کے مقام پر بھی آپ نے ایک دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جہاں آپ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۸۶۔

عرصۂ دراز تک علم دین کی خدمات انجام دیتے رہے، اس مدرسہ میں حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب (سابق ناظم دارالعلوم میانجانپور وسرپرست اعلیٰ حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان برما) نے بھی تعلیم حاصل کی تھی، اس حوالے سے دارالعلوم احمدیہ سعد اللہ سر کے حالیہ مہتمم مولانا صدیق احمد صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے:

''دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد مولانا عبد الجبار صاحب نے عیدگاہ کے قریب ایک ابتدائی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی (۱) جس میں آپ نے چند سال خدمت کی، پھر راموکے مشرق میں گرجنیہ کے مقام پر ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جس میں سرزمین ارکان کے نامور شیخ استاد الاساتذہ حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب نے بھی تعلیم حاصل کی تھی، بعد میں جاپان برطانیہ کی جنگ کے دوران آپ اپنے خاندان سمیت تولاتولی کے مقام پر آئے، اور جنگ کے اختتام کے بعد آپ اور آپ کا خاندان اپنے آبائی علاقہ سعد اللہ سر چلا آیا تھا''۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے خاندان سمیت لگ بھگ ۱۹۲۴ء میں سعد اللہ سر آ گئے تھے، یہاں آتے ہی ۱۹۲۵ء میں سرزمین ارکان کی وہ جیتی جاگتی درسگاہ کی بنیاد ڈالی، جس نے وطن مقدس کو علم وعرفان کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ مولانا حافظ محمد صدیق اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''اس کے بعد مولانا برما آ گئے، برما آ کر ۱۳۰۵ھ/ بمطابق ۱۹۲۵ء میں اپنے پیدائشی علاقہ سعد اللہ چر میں اپنے والد ماجد احمد علیؒ کی طرف منسوب کر کے مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک دینی ادارہ قائم کیا، جہاں سے لاکھوں علماء کرام نکلے اور نکل رہے ہیں، اس مدرسہ کے ساتھ ایک خانقاہ بھی قائم ہے، جس سے لاکھوں فرزندان توحید فیوضات وبرکات سے مالا مال ہو رہے ہیں، بہر حال علامہ موصوف نے اپنی حیات

(۱) مولانا صدیق احمد صاحب کے بیان کے مطابق کھرشکول والے مدرسہ سے پہلے عیدگاہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ابتدائی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، جس میں آپ نے چند سال خدمت انجام دی تھیں۔

میں تقریباً آٹھ مدارس قائم کئے، اور سب کو بحسن وخوبی چلاتے بھی رہے‘‘۔(۱)

بہرحال اس درسگاہ سے لاکھوں نہ ہوں تو ہزاروں علماء پیدا ہوئے، جنہوں نے وطن مقدس کے چہرۂ زیبا کو مزید نکھارا، اور علم وعرفان کے اس شوریدہ دریا سے بہتوں نے ندیاں اور نالے نکالے، جن سے خواص ہی کیا عام انسان بھی اپنی اپنی پیاس بجھانے میں کامیاب ہوئے تھے، اس درسگاہ کی پیداوار میں سے وقت کے عظیم عالم دین اور شیخ کامل حضرت مولانا محمد ادریس (مجاز بیعت حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام) جیسے انسان بھی ہیں، جو حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کے حقیقی بھانجے تھے، اور وارث کامل بھی۔

عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مجذوب انسان تھے، مگر جہاں تک پتہ چلا کہ آپ ایک نرے کورے مجذوب نہیں تھے، بلکہ آپ کی زندگی جذب واستغراق کی کیفیت میں کم گزری تھی، جذب واستغراق سے زیادہ ذکر الٰہی اور عامۃ الناس کی خدمات اور رشد وہدایت میں گزاری تھی، تاہم یہ سچ ہے کہ جب آپ پر جذب واستغراق کا غلبہ ہوجاتا تو آپ دنیا ومافیہا سے قسماً بے تعلق ہوجاتے تھے، اس حالت میں آپ صحرانوردی کی طرف مائل ہوجاتے اور محلہ محلہ گاؤں گاؤں شہر شہر پھرا کرتے تھے۔

ادھر اتنی سی بات سننے میں آئی کہ زمانۂ طالب علمی میں دارالعلوم دیوبند میں آپ پر کبھی کبھار حال طاری ہوجاتی تھی، دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد ظاہر ہے کہ آپ نے تدریسی خدمات کو اپنی زندگی کا معمول بنالیا تھا، شادی خانہ آبادی سے لے کر دارالعلوم احمدیہ کی تاسیس تک آپ پر جذب واستغراق کا غلبہ بہت کم ہوتا تھا، حتی کہ احمدیہ کی بنیاد کے بعد مدتوں تک آپ پر فنائیت اور انجذاب واستغراق کا غلبہ بہت کم ہوا، عمر کے آخری مرحلہ میں جاکر یہ کیفیت آپ پر زیادہ سے زیادہ ہونے لگی تھی۔

عام حالت میں مدرسہ کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی، ساتھ ہی ساتھ رشد وہدایت وتعلیم تلقین میں بھی مصروف رہتے تھے، قدرت کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ جب آپ پر جذب واستغراق کی کیفیت طاری ہو

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۸۷۔

جاتی تو آپ دنیا کے جھمیلوں سے تقریباً بے تعلق ہونے کے باوجود بھی بعض دنیاوی امور ومعاملات اور متوسلین کے حالات سے واقف رہتے تھے، تعجب کا یہ مقام ہے کہ اس کیفیت، جذب واستغراق کے حالات میں بھی آپ اپنے متبعین، محبین، عامۃ الناس کو دینی اور سماجی معاملات کی حد تک صحیح اور صائب مشورے دے سکتے تھے، حتی کہ آپ سے اس کیفیت میں بھی متعلقین، منتسبین، عامۃ الناس اور زعمائے قوم رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

شک نہیں ہے کہ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ایک عظیم المرتبت شیخ کامل تھے، مگر متوسلین اور متعلقین تک کو پوری آزادی تھی کہ اپنے اپنے دائرے میں ان کی جورائے ہو اس پر قائم ودائم رہیں، اور عمل کریں، چنانچہ بعض دینی اور سماجی امور میں آپ کے خاص متعلقین ومنتسبین سے آپ کے خیالات میں بسا اوقات سخت سے سخت ترین اختلاف وتضاد بھی ہوجاتا تھا، بسا اوقات ان منتسبین ومتعلقین کی عام سرگرمیاں آپ کے خلاف بھی ہوجاتی تھیں، مگر ان اختلافات وتضادات کی وجہ سے حضرت کی محبت وشفقت اور قلبی تعلق میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا، سبحان اللہ راقم سطور کو اپنے ان بزرگوں پر فخر ہے، کیوں نہ ہو کہ جن کی ایسی حالت ہو، وہ اہل اللہ نہیں تو اور کیا ہوسکتے ہیں؟

حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کو توکل وتبتل کا وہ اعلیٰ مقام حاصل تھا جو بہت کم بزرگوں کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مقرر کئے ہوئے سلسلۂ اسباب وتدبیر اور قدرتی نظام کی اہمیت پر بھی عام حالات میں مولانا زور دیتے تھے، تاہم ہر حالت میں آپ کا قلب اس یقین کامل سے معمور ومطمئن رہتا تھا کہ کارساز وموثر صرف اور صرف اللہ حکیم علیم ہے، سبحان اللہ مقبولین ومقربین کے حالات ہی عجیب وغریب ہوتے ہیں، زندگی بھر آپ پر حزن ویاس، غم والم اور شکستگی کا غلبہ نہیں ہوا تھا، آپ پر کبھی جلال کے آثار نمایاں ہوتے تو کبھی جمال کے، کہیں حال کی کیفیت طاری ہوتی کبھی قال کی، مگر ہر حالت میں انا کی نفی کا غلبہ آپ پر چھایا ہوا رہتا تھا، جب آپ پر حال کا غلبہ ہوجاتا تو آواز تقریباً بیٹھ جاتی تھی، اور گلو گیر آواز میں لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے، اس کیفیت کی حالت میں کرامات بھی ظاہر ہوتی تھیں، پھر جہاں تک پتہ چلا کہ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب بڑے مقبول بندہ تھے، آپ کی دعائیں رد نہیں ہوتی تھیں، آپ کی دعا میں بڑی بھی تاثیر تھی۔

چلتے چلتے اس حوالے سے ایک واقعہ نقل کر دینا ضرور سمجھتا ہوں کہ راقم السطور کے والد بزرگوار مولانا الحاج الحافظ جمال الدین احمد صاحب مدرسہ دار العلوا احمدیہ سعد اللہ سر میں زیر تعلیم تھے، آپ نے اپنا ایک واقعہ مجھے یوں بتایا کہ:

''احمد یہ سعد اللہ سر میں دوران تعلیم مجھے ہفتہ میں ایک دو مرتبہ درد شکم کی بیماری لاحق ہو جاتی تھی، بہت ساری دوائیاں استعمال کی گئیں مگر بے سود، چنانچہ یہ بیماری تب تک شفا نہیں ہوتی جب تک حضرت مولانا عبد الجبار صاحب کا مبارک ہاتھ میرے پیٹ پر نہیں لگتے، آئے دن یہ بیماری مجھے بہت ستا رہی تھی مخصوص طور پر سردی کے موسم میں یہ بیماری بہت بڑھ جاتی تھی، اس طرح ایک رات کے آخری حصے میں مجھ پر اس بیماری کا دورہ پڑا، لگتا تھا کہ اب جان نکل جائے گی، آخر کار میں حضرت کی رہائش گاہ پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ حضرت مصلے پر کھڑے تھے، حضرت مولانا نماز سے فارغ ہونے کہ بعد میرا ہاتھ تھاما اور مجھے سیدھے میدان میں لے گیا، اور مجھے ایک مختصر دعا سکھائی اور فرمایا کہ جب تم پر اس بیماری کا حملہ ہوگا تب یہ دعا استعمال کرو، اور فرمایا کہ میں نے یہ دعا میاں جی حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھی ہے، تم یہ دعا جبھی کسی کو تلقین کروگے تو یاد رکھنا کہ ہر ذی روح سے دور جا کر تلقین کروگے، اس واقعہ کے بعد اب تک مجھے اپنے لئے اس دعا کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی، میں تو کامل شفایاب ہوا، تاہم جو بھی اس بیماری سے ستایا ہوا میرے پاس آیا الحمدللہ شفایاب ہوا، میں اللہ تعالی جل شانہ کے بعد حضرت مولانا مرحوم کا بے حد شکر گزار ہوں''۔

والد محترم حضرت مولانا مرحوم کے متعلقین میں سے تھے اور شاگردوں میں بھی، بعد میں یہ دعاء والد صاحب نے راقم الحروف کی والدہ محترمہ کو تلقین کی، بحمد اللہ والد صاحب کے بعد میری والدہ سے بھی لوگ اس حوالے سے شفایاب ہوتے ہیں، اللہ تعالی ان تمام بزرگوں کے درجات بلند کرے۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا عبد الجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر مدرسہ احمدیہ سعد اللہ سر کے حالیہ مہتمم مولانا صدیق احمد صاحب سے چاٹگام میں ایک تفصیلی انٹرویو لیا تھا، اس میں آپ

نے حضرت مرحوم کے حالات زندگی پر بہت ساری چیزیں بتائیں، چنانچہ مولانا نے اس انٹرویو کے اواخر میں فرما کہ:

''مولانا عبد الجبار صاحب ؒ جلیل القدر عالم دین اور کامل شیخ طریقت تھے، آپ کی طبیعت میں جلال بھی تھا اور جمال بھی، ہمیشہ ذکر وفکر میں مشغول رہتے تھے، آپ کے مطالعہ کی بعض کتابوں جن میں فتادی شامی قابل ذکر ہے کی حواشی جوان کے قلم سے دیکھنے میں آئیں، ان سے اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ آپ ایک جلیل القدر فقیہ تھے، علاوہ ازیں آپ اعلی پایہ کے معقولی بھی تھے اور منقولی بھی''۔

مولانا صدیق احمد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا عبد الجبار صاحب نے اسی سال کی عمر پائی اور ۱۳۸۰ھ میں انتقال فرمایا، چنانچہ مولانا صدیق احمد صاحب کی بات کی تائید میں حافظ محمد صدیق صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر ملاحظہ ہو کہ:

''اس میں کیا شک ہے کہ علامہ موصوف کا وجود با مسعود سراپا مخلوق خدا کے لئے رحمت ثابت ہوا، ہزار ہا نفوس کی زندگی میں تبدیلی آئی، آخر یہ عظیم ہستی ۱۳۸۰ھ بمطابق ۱۹۵۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملی، عرصۂ دراز گزرنے کے بعد بھی ان کا نام روز روشن کی طرح چمک رہا ہے، ان کے بعد مدرسہ احمدیہ کے اہتمام کے فرائض ان کا بھانجہ مولانا محمد ادریس قدس سرہ انجام دیتے رہے ہیں''۔(۱)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے صادر شدہ کرامات کے حوالے سے درجنوں واقعات سننے میں آئے، ویسے تو اولیاء اللہ کی کرامات پر ہم جیسے نرے کورے اتنی سی بات کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اولیاء اللہ سے صادر شدہ کرامات حق پر مبنی ہوتی ہیں، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں سے کرامات کا صادر ہونا تواتر سے ثابت ہے، جس سے انکار ممکن نہیں ہے، جیسے کہ طے زمانی، طے مکانی، طی الارضی، پانی پر پیدل چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ وغیرہ، تو حضرت مولانا موصوف

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۸۹۔

سے بھی صادر شدہ اس قسم کی کرامات کے واقعات تواتر کے ساتھ سننے میں آئے،جن سے انکار ہم جیسوں کے لئے مشکل نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

اللہ کا یہ برگزیدہ بندہ دنیا سے چلا گیا اور خاک مدرسہ احمدیہ سعد اللہ سر میں مدفون ہے،مگر آج بھی ارکان کے لوگ آپ کو ایسی یاد کرتے ہیں،جیسے کہ اب بھی آپ دنیا میں موجود ہیں۔

اولئک آبائی فجئنا بمثلھم۔

حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب چاند ماہی ارکانیؒ

مولانا عبدالجلیل صاحب موضع چاند ماہی میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پیدا ہوئے،آپ کا خاندان علماء،فضلاء اور دانشوروں کا خاندان تھا،آپ کے خاندان کے بہتوں بزرگوں نے عرصۂ دراز تک سرزمین ارکان کو علم و عمل کی روشنی سے منور کر رکھا تھا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے پاس ہوئی،اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے بنگال تشریف لے گئے اور ایک اطلاع کے مطابق آپ نے چاٹگام کے علاقے میں پائے جانے والے دینی مدارس میں چند سال تعلیم حاصل کی،اس کے بعد کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی تھی۔

فراغت کے بعد آپ نے لکھنؤ اور دہلی کا سفر کیا،وہاں کے مختلف مکاتب فکر سے محظوظ ہوئے،ساتھ ساتھ ایک شیخ کامل کی تلاش میں بھی سرگرداں رہے،چند شیوخ کے دربار میں حاضری دی لیکن قدرت نے حضرت شیخ عبدالعزیز کھلنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں آپ کا حصہ دے رکھا تھا،تو کشاں کشاں آپ وہاں پہنچے اور حضرت شیخ کے مبارک ہاتھ پر بیعت وارادت کی سنت ادا کی تھی۔

کھلنا میں چند سال آپ نے اپنے مرشد کامل کے سائے تلے گزارے،بعد میں شیخ کے حکم پر وطن پہنچے اور اپنے آبائی گاؤں میں آکر علم دین کی خدمت میں مصروف ہو گئے تھے،مگر حضرت ممدوح کا دل یہاں اس وقت تک نہ جم سکا جب تک حضرت شیخ نے آپ کو خلعت خلافت سے سرفراز نہ کیا تھا،چنانچہ آپ ہر سال حضرت شیخ کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے،اوران کے فیوض روحانی سے مستفیض ہو کر وطن پہنچتے رہے تھے،بالآخر حضرت شیخ نے آپ کو خرقۂ خلافت سے نوازا اور سرزمین ارکان میں دلجمعی کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت کی تھی۔

یوں آپ خلعت خلافت سے نوازے گئے تو وطن پہنچے،اول اول آپ نے علاقے میں پائے جانے والے بدعتی فتنوں کی سرکوبی کی،خرافات باطلہ اور رسوم واہیہ کے خلاف سخت مزاحمت شروع کی،یوں عادت کے مطابق بدعتی وہم پرست لوگ بشمول حلوائی حضرات آپ کے مخالف ہو گئے تھے،لیکن آپ

نے ان کی مخالفت کی کوئی پروہ نہ کی اور اپنی مزاحمت جاری رکھتے ہوئے اپنے پروگرام کو آگے بڑھایا، یوں ایک طویل جد وجہد کے نتیجے میں ایک طرف خرافات کا سر قلم ہوا تو دوسری طرف لوگ آپ کی شخصیت اور کمالات سے واقف ہوگئے، اس کے بعد فوج درفوج لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں جمع ہونے لگے تھے۔

آپ کے بے شمار متوسلین و متعلقین اس علاقے میں پائے جاتے تھے، خلفاء کا جہاں تک تعلق ہے، کہتے ہیں کہ آپ کے بہت سے خلفاء تھے، مگر مزید معلومات سے ہم مستفید نہیں ہوسکے۔

آپ ایک بڑے عالم دین، مرشد کامل، مسلح اور مجاہد ہستی تھے، آپ نے اپنی مستعار زندگی تعلیم و تلقین، رشد و ہدایت میں گزار دی، اور داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنے علاقہ میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب تنگ فروئی ارکانیؒ

مولانا عبدالحکیم صاحب کی ولادت انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں موضع تنگفرو میں ہوئی، آپ کا خاندان زمینداری میں مشہور تھا، آپ کے والد ایک نیک صفت زمیندار انسان تھے، پرہیزگاری و عالم دوستی میں بھی، مولانا کی ابتدائی ومتوسطہ کی تعلیم اپنے گاؤں کے بعد اکیاب میں ہوئی، بعد میں علم کی نسبت سے کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے تکمیل کی، بعد ازاں حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی کے دربار میں گئے، ان سے بیعت کی اور عرصۂ دراز تک شیخ کی خدمت میں رہ کر فیوض باطنی وزبانی حاصل کرتے رہے تھے۔

اس کے بعد شیخ کے حکم سے ارکان آئے اور علم دین کی خدمت میں لگ گئے تھے، اور ساتھ ساتھ اپنے مرشد سے بھی رشتے جوڑرے رکھے، بالآخر آپ خلعت خلافت سے نوازے گئے تھے۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین تھے، آپ نے اپنے علاقے میں بدعت وخرافات کی قلع قمع کرنے کی زبردست مہم چلائی تھی، آپ کی کوشش سے علمائے سوا پنے حلوہ روٹی کے حوالے سے بڑے پریشان ہو گئے تھے، چنانچہ بہت سے لوگ آپ کے مخالف ہوگئے تھے، مگر آپ نے ان کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی مہم میں جمے رہے تھے۔

بعد میں تدریجا لوگ آپ کے معتقد ہونے لگے اور ان کو آپ کی عالی مرتبت کا اندازہ ہونے لگا، یوں بہت سارے مخالفین بھی آپ کے مرید ہوگئے تھے، چنانچہ آپ کی آخری عمر میں مسلمانان ارکان فوج درفوج آپ کے حلقۂ ارادت میں آنے لگے تھے۔

آپ نے دعوت وارشاد کی نسبت سے ارکان کے بہت سارے علاقوں کا سفر کیا، یوں ارکان میں آپ کی شہرت بڑھ گئی تھی، اس سلسلے میں آپ منگڈو اور بوسیدنگ کے علاقے میں بھی تشریف لائے تھے، اور ہزاروں لوگوں کو اپنے نور باطن سے سرفراز کیا تھا، آپ کی شان بڑی نرالی تھی، لوگ آپ پر جان چھڑکتے تھے۔

حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب نے عرصہ تک علم وعرفان کی دنیا میں حکومت کرتے ہوئے اس جہان سے رخصت لے کر خاک وطن میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب شجاع فاروی

مولانا عبدالحمید بن بدیع الرحمن بن مولانا عظیم الدین کی ولادت با سعادت ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۱۹ء میں شجاع فارہ منگڈو میں ہوئی، آپ کے دادا کی طرح تایا مولانا عزیز الرحمن بھی جلیل القدر عالم دین تھے ،آپ کے دادا حضرت مولانا عظیم الدین کے بڑے بھائی حضرت مولانا شرف الدین بھی اس وقت علاقہ کے بہت بڑے عالم دین گزرے تھے، جنوب منگڈو کی معروف بستی شرف الدین بیل ان کے نام گرامی کی طرف منسوب ہے، انہوں نے اپنے علاقے میں وفات پائی اور قریب کی بستی ننداخالی میں مدفون ہیں۔ روایت ہے کہ مولانا شرف الدین اور مولانا عظیم الدین کے والدان دونوں کے بچپن ہی میں داغ فراغ دے گئے تھے، ان دونوں کی والدہ بھی نابیناتھی، والدہ ان دونوں بچوں کو کسب معاش میں لگانا چاہتی تھی، تا کہ گھر کے مصارف مہیا ہوسکیں، لیکن اللہ تعالی کو کچھ اور منظور تھا کہ دونوں بھاگے بھاگے مدرسہ جایا کرتے تھے، والدہ بڑی پریشان تھی کہ اب گھر کے خرچہ کے علی الرغم ان دونوں کے تعلیمی مصارف کیسے مہیا ہوں، چنانچہ ان دونوں کے مصارف اور اس گھرانہ پر اللہ تعالی کی رحمت کے حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

> ''ایک مرتبہ ایک کتا ان کی والدہ کی تہبند (تھامی) منہ میں دبا کران کو زبردستی ایک جگہ لے گیا، اور زمین کریدنے لگا، جب اس جگہ کی کھدائی کی گئی تو سونے کا ایک بڑا مٹکا نکل آیا، جس سے غیبی طور پر ان دونوں بھائیوں کو معاش کی طرف سے بے فکری دلا دی گئی، اور وہ پوری یک سوئی کے ساتھ حصول علم سے فارغ ہوئے، چنانچہ بعد میں یہ دونوں بہت بڑے صاحبان کشف وکرامات عالم باعمل اور ممتاز بزرگ ثابت ہوئے''۔(۱)

مولانا عبدالحمید صاب کے نانا اور آپ کے ابتدائی استاد حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب ایک جلیل

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۷۷۔

القدر عالم باعمل تھے، صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، موضع کلیہ بانگہ/ کلیچہ بانگہ کی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے، مولانا عبدالحمید ابھی شیر خوار بچہ ہی تھے کہ ایک روز آپ کے جلیل القدر عالم دین دادا حضرت مولانا عظیم الدین صاحب اپنے صاحبزادے بدیع الرحمن کے گھر تشریف لائے، اور اپنے نواسے عبدالحمید کو اپنے ہاتھ سے ایک قلم دیا اور وہ قلم عبدالحمید نے لپک کر لیا تو دادا نے فرمایا کہ ''امید ہے کہ یہ بچہ ایک دن جلیل القدر عالم دین اور مفتی بنے گا، اسے دینی تعلیم میں لگاؤ، اور عزیز الرحمن یعنی مولانا کے تایا کا حوالہ کردو''یوں وصیت کے مطابق بدیع الرحمن نے اپنے ہونہار صاحبزادے کو مولانا عزیز الرحمن کا حوالہ کر دیا، ویسے یہ شیر خوار بچہ اپنے تایا کے گھر منتقل ہوا، اور ابتدائی تعلیم ان کے ہاتھ میں پائی تھی۔

مولانا عبدالحمید صاحب کی ابتدائی تعلیم مولانا عزیز الرحمن کے ہاتھ میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو برگیا بیل کے مدرسہ میں داخل ہوئے، دراں حالیکہ حضرت مولانا سید عظیم/ سید عظیم سنبھوی فاضل مدرسہ امینیہ دہلی اس مدرسہ میں درس دے رہے تھے، مولانا عبدالحمید نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا، چند دن اس ادارہ میں پڑھنے کے بعد حضرت سنبھوی کے مشورے سے ۱۹۳۶ء میں آپ نے ہندوستان کا سفر کیا اور سیدھے جا کے مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی بلند شہر یوپی میں داخل ہوگئے، یہاں ایک سال پڑھے، اور درجہ سوم (ثالثہ) کا امتحان پاس کر کے دوسرے سال ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، مسلسل چھ سال دارالعلوم میں پڑھتے رہے، یہاں کے کبار علماء سے استفادہ اور فیض حاصل کرتے رہے، دراں حالیکہ یہاں حضرت مولانا سید حسین مدنی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی آفتاب بنے دنیائے علم ومعرفت کی ضیاپاشی کر رہے تھے۔

مولانا عبدالحمید دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۲ء میں فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد ایک سال اور دورۂ تفسیر میں پڑھے تھے، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کی روایت کے مطابق مولانا کے طالب علمی کا زمانہ بڑی پریشانی، نہایت تنگ دستی اور درماندگی سے گزرا، ایک وقت کا شکم سیر ہونا بھی بہت بڑی بات تھی، پھر بھی مطالعہ میں اس قدر مستغرق ہوتے تھے کہ دنیا کی خبر ہی نہیں رہتی تھی، ویسے گہرے مطالعہ کے دوران ایک مرتبہ دارالعلوم کی بالائی منزل سے نیچے گر پڑے تھے، جس سے سر پر سخت

چوٹ لگی تھی، جس کے نتیجے میں مولانا کے سر کے بال تک اتر گئے تھے، اس طرح اور ایک آزمائش کی بات بھی حافظ مولانا محمد صدیق صاحب نے روایت کی ہے کہ:

''۱۹۷۰ء کے بعد مولانا شجاع فارہ میں رہائش پذیر تھے کہ اچانک حضرت کا ایک سالہ بیٹا جمیل احمد کی خودکشی کا سانحہ پیش آ گیا، چونکہ اس نوعیت کا یہاں یہ پہلا واقعہ تھا، اس لئے دور دور تک یہ خبر پھیل گئی تھی، لاش کمرے میں پڑی ہے اور صبح کفن دفن دینا ہے، اس حالت میں مولانا بس مطالعہ میں بیٹھ گئے، اور مطالعہ ہی میں رات گزار دی، اور صبح فرمایا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا''۔(۱)

مولانا عبدالحمید صاحب دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد وطن آنے کے لئے بنگال/بنگلہ دیش پہنچے تھے، یہاں سے اپنے تایا اور استاد حضرت مولانا عزیز الرحمن کو ایک خط لکھا، جس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ باتیں بھی درج تھیں کہ یہاں امن وآمان گویا عنقاء ہے، ہر کجا قتل وغارت گری کا دور دورہ ہے، یہ خط مولانا عزیز الرحمن کے ہاں پہنچنے سے قبل بنگال کے انگریز حکام کے ہاتھ لگ گیا تھا، چوں کہ اس خط کے مضمون سے حکومت وقت کے عدل وانصاف پر حرف آ رہا تھا، اس لئے حکومت نے مولانا کو گرفتار کر کے برما کے بجائے ہندوستان کی طرف دھکیل دیا، یوں مولانا دوبارہ دارالعلوم دیوبند پہنچ کے مزید دو سالوں تک دارالعلوم میں گزار دیئے تھے۔

مولانا ۱۹۴۴ء میں ارکان تشریف لائے، اور محترمہ رابعہ بنت مستری نور احمد سے شادی کی، جن کے بطن سے فرقان احمد، حسین احمد، جمیل احمد، فیروز احمد اور رفیق احمد یعنی پانچ لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

۱۹۸۴ء کی بات تھی کہ حضرت مولانا نے برما کا سفر کیا، وہیں جامعہ عربیہ کیک مارمون اسٹیٹ میں بحیثیت شیخ الحدیث مقرر ہوئے، یہاں آپ نے بقیہ عمر گزار دی، یہاں ایک شادی بھی کی تھی، جس کے بطن سے حفصہ اور محمد سلیم پیدا ہوئے، محمد سلیم بعد میں ایک عالم بنے، جس نے ۱۹۹۵ء میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت حاصل کی۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۸۱۔

محمد حسین میانجی نامی ایک بندۂ خدا نے شجاع فارہ کے مشرق میں واقع دولیہ فارہ میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی، وہاں بعد میں حضرت مولانا عبدالحمید صاحب درس دینا شروع کر دیا تھا، اور ۱۹۷۰ء کے بعد آپ اس درسگاہ ''مدرسہ امدادالاسلام'' کے مہتمم بنے، مدرسہ کی باگ ڈور ہاتھ آتے ہی آپ نے موقوف علیہ تک کے درجات کا اعلان کر دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں اس زمانے کے چند چیدہ علمائے عظام جمع ہو گئے تھے، طلبہ سے مدرسہ پر ہو گیا، بہت ہی قلیل مدت میں یہ مدرسہ آپ کی ادارت میں ایک خاصہ جامعہ بن گیا تھا، بعد میں یہاں مولانا عبدالحکیم کواربیلی، مولانا ابوالحسین عرب شاہ فاروی، مولانا عبدالعزیز شاعرہ فاروی، مولانا محمد امین چالی فرانگی، مولانا محمد منور رامیور بیلی، مولانا عبداللطیف شاعرہ فاروی، مولانا سیف اللہ بن عبدالجبار گدوسراوی اور حافظ نور محمد سنبنوی جیسے کبار علماء اور آفتاب علم وعرفان نے ضیا پاشی کی تھی۔

مولانا عبدالحمید صاحب کے کارناموں اور ملی وقومی خدمات کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''یوں تو مولانا ہر فن میں مولی کے مصداق تھے، لیکن ادب، فتاوی نویسی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے درس وتدریس مولانا کا خصوصی مشغلہ تھا، مولانا نے چار سو صفحات پر مشتمل متنبی (دیوان متنبی) کی شرح لکھی، جس میں ہر شعر کا بامحاورہ ترجمہ، تشریح، صرفی ونحوی تحقیق، شان ورود، ترکیب نحوی، استعارات اور تشبیہات کی وضادت، صلات افعال کا بیان وغیرہ مفصلا موجود تھا، جس سے راقم الحروف نے بہت فائدہ اٹھایا، افسوس وہ شرح اب تک طبع نہ ہو سکی، احادیث کی تطبیق، عمدہ تشریح اور نکات ورموز واسرار کی معرفت کے سلسلے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثال آپ تھے، اس لئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ محدث صاحب کے محبوب لقب سے مشہور ہو گئے، گویا محدث صاحب کا لقب مولانا کا جزء اسم بن گیا، مولانا کو فقہ، اصول فقہ اور افتاء میں بے انتہا مہارت تھی، اس لئے ارکان برما کے علماء جس فتوی سے عاجز آتے تھے مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، مولانا ہی وہ

فتوی لکھتے تھے، پھر وہ فتوی حرف آخر ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ منگڈ وٹاؤن کے جملہ مفتیان کرام نے مولانا کو صدر المفتیین کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا تھا''۔(۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا ایک جلیل القدر عالم دین تھے، اور آپ کی خدمات بھی بڑی وسیع ہیں، لیکن مولانا کی پوری زندگی میں ایک بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی کہ مولانا اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنے ادارہ کی ادارت اور علاقے کی اس عظیم المرتبت مشیخیت کو تھوک کر وطن مقدس سے برما کیوں چلے گئے تھے، اس بارے میں مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے ایک ایسی وجہ بتائی کہ جس سے شک وشبہات میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ عین عروج کے دوران شجاع فارہ کی فضا حضرت مولانا صاحب کے لئے مکدر ہوگئی، چنانچہ ۱۹۸۴ء کو مدرسہ چھوڑ کر حضرت محدث صاحب مولمین چلے گئے اور وہیں جامعہ عربیہ یونیورسیٹی کیک مارمون اسٹیٹ برما میں بحیثیت شیخ الحدیث بقیہ عمر پوری کی، نہ جانے اچانک اس طرح آپ کا دل اداس کیوں ہوگیا تھا، آیا یہ کوئی خانگی زندگی کی منافرت وکشمکش کا نتیجہ تھا یا اور کوئی وجہ تھی کہ آپ مجبور ہوگئے تھے؟ خیر جو کچھ بھی ہو کہ ارکان کے اس عظیم المرتبت شیخ نے ۴/ اکتوبر/ ۱۹۹۷ء میں رنگون کے ہسپتال میں اپنی جان جان آفرین کو حوالہ کردیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۸۱۔۸۲۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب ارکانی

شیخ طریقت وفقیہ عالم دین حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کی پیدائش اکیاب کے علاقے میں ہوئی، آپ کا خاندان ایک تاجر خاندان تھا، شنید ہے کہ آپ کے والد ایک بڑے تاجر ہونے کے علاوہ ایک معروف سخی اور پرہیزگار انسان تھے، اور والدہ بھی ایک نیک اور عابدہ خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم ارکان کے مختلف مدارس اسلامیہ میں ہوئی، اس کے بعد اعلی تعلیم کے لئے بنگال گئے اور چاٹگام کے ایک مدرسہ میں داخل ہوکے دوسال تعلیم حاصل کی، بعد ازاں آپ کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ سے تعلیم کی تکمیل کی تھی۔

کہتے ہیں کہ فراغت تعلیم کے بعد آپ کا رجحان سلوک وطریقت کی طرف بڑھا، اس حوالے سے آپ نے مغربی ومشرقی بنگال کے مختلف شیوخ کے دربار میں حاضری دی، لیکن کسی ایک شیخ سے بھی آپ مطمئن نہیں ہوپائے، آخر کار آپ کھلنا پہنچے اور وہاں اس زمانے کے معروف شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی سے مطمئن ہوکے ان کے ہاتھ میں بیعت کی، مولانا شیخ کی خدمت میں ایک طویل عرصہ گزارے، اور خلافت واجازت سے سرفراز ہوکے وطن واپس لوٹے تھے، اس حوالے سے بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مولانا عبدالرحمن صاحب کلکتہ کے دوران تعلیم حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی کے دربار میں ایک سے زیادہ مرتبہ پہنچے تھے، اور اسی دوران ہی بیعت کی سنت ادا کی تھی۔

مولانا عبدالرحمن صاحب ایک جلیل القدر عالم دین تھے، فقہ وفتاوی میں ید طولی رکھتے تھے، وطن واپس آنے کے بعد علاقے کے مختلف مدارس اسلامیہ میں عرصۂ دراز تک درس وتدریس میں مصروف عمل رہے، لیکن بعد میں آپ نے تزکیہ واحسان کا سلسلہ جاری کیا، چنانچہ اس حوالے سے آپ نے بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

مولانا عبدالرحمن صاحب ایک شیخ طریقت ہونے کے علاوہ علم وثقافت سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے، اس حوالے سے بھی آپ نے بہت سے کام سرانجام دیئے تھے، مولانا اپنے زمانے کے ایک مشہور شیخ طریقت ہونے کی وجہ سے آپ کے بے شمار مریدان اور خلفائے کرام سرزمین ارکان کے

چپے چپے میں تھے،آپ کے ایک سے زیادہ مریدان کو راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، راقم کا بچپن تھا، تاہم آپ کے مریدوں کے طرز عمل سے جہاں تک اندازہ ہوا کہ مولانا عبدالرحمن صاحب سنت نبویؐ کے نہایت پابند بزرگ تھے،آپ نے دعوت وارشاد کے سلسلے میں چند مرتبہ منگڈو اور بوسیدنگ کا سفر بھی کیا،آخر کار آپ نے بے شمار بندگان خدا کی دینی وروحانی رہنمائی کرتے ہوئے ارکان میں انتقال کیا اور اپنے علاقے میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا عبدالستار صاحب رنگابالوی منگڈوی

سرزمین ارکان کے عجوبہ روزگار عالم دین حضرت مولانا عبدالستار صاحب شمالی منگڈو کی بستی رانگابالی میں پیدا ہوئے، شنید ہے کہ آپ کے والد ایک غریب کاشتکار آدمی ہونے کے ساتھ نہایت خدترس اور علماء پسند تھے، اور والدہ بھی بڑی سیدھی سادھی اور بھولی بھالی خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے فرقانیہ اور علاقے کے مدرسے میں ہوئی، کچھ پڑے ہوئے تو علم دین کی پیاس لئے ہندوستان کا رخ کیا اور سیدھے جا کر اس وقت کی معروف درسگاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے، فیاض ازل نے آپ کو بہترین ذہانت عطا کی، یوں بہت جلد اساتذۂ کرام کی جان وجگر بن گئے تھے، آپ بڑے محنتی طالب علم تھے، آپ نے اپنی محنت ولگن سے کام لیتے ہوئے تعلیم کو بہت آگے بڑھایا تھا، ہر سال آپ اپنی جماعت میں نمبر اول ہوا کرتے تھے، اور مدرسہ میں تفوق کلی بھی حاصل کرتے رہے تھے، بالآخر ممتاز المحدثین کے امتحان میں آپ نے پورے برصغیر کے تمام مدارس اسلامیہ عالیہ میں تفوق کل کا درجہ حاصل کرلیا تو اس وقت کے برصغیر کے روزنامے اور دیگر ذرائع ابلاغ میں آپ کی اس کامیابی پر مبارک باد کا ایک دھوم مچ گیا تھا۔اسی زمانے میں اتفاق سے شمالی منگڈو کی بستی نائن چنگ کا ایک صاحب ثروت آدمی حج پر گیا ہوا تھا، واپسی پر بمبئی میں کیا دیکھا کہ بنگال کے ایک طالب علم نے پورے برصغیر کے مدارس اسلامیہ عالیہ پر تفوق کلی کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اب اس مال دار پر اس طالب علم کی دیدار کا شوق دامن گیر ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ طالب علم چاٹگام کے کسی علاقہ کا ہے، اب وہ آدمی چاٹگام پہنچا تو دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ ارکانی طالب علم ہے اور بستی رنگابالی کا رہنے والا ہے، اب ان کو تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی کہ ایک ارکانی طالب علم نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کرلی ہے۔

اب وہ آدمی وطن پہنچنے کے چند دن کے بعد کچھ تخالف وغیرہ لئے بعض احباب سمیت رنگا بالی پہنچا، لوگوں سے مولانا عبدالستار کے متعلق دریافت کی تو کوئی بھی مولانا عبدالستار کو جانتا نہیں تھا، اب اس آدمی کو بہت تعجب ہوا کہ اتنے بڑے عالم دین یہاں پہنچے تو اسے جاننے والا تک کوئی نہیں ہے، بعد

میں بڑی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ بستی کے آخری سرا میں ایک بڑھیا رہتی ہے، شنید ہے کہ اس کا ایک لڑکا ہندوستان سے پڑھائی ختم کر کے حال ہی میں یہاں پہنچا ہوا ہے، اب اس آدمی نے لوگوں کو ڈانٹا اور بتایا کہ تم جانتے ہو وہ کون ہے؟ تفصیلات بتانے پر لوگ دوڑے، اور ملاقاتیوں کا ہجوم ہوا، مولانا کو گھر سے باہر نکالا گیا، اس کے بعد آپ کی شہرت ہوئی، اس سے پہلے اتنے دنوں تک آپ گمنامی کے عالم میں گھر ہی میں پڑے ہوئے تھے۔

آخرکار اس مال دار آدمی نے اپنی لاڈلی بیٹی کو مولانا عبدالستار صاحب کے نکاح میں دیا، مگر قدرت کی عجیب کرشمہ سازی تھی کہ چند سال جاتے نہ جاتے مولانا عبدالستار کا دماغی توازن بگڑ گیا، بعض لوگ اس حوالے سے کہتے ہیں کہ مولانا پر جذب و مستی کا حال طاری ہو گیا تھا، چنانچہ مرحوم ظہیر الدین بی اے علیگ نے اپنی ذاتی ڈائری میں حضرت مولانا عبدالستار صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''آج مولانا عبدالستار یہاں تشریف لائے اور چائے پی کر چلے گئے ہیں، آپ کچھ مجذوب قسم کے ہو گئے ہیں، شاید میری طرح گھرانہ تعلقات سے برگشتہ خاطر ہیں، اس لئے مسافری کے دن گزار رہے ہیں''۔(۱)

راقم الحروف کو حضرت مرحوم شیخ جمال حسین صاحب مائن چنگی نے بتایا تھا کہ:

''مولانا عبدالستار صاحب کا خسر میرے رشتے داروں میں سے تھے، مولانا کے علاوہ ان کے اور ایک داماد تھے، جو مولانا عبدالستار کے ہم پایہ تو نہیں تھے، لیکن وہ بھی ایک جلیل القدر عالم دین تھے، مولانا عبدالستار کا دماغی توازن بگڑ گیا تو آپ کے خسر نے موخر الذکر داماد کے ذریعہ مولانا تک یہ بات پہنچائی تھی کہ آپ جا کے مولانا عبدالستار کو بتائیں کہ وہ ہندوستان جا کے اپنے تمام اساتذہ سے ملاقات کر

---

(۱) مرحوم ظہیر الدین بی اے علیگ کی یہ ڈائری قسمت سے میری ذاتی لائبریری کی زینت بنی ہے، ۱۹۹۶ء میں مرحوم کے خاندان کے ایک آدمی نے یہ ڈائری میرے حوالہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ڈائری میرے کام کی نہیں ہے، ہوسکتا ہے اس میں آپ کو بہت ساری مفید چیزیں نظر آئیں گی، جو قوم کے لئے مفید ہوسکتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف کو اس ڈائری سے بہت سی چیزیں ملیں، مرحوم کے ذاتی حالات کے علی الرغم ۱۹۴۳ء اور اس کے بعد کے حالات قومی پر اس ڈائری کی وجہ سے کافی روشنی ملی ہے۔

آئیں، یاد رہے کہ خسر صاحب نے بالا بالا سن رکھا تھا کہ مولانا نے کسی استاد کی نافرمانی کی تھی، چنانچہ استاد کی بددعا کا سایہ مولانا پر پڑا تو مولانا کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے، خسر صاحب کی امید تھی کہ مولانا دوبارہ جا کر اپنے اساتذہ سے ملاقات کریں گے تو آپ کی حالت دیکھ کر ان کو رحم آئے گا، دعائیں دیں گے ویسے مولانا کی حالت صحیح ہو جائے گی، بہر حال داماد نے مولانا تک خسر کا پیغام پہنچایا تو مولانا نے جھٹ سے بتایا کہ ''ارے او تم جا کے میرے خسر صاحب کو بتا دو کہ عبدالستار کو ہندوستان جانے کی ضرورت نہیں ہے، سارا ہندوستان اس کے سینے میں محفوظ ہے''۔

حضرت مولانا سید الامین صاحب نے راقم سطور کے پوچھنے پر حضرت مولانا عبدالستار صاحب کے متعلق بہت ہی بلند الفاظ میں سراہتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''سرزمین ارکان کے دور آخر میں حضرت مولانا عبدالستار صاحب ایک جلیل القدر عالم دین تھے، میں نے آپ کو بارہا دیکھا، آپ سے طول طویل گفتگو بھی کی تھی، نہایت باریک بین اور غضب کے ذہین تھے، ساتھ ہی ساتھ علم کے حوالے سے حاضر جواب بھی، اگر چہ آپ کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا، لیکن اس کی وجہ سے علم اور اس کی گہرائی کے حوالے سے کوئی کمی نہیں آئی تھی، مولانا کی ذہانت کے ساتھ حافظہ بھی کافی قوی تھا، اللہ تعالی آپ کا درجہ بلند فرمائے، بھری جوانی کے عالم میں آپ نے اس جہان فانی سے رخصت لی''۔

علاوہ ازیں میں نے ارکان کے چند جید علماء کرام سے سنا کہ مولا عبدالستار غضب کے ذہین تھے مگر قدرت کو اور منظور تھا کہ اس جذب و مستی کی حالت میں آپ چند سال ادھر ادھر گھوم پھر کر یہ جواں سال عالم دین بھری جوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت لے چلے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب مرنگلوی

مولانا عبدالسلام بن مولانا یار محمد صاحب جنوبی منگڈو کی معروف بستی مرنگلوا میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مولانا یار محمد صاحب بڑے مہمان نواز اور مدبر عالم دین تھے، جو حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی کے تلامذہ میں سے تھے، مولانا کی بڑی بڑی دینی خدمات تھیں، جن میں تاسیس مدارس ومساجد کے علاوہ علاقۂ کیوکتو کے مشہور ومعروف ہائی اسکول کی بنیاد بھی آپ کے مبارک ہاتھوں سے پڑی، جہاں سے بے شمار طلباء نے علم کی پیاس بجھائی تھی۔

مولانا عبدالسلام صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں پا کر اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور دارالعلوم دیوبند میں عرصۂ دراز تک پڑھتے رہے، بقایا علوم کی تکمیل دارالعلوم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات میں کی، البتہ آپ نے دورۂ حدیث کا درجہ دومرتبہ پڑھا، آخری بار دہلی کے مدرسہ عالیہ میں پڑھ کر سند حاصل کی تھی۔

گجرات میں پڑھائی کے دوران آپ نے اسلامی سیاست سے دلچسپی لی، اس دوران تحریک آزادی میں بھر پور حصہ لیا، جس کے نتیجے میں دہلی کے لال قلعہ میں ایک ماہ مقید رہے، چنانچہ اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

> ''مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد محترم مولانا عزیز گل کے ساتھ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا، مولانا کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور جمعیت علماء ہند سے والہانہ عقیدت تھی، ایک مرتبہ تحریک آزادی کے سلسلے میں دلی میں تقریر کی تھی، جس کی وجہ سے جیل جانا پڑا، ایک ماہ لال قلعہ دہلی جیل میں مقید رہے''۔(۱)

بالآخر جب پاکستان وجود میں آ گیا تو آپ نے اس نوزائدہ اسلامی ملک کی حفاظت کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا، جب پہلی دفعہ مغربی پاکستان میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۴۶۔

سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے، آپ اسی تاریخی موقع پر وہاں موجود تھے، حضرت نے کافی عرصہ تک مشرقی پاکستان میں دعوت وتبلیغ کے فرائض انجام دیئے اور صدر ایوب خان کے ابتدائی دور میں آپ پھر مغربی پاکستان چلے گئے، گوادر بلوچستان میں ایک مدت تک قیام کیا، بعد میں مستقل طور پر کراچی میں رہائش اختیار کی، آخری ایام عبادت الٰہی میں گزارنے کا شوق دامنگیر ہوا تو مکہ معظّمہ چلے گئے، جہاں آپ کے تین بیٹے پہلے سے موجود تھے۔

مولانا مرحوم بانیٔ پاکستان جناب محمد علی جناح مرحوم کے دوست اور تحریک پاکستان کے ممتاز قائد مولانا ظفر احمد عثمانی کے خاص دوستوں میں سے تھے، جنہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی طرح مشرقی پاکستان میں پہلی دفعہ سرکاری طور پر سبز ہلالی پرچم لہرایا تھا، مولانا ظفر احمد عثمانی کا انتقال ہوا تو مولانا عبدالسلام نے ان کا اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور انہیں قبر میں اتارا تھا، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق لکھتے ہیں کہ:

> ''چونکہ پاکستان بنانے والوں میں سرفہرست علمائے کرام تھے، اس لئے مغربی پاکستان کا جھنڈا علامہ شبیر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لہرایا، جبکہ مشرقی پاکستان کا جھنڈا علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لہرایا، اس پرچم کشائی میں مولانا عبدالسلام بھی شریک تھے، بلکہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نعش کو غسل دینے والوں میں مولانا ممدوح بھی شامل تھے اور انہوں نے علامہ کو قبر میں اتارا''۔(۱)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اہم اساتذۂ کرام کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۳) حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) حضرت مولانا عزیز گل رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۴۶۔

(۶) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۷) حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۸) حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۹) حضرت مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱۰) حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ۔

اللہ تعالی نے مولانا عبد السلام صاحب کو بہت ساری صفات عالیہ سے نوازا، امانت، دیانت اور سخاوت کے علاوہ ایک عالم دین کی تقریباً تمام صفات آپ کی شخصیت میں پیوستہ تھیں، آپ نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کے علاوہ برصغیر کے مسلم اقلیتی علاقوں میں قائدانہ کردار ادا کیا، ۱۹۴۲ء میں جب ارکان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی، عفت مآب مسلم خواتین کی عزت وناموس کو پامال کیا جارہا تھا، جس کے نتیجے میں تین لاکھ سے زائد ارکانی مسلمان متحدہ ہند کے صوبۂ چاٹگام میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے، پھر پاکستان بننے کے بعد ان کی بڑی تعداد کراچی میں آباد ہوئی (جو آج کل برمی نژاد پاکستانی کے نام سے پہنچانے جاتے ہیں) تب ظلم وبربریت کی اطلاع ملتے ہیں مولانا ہندوستان سے ارکان تشریف لائے، یہاں آپ نے مسلمانوں کو منظم کیا اور مسلح جدو جہد شروع کردی، جس کے نتیجے میں اس علاقے میں مسلمان غالب آگئے، اور مگھوں برمیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

مولانا نے تاریخ ارکان کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی ہے، جو آج تک منظر عام پر نہ آسکی، آپ نے اس کتاب میں تاریخ کے حوالے سے بیانات کے علاوہ اپنے چشم دید واقعات درج کئے ہیں۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے اس مسودے کو بہت ہی سراہا، جو حاضر خدمت ہے:

''کراچی اور سعودی عرب میں بھی انہوں نے فلاح وبہبود کے بہت سے کام کئے، جن کی گنتی اور تذکرے کے لئے ایک دفتر چاہئے، البتہ ایک کارنامہ ایسا ہے کہ اگر مولانا کے اور کوئی کارنامے نہ ہوتے تو بھی یہی کارنامہ نجات کے لئے کافی تھا، وہ یہ ہے کہ مولانا نے تاریخ ارکان پر ایک بہت ہی عمدہ اور پرمغز کتاب لکھی ہے

ـــــ جو چھوٹی تقطیع کے ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بہت سے اہم واقعات، نایاب دستاویزات اور قابل قدر مضامین موجود ہیں، اور بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہے، سینکڑوں عنوانات کے تحت ہزاروں متفرق اہم مباحث ہیں، کتاب شروع کرکے ختم کرنے سے قبل چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، قتال مگھ ومسلم پر مفصلاً بحث ہے''۔(۱)

مولانا کے چند اہم کارنامے درج ذیل ہیں:

(۱) ۱۹۵۲ء میں مولانا نے اپنے علاقہ مرنگلوا میں ایک مدرسہ بنام ''دارالعلوم مرنگلوا'' کی بنیاد اور تعمیر میں مولانا اشرف الزمان صاحب کا خوب تعاون کیا تھا، یوں اس مدرسہ کے بانیین میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی شمار ہوتے ہیں۔

(۲) شقدار فارہ منگڈو کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ عالیہ شقدار فارہ کی بنیاد میں بھی مولانا کا حصہ ہے، اس مدرسہ کا اصل موسس محدث العصر حضرت مولانا سعید عظیم صاحب سنبوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس مدرسہ کی تعمیر وتاسیس میں مولانا عبد السلام صاحب نے موسس مذکور کا بہت تعاون کیا تھا۔

(۳) ضلع مظفرنگر (بھارت) کی جامع مسجد اور مدرسہ عثمانیہ آپ کی بناء کردہ زندہ جاوید دینی کارنامہ اور خدمت ہے۔

(۴) کراچی کی مشہور مسجد منورہ بھی مولانا عبد السلام صاحب کا قائم کردہ ہے۔

مولانا کی وفات حسرت آیات کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا کا انتقال ۱۶/ جمادی الثانی/ ۱۴۱۶ھ۔ بمطابق ۷/ نومبر/ ۱۹۹۵ء کو مکہ المکرمہ میں ہوا، جنت المعلی میں مدفون ہیں، امام حرم شریف شیخ شریم نے نماز جنازہ پڑھائی، مولانا کی تین بیویاں تھیں، اٹھارہ بچے تھے، جن میں فی الحال دو بیٹیاں اور پانچ صاحب زادے بقید حیات ہیں، صاحب زادے یہ ہیں: مولانا نعیم اللہ،

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۴۷۔

> مشیت اللہ، کفایت اللہ، امان اللہ اور ریاض اللہ۔ مولانا نعیم اللہ صاحب حضرت کے جانشین صادق ہیں، ۱۹۶۴ء کی ولادت ہے، ۱۴۰۳ھ میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاون سے فراغت حاصل کی، ۱۹۹۰ء میں ریاض یونیورسٹی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ سے صحافت میں ڈگری لی، ۱۹۸۰ء میں جہاد کے سلسلے میں افغانستان گئے، ارکانی طلبہ میں یہ پہلے نوجوان تھے جنہوں نے روس کے خلاف جہاد افغان میں حصہ لیا، انہوں نے رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین میں بھی قومی خدمات سرانجام دیں، فی الحال (۱۴۱۹ھ بمطابق ۱۹۹۸ء طائف کے محکمۂ کبری کے مترجم ہیں، یہی وہ خوش قسمت شخص ہیں، جنہوں نے ۱۹۸۸ء میں ماسٹر نور الاسلام صاحب کی قیادت میں اندرون ارکان کئے جانے والے حملے میں شرکت کی''۔(۱)

مولانا عبدالسلام صاحب کی وفات حسرت آیات پر بہتوں نے تعزیتی پیغامات بھیجے، جمعیت علمائے اسلام مکہ برانچ کے امیر قاری محب اللہ ارکانی، سماجی کارکن جناب امان اللہ قربان الصائغ ارکانی، سابق طالب علم رہنما مولانا کبیر احمد ارشد نے حضرت کی وفات کو امت مسلمہ کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا، اس طرح پاکستانی سینیٹر حافظ حسین احمد صاحب نے کہا کہ مولانا تحریک آزادی کے ان متعدد علماء میں سے ہیں، جنہوں نے ہمیں اسلام کی یاد دلائی، اسی طرح حضرت مولانا فضل الرحمن (امیر جی یو آئی وچیرمن اسٹینڈنگ کمیٹی برائے امور خارجہ بعد میں قائد حزب اختلاف پاکستان) نے مولانا کے انتقال پر تعزیتی پیغام پہنچایا تھا۔

مولانا نے اپنی اولاد اور تمام مسلمانوں کو اپنی وصیت میں اللہ تعالی سے ڈرنے، حقوق العباد اور اپنی زندگی میں حرام وحلال کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی تھی، آپ پاکستان کے پریشان کن حالات سے ہمیشہ نالاں رہا کرتے تھے، آپ نے فرمایا کہ پاکستان میں بدامنی، خلفشار اور قتل وغارت گری دراصل عذاب الہی کی مختلف شکلیں ہیں، جو مسلمانوں کی بداعمالی کی شکل میں ہیں، لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۴۸۔

پاکستان کے موجودہ حکام تک ان کا پیغام پہنچا دیں، انہیں بتائیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے، اور یہ نظریہ آپ کے کاندھوں پر اللہ کی بڑی امانت ہے، اس نظریہ کی خاطر ہم نے اپنی آنکھوں سے لاکھوں جانوں اور عصمتوں کو قربان ہوتے ہوئے دیکھا تھا، ان قربانیوں سے روگردانی یقینا عذاب الہی کو دعوت دے گی، یاد رہے کہ نظام امن وعدل سے یقینا امن وعدل قائم ہوگا، اور نظام کفر سے بدامنی پیدا ہوگی، ایک موقع پر مولانا سے استفسار پر کہ آپ نے اپنی زندگی میں ایک عظیم تاریخی کردار رکھنے کہ باوجود گمنامی کی زندگی کیوں بسر کی؟ تو جواب میں فرمایا کہ:

> ''ہم نے جو کچھ بھی کیا اللہ تعالی کی رضا کے لئے کیا تھا، نمود ونمائش اور منصب کے لئے نہیں، ہم اللہ تعالٰی سے ان کے اچھے نتائج کی امید رکھتے ہیں''۔

شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبدالسّلام صاحب ارکانیؒ

ولادت باسعادت :

سرزمین ارکان کے مایۂ ناز فرزند اور گوہر یک دانہ حضرت العلام مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی کی ولادت باسعادت جنوبی بوسیدنگ کی معروف بستی علی چنگ میں ہوئی، تاریخ ولادت کے حوالے سے مختلف اقوال ملتے ہیں، جن میں قرین قیاس روایت ہے کہ آپ کا سن ولادت ۱۸۸۶ء ہے، یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ حضرت کو بعض جاننے والے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کی جائے پیدائش گودام فارہ یعنی جنوبی بوسیدنگ والے گودام فارہ ہے، لیکن بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ آپ کی جائے پیدائش علی چنگ ہے۔

خاندانی پس منظر :

حضرت العلام مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب کی بستی شابک فارہ میں تھا، شابک فارہ والی بستی اکیاب کی معروف بستی نئی چاکیہ فارہ سے قریب ہے، حضرت العلام کا دادا جناب مرحوم عبدالعلی رحمہ اللہ تعالی اس وقت کے بعض ناگزیر حالات کے پیش نظر اپنی اولاد واہل عیال سمیت بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز بستی علی چنگ آ گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت کا دادا جناب مرحوم عبدالعلی صاحب نہایت پاک باز اور دین دار اور علماء پسند انسان تھے، سخاوت وخلق نوازی کے حوالے سے یکتائے روزگار تھے، اور جہاں بھی جاتے یا رہتے بستے مساجد اور دینی مدرسوں کی تعمیر کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، انہوں نے اپنی اولاد کو دین سے لو لگائے رہنے کی تلقین کی تھی۔

حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالسلام ارکانی کے مختصر خاندانی شجرۃ:

عبدالعلی

شاہ صوفی احمد علیؒ ۔ جبار علی ۔ حکیم علی ۔ اکبر علی ۔ تین بہنیں

حضرت شاہ صوفی علی احمد صاحب کے پانچ فرزند نرینہ تھے:

(۱) شاہ عبدالسلام ارکانیؒ ۔

(۲) ٹھنڈا میاں۔

(۳) ابوالخیر رواسوگری۔

(۴) لال محمد (غنیّۃ باپ)۔

(۵) عبدالکریم رواسوگری۔

حضرت العلامۃ مولانا شاہ صوفی عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اس علاقے کے معزز ترین خاندانوں میں سے ایک ہے، کسی تذکرہ نگار کے کسی بھی تذکرے سے اس خاندان کے علاوہ یہاں کے دیگر خاندانوں کے حالات تو معلوم نہیں ہوسکے، جتنی باتیں اس خاندان کے حوالے سے یہاں درج ہیں ان میں سے کچھ تو اپنی عینی مشاہدے اور کچھ اس خاندان کے علاوہ اس علاقے کے بعض بزرگوں سے سنی ہوئی روایات پر مبنی ہیں، جن سے پتہ چلا کہ پانچ کری سوداگر والا یہ خاندان یک گونہ علم وعمل کے رکھوالے ہونے کے علاوہ سخاوت وفیاضی کے اعتبار سے مشہور رہا ہے، جب کہ شرافت ونجابت کے حوالے سے کافی شہرت کا حامل ہے، جو راقم سطور کا عینی مشاہدہ بھی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خاندان ایک زمیندار خاندان ہے، جو عرصۂ دراز سے اس پورے علاقے کا حکمران بھی رہا ہے، دریائے مایو کے ایک شاخ کے مغربی ومشرقی کناروں پر مشتمل ایک بہت بڑا اور طویل وعریض رقبہ اس خاندان کی ملکیت میں تھا، اس خاندان کے بہتوں سے راقم سطور کا ذاتی تعلق تھا اور ہے، جن میں حضرت العلام کا حقیقی پوتا جناب مولوی حافظ جعفر الاسلام صاحب زادہ اللہ تعالی حیاۃ طیبۃً قابل ذکر ہیں، جن سے حضرت مولانا کے تذکرے کے حوالے سے راقم نے کافی استفادہ کیا ہے۔

حضرت العلام کے والد بزرگوار :

حضرت العلاّم کے والد بزرگوار الحاج شاہ صوفی احمد علی رحمۃ اللہ علیہ ایک اہل دل اور صاحب ورع وتقوی بزرگ انسان تھے اور اپنے والد کی طرح ساتھ ہی ساتھ بڑے خلیق وسخی اور خلق خدا سے نہایت محبت کرنے والے بھی تھے، زمیندار تھے مگر گویا پوری زمینداری خلق خدا کی خدمت کے لئے وقف تھی

،امانت اور دیانت کے حوالے سے پورے علاقے میں معروف ومشہور تھے، زمینداری کے علاوہ تجارت پیشہ بھی تھے، ویسے حضرت شاہ صوفی احمد علی کو اس علاقے کے لوگ ’’پانچکری سوداگر‘‘ کے نام سے جانتے پہنچانتے تھے، اور بہت کم لوگوں کو یہ پتہ تھا کہ ان کا نام احمد علی تھا، بعد میں ان کا نام ’’پانچکری سوداگر‘‘ کے خاندان کے نام سے معروف ہوا اور آج بھی اس خاندان کو اسی نام سے جانا پہنچانا جاتا ہے۔

پانچکری سوداگر حضرت شاہ صوفی احمد علی صاحب کے تین بھائی تھے :

(۱) جبار علی مرحوم۔

(۲) حکیم علی مرحوم۔

(۳) اکبر علی مرحوم۔

اللہ تعالی کی مرضی ہے کہ پانچکری سوداگر جناب شاہ صوفی احمد علی صاحبؒ اور ان کا ایک بھائی گلتا جر باپ بقیہ دونوں بھائیوں سے ناچاک ہوکر علی چنگ سے منتقل ہوکر بستی گودام فارہ جہاں ان کی زمینداری تھی چلے گئے، اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو چکے تھے، موضع گودام فارہ کا کچھ تذکرہ اگلی سطور میں آئے گا، یہاں موضع علی چنگ کا کچھ تذکرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اور وہ بھی اس حوالے سے کہ موضع علی چنگ کو سرزمین ارکان میں ایک مردم خیز علاقہ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے، یہ علاقہ بزرگوں، علماء، درویش اور قوم کے خداموں کا علاقہ ہے، اس علاقے کو بزرگان دین متین اور اولیاء صالحین کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے ارکان کے دیگر علاقوں پر بڑی برتری حاصل ہے، بالآخر اس علاقہ کو یہ سعادت بھی نصیب ہوچکی ہے کہ اسی علاقے میں قطب الارشاد حضرت العلام شاہ صوفی مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ہوئی، اگرچہ گودام فارہ بستی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس نے اس سرزمین کی ایک عظیم المرتبت شخصیت کو ہمیشہ کے لئے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، مگر حضرت کی ولادت باسعادت کے حوالے سے علی چنگ بستی کو یہی زہے نصیبی ہے کہ اس نے اس سرزمین کے اتنے بڑے گوہر یک دانہ کو پیدا کیا ہے۔

جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ حضرت کو جاننے والوں میں بھی بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ حضرت العلام کی ولادت باسعادت علی چنگ میں ہوئی، عام لوگ حضرت العلام کو’’

گودام فاروی حضرت پیر صاحب‘‘ کے نام سے جانتے پہنچانتے ہیں، علی چنگ کا مزید تعارف راقم سطور کی تصنیف ’’سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں‘‘ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت العلام کے والد بزرگوار حضرت شاہ صوفی احمد علی معروف بہ پانچکری سوداگر رحمۃ اللہ علیہ اس خاندان کے اپنے زمانے کے روشن چراغ تھے، زاہد بھی تھے، عالم دین بھی، اور عارف باللہ بھی، ان کے متعلق ایک روایت ایسی بھی ملتی ہے کہ آپ سرزمین ارکان کے کسی نامور صاحب نظر بزرگ کے خلیفہ اور مجاز بیعت تھے، مگر دوسری روایت جو معروف بھی ہے اور قرین قیاس بھی کہ آپ رحمۃ اللہ سلسلۂ عالیہ نظامیہ چشتیہ کے نامور بزرگ حضرت شیخ مولانا کریم بخش صاحبؒ (والد بزرگوار حضرت شاہ صوفی حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ) کے مجاز بیعت تھے، ان دونوں روایات میں سے جس طرح عرض کی جاچکی ہے کہ راقم السطور کے نزدیک موخر الذکر روایت زیادہ قرین قیاس ہے، قرائن کے علاوہ موخر الذکر روایت میں نے حضرت مولانا شاہ صوفی عبد السلام ارکانی کے نامور خلفاء ومریدین کے علاوہ اس علاقے کے دیندار، عالم دوست اور اولیاء شناس لوگوں کی زبانی بھی سنی ہے، روایت کے علاوہ حتمی شہادت اگرچہ دستیاب نہیں ہوسکی، البتہ اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت العلام جناب الحاج صوفی احمد علی صاحب ایک مجاز بیعت بزرگ ہونے کے علاوہ ایک جلیل القدر صاحب نسبت، اوصاف حمیدہ سے متصف، ملت حنفیہ اسلامیہ کے اشاعت کرنے والے اور اس کی ترویج کے بڑے خواہاں بزرگ ترین انسان تھے، علاوہ ازیں آپ شرک وبدعات، رسوم مشرکانہ کی اہانت وتذلیل وبیخ کنی میں خصوصی توجہ رکھنے والے تھے، آپ کو دنیاوی وجاہت وشان کے علاوہ دولت باطنیہ سے بھی وافر حصہ ملا تھا، روایت ہے کہ وطن عزیز ارکان کے دور دراز علاقوں میں عموما اور اپنے علاقے میں خصوصًا لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے آپ رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کیا تھا، اس علاقے کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی آپ کے خلفائے کرام تھے، ویسے پتہ چلتا ہے کہ آپ علم وعمل، تقوی شعاری اور عبادت گزاری کے اعتبار سے بھی یگانہ روزگار تھے، عمر کے آخری حصے میں آپ نے جلوت سے خلوت کی طرف کوچ کیا، عزلت وگوشہ نشینی کی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور گودام فارہ کی خاک میں مدفون ہوئے۔

حضرت شاہ صوفی احمد علی صاحب رحمۃ اللہ کی دو بیویاں تھیں، دونوں کے بطن سے آٹھ بیٹے پیدا ہوئے، ان میں صرف حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی والدۂ مرحومہ کے بطن سے آپ سمیت پانچ بیٹے پیدا ہوئے، جو درج ذیل ہیں :

(۱) جناب مرحوم عبدالکریم رواسوگری صاحب۔

(۲) جناب مرحوم لعل محمد معروف بہ غنیّۃ باپ۔

(۳) حضرت العلامہ شاہ صوفی عبدالسلام صاحب ارکانی ؒ (۱)

(۴) جناب مرحوم ابوالخیر رواسوگری سندی فرانگی۔

(۵) جناب مرحوم ٹھنڈا میاں رواسوگری گودام فاروی۔

گودام فارہ :

جہاں تک حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے مدفن بستی گودام فارہ کا تعلق ہے، اس کا مختصر اور اجمالی تعارف اتنا سا ہے کہ بستی گودام فارہ بوسیدنگ شہر سے جنوب میں کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر دریائے مایو کے ایک شاخ کے مغربی کنارے پر آباد ایک قدیم مسلم بستی ہے ،جس کے مغرب میں کوہِ مایو کا دوڑتا ہوا بلند وبالا پہاڑی سلسلہ ہے، اسے دیکھنے میں یوں لگتا ہے کہ دریا ئے مایو کے اس شاخ مغرب کے کنارے کوہِ مایو کے ڈھلوان میں آباد ہے، یہ بستی بھی علی چینگ کی طرح قدیم زمانے سے بزرگوں، درویشوں، خداشناس عالموں اور ملک وملت کی راہوں میں مر مٹنے والے مجاہدوں اور سیاست دانوں کی آماج گاہ رہی ہے، اس بستی نے الحمد للہ تعالیٰ بہت سے علماء، خدا رسیدہ درویشان اور خدا مان ملک وملت پیدا کئے ہیں ،جن کی علمی ،فکری اور عملی صلاحیت نے اللہ کی اس زمین کو درخشاں رکھا تھا، جن کی روشن اور لازوال کوششوں نے اس سرزمین کے ایک بڑے حصے کو ایک حدتک دین متین سے جوڑ کر رکھا تھا۔

---

(۱) یاد رہے کہ حضرت العلامہ جناب مولانا شاہ صوفی عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی والدۂ مرحومہ پانچکری سوداگر کی چھوٹی اہلیہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بستی فوجی اور جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے بھی خاص اہمیت کی حامل رہی ہے، ۱۹۴۲ء کے واقعۂ کرب وبلا کے دوران مجاہدین اسلام ارکان نے اس بستی سے دشمنوں پر گھات لگا کر حملہ کیا تھا، حتی کہ اس وقت کے ارکان کے خونخوار مگھ کمشنر بھیڑیا او چوکائن اور اس کے ساتھی مگھوں کو جہنم رسید کر دیا گیا تھا، جس کی ہلاکت سے ایک طرف سے مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہوا تو دوسری طرف مگھوں کی ہمت پست ہوگئی تھی ، اس کمشنر او چوکائن کی ہلاکت در اصل اس وقت مسلمانان ارکان اور مجاہدین اسلام کی سرخ روئی کا پیش خیمہ تھی۔

بستی سندی فرانگ :

چونکہ بستی گودام فارہ کے قریبی علاقے ہونے اور اسی بستی سے معاشرتی وسماجی اور معاشی اعتبار سے قریب ہونے کی وجہ سے بستی سندی فرانگ کا مختصر سا تذکرہ بہت ہی ضروری ہے، جو یہ ہے کہ بستی گودام فارہ کے شمال میں ایک قدیم مسلم بستی صدیوں سے آباد ہے، جسے سندی فرانگ کہا جاتا ہے، اس بستی کے تقریبا آخری جنوبی سرا میں ایک بازار بھی آباد ہے، جو ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر واقع ہے، اور یہ ندی مذکورہ دونوں بستیوں کی حد فاصل بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس بازار کو سندی فرانگ کے قدیم نامور زمین دار خاندان ''مصری باپ کا خاندان'' اور پانچ کری سوداگر کے خاندان نے مل جل کر بسایا تھا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس بازار کے محاصل ان دونوں خاندان کے وارثین میں تقسیم کئے جاتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ بستی سندی فرانگ کی معروف ومشہور دینی درس گاہ ''مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ'' کی بنیاد بھی ان دونوں خاندانوں نے مل جل کر رکھی تھی، البتہ یہ ضرور ہے کہ سندی فرانگ والے زمین دار خاندان کو اس بات سے انکار ہے کہ مذکورہ دینی درس گاہ کی بنیاد وتاسیس میں پانچکری سوداگر کے خاندان کی بھی شرکت تھی۔

سندی فرانگ والی بستی شریفوں، درویشوں، علماء اور خدامان ملک وملت کی ایک آماجگاہ ہے، دور آخر میں اس درس گاہ نے بہت بڑے نامور اساتذہ اور علماء پیدا کئے ہیں، آج کل تو ارکان کے دیگر علاقوں کی طرح اس علاقہ اور مخصوص طور پر سندی فرانگ اور گودام فارہ میں آفتیں آئی ہیں، یوں دیگر مساجد

ومدارس کی طرح یہ مدرسہ بھی بند پڑا ہوا ہے۔

حضرت مولانا کی دینی تعلیم :

حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تعلیم کی ابتدا بستی گودام فارہ میں حضرت کے خاندانی مکتب سے ناظرۂ قرآن کریم سے ہوئی تھی، یہ بات معلوم نہیں ہوسکی کہ آپ نے ناظرۂ قرآن کریم کس بزرگ سے کیا تھا، ناظرۂ قرآن کریم کے بعد ایک روایت ہے کہ اس مکتب سے کچھ دینی مبادیات بھی سیکھی تھیں، جب کہ دوسری روایت ہے کہ حضرت نے دینیات کی مبادیات اپنے والد گرامی حضرت شاہ صوفی احمد علی رحمۃ اللہ سے پڑھی تھیں، بہر حال تھوڑے عرصے میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن خداداد کے جوہر پارے کھلنے لگے، چند سال گزرتے نہ گزرتے آپ کے والد گرامی کے سامنے یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ حضرت مولانا عبد السلام ارکانی کو دین کے دقیق مسائل کو سمجھنے اور سنگلاخ وخار دار مضامین تک کو پڑھ کر عبور کرنے کا ملکہ ہو چکا ہے، علاوہ ازیں دین کے دقیق مضامین کے تہ میں پہنچ کر ان سے گوہر پارے نکالنے اور انہیں اپنے طور پر سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی قدرت حاصل ہو چکی ہے، کہا جاتا ہے کہ اپنے والد بزرگوار کی طرح اس زمانے کے بعض علماء واساتذہ کو بھی یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ حضرت مولانا ایک گوہر یک دانہ ہے، چنانچہ ان علماء واساتذہ نے حضرت کے والد بزرگوار کو یہ صلح دیا تھا کہ اس گوہر یک دانہ کو تعلیم کے لئے ہندوستان بھیج دیا جائے، بالآخر اساتذہ اور حضرت کے عزم وہمت کو دیکھ کر والد بزرگوار نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے عزیز بچہ اور طالب علم کو ہندوستان بھیج دینا مناسب ہے، چوں کہ زمین دار تھے، مصارف کے حوالے سے ان کو کوئی اور کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی، یوں تھوڑی تیاری کے بعد آپ کو اگلی تعلیم کے لئے ہندوستان بھیج دیا گیا تھا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ وتکمیل :

چوں کہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی کلکتہ کی نامور درس گاہ ''مدرسہ عالیہ کلکتہ'' کی علمی وتعلیمی شہرت بڑی عام تھی، سرزمین ہندوپاک وبنگلہ دیش کو عموماً اور سرزمین ارکان کو خصوصاً اس دینی وعلمی درس گاہ

سے علم کا بڑا فیض ملا، اور بعض حیثیت سے اس زمانے میں اس درس گاہ کو علم وفن کا مرکز سمجھا جاتا تھا، از ہر الہند دار العلوم دیوبند اور مادر علمی وفکری دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فیضان کی وجہ سے آہستے آہستے اس درس گاہ کی شہرت ماند پڑ گئی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ کلکتہ کی اس درس گاہ سے وقت کے بڑے بڑے علماء اور جید اساتذۂ فن پیدا ہوکر نہ صرف بنگال بلکہ سرزمین اسلام ارکان کو بھی علم کی دولت سے نوازا ہے۔

بہر حال حضرت نے اپنے والد بزرگوار کے اشارے پر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا، اس حوالے سے بعض بزرگوں نے یہاں تک بتایا ہے کہ حضرت کے والد گرامی کا فیصلہ تھا کہ آپ مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیں، اور ان کا یہ فیصلہ دراصل ایک الہامی فیصلہ تھا، جس پر عمل درآمد کرنا حضرت کے والد گرامی کے لئے ضروری ہوگیا تھا، اور آپ نے اس پر عمل کیا۔

الغرض حضرت مولانا شاہ عبد السّلام ارکانی کلکتے پہنچے اور سیدھا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ کے ضابطہ کی تعلیم شروع ہوئی اور یہیں سے علوم متداولہ یا درسیات کی تعلیم کی تکمیل ہوئی، اس حوالے سے مولانا عبد القدوس صاحب ساتکانوی مولف ''اسرار الاولیاء'' رقم طراز ہیں کہ :

> ''الحاج شاہ صوفی مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ (مولانا عبد السلام ارکانی) کے والد ماجد ہیں، جو پانچکری سوداگر کے نام سے مشہور تھے، ضلع اکیاب کے بوسیدنگ آپ کا آبائی وطن ہے، (مولانا عبد السلام نے) ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں حاصل کی، آپ بڑے زمین دار کے صاحب زادے تھے، مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے، اور آخری سند حاصل کرنے تک وہیں رہے''۔ (۱)

حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ طریقت حضرت العلام حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی تھے، جن کا تذکرہ اگلی سطور میں انشاءاللہ آرہا ہے۔

جہاں تک پتہ چلا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار حضرت شاہ صوفی احمد علی صاحب بذات خود اس وقت کے سرزمین ہند کے عظیم شیخ طریقت حضرت الحاج شاہ صوفی حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے روحانی حالات وکمالات سے واقف تھے، اس واقفیت کی دو وجہ تھی۔

---

(۱) مولانا عبد القدوس ساتکانوی، اسرار الاولیاء، ص: ۱۹۰ ۔

روحانی تربیت وخلافت :

(۱) ان میں سے ایک یہ کہ چوں کہ ایک روایت کے مطابق حضرت شاہ احمد علی صاحبؒ حضرت حامد رحمۃ اللہ کے والد گرامی حضرت شاہ صوفی کریم بخش کے مرید یا مجاز بیعت تھے،تو ظاہر ہے کہ حضرت احمد علی کو خانوادۂ کریم بخش کے روحانی حالات وکمالات سے واقفیت سے دل چسپی تھی۔

(۲) جب کہ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چوں کہ شاہ حامد حسین علوی اعظم گڑھی صاحبؒ کی برما وارکان اور ساتھ ہی ساتھ بنگال میں ان کی شہرت سے قبل بھی مسلسل آمد ورفت رہ چکی تھی،اس نسبت سے اپنے شیخ زادے اور وہ بھی ایک باکمال سے ملاقات ہوئی تو ''ولی را ولی می شناسد'' کے اعتبار سے واقف ہو چکے تھے۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو کہ ایک روایت کے مطابق اپنے والد گرامی کے ارشاد وہدایت کے مطابق حضرت مولانا عبد السلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کے دوران حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کی خدمت میں باضابطہ حاضر ہو کر بیعت ونسبت سے سرفراز ہوئے تھے۔

جب کہ ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ خود مولانا عبد السلام ارکانیؒ نے کلکتہ میں اپنے طالب علمی کے دوران ایک شیخ کامل کی تلاش کی اور اپنے ذاتی انتخاب کے بعد حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ونسبت سے مشرف ہوئے تھے،اس بارے میں راقم سطور کے ناقص خیال میں اول الذکر روایت زیادہ قرین قیاس ہے،اس حوالے سے مولانا عبد القدوس صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی کسی جگہ پر حضرت اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی ملاقات ہوئی ، اور ان کے ہاتھوں آپ شرف بیعت سے مشرف ہوئے، اور طالب علمی کے زمانے میں ہی آپ کو خلافت مل گئی ، اور حضرت قبلہ کے خلفائے کرام میں آپ سب سے جلیل القدر ہیں''۔ (۱)

بیعت ونسبت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ اپنے شیخ ومرشد برحق کی خدمت میں وقت وقت پر حاضری دے رہے تھے ، ایک طرف علوم متداولہ کی تکمیل ہو رہی تھی، جبکہ دوسری طرف تزکیہ واحسان اور

(۱) مولانا عبد القدوس ساتکانوی،اسرار الاولیاء، ص : ۱۹۰۔

تصوف وسلوک کی راہیں طے کرتے ہوئے اکملیت کی طرف قدم بڑھا رہے تھے،بالآخر وہ دن آیا کہ آپ ایک طرف مدرسہ سے محقق عالم،فقیہ وکلامی ومفسر ومحدث بن کر نکلے تو دوسری طرف خانقاہ اعظم گڑھ سے حامل مقام ونسبت وحال اور حامل سوز وساز مرشد ومصلح بنے ظاہر ہوئے تھے۔

بحیثیت طالب علم آپ بڑے ذہین وفطین تھے جبکہ بحیثیت مطلوب علم آپ بڑے تیز وتند شیخ طریقت بھی،حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے ملفوظات جو سامنے آئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ غیر معمولی ذہانت اور اعلی استعداد کے ایک جلیل القدر عالم دین اور صاحب سوز وساز شیخ طریقت اور رہنمائے ملّت انسان تھے،انشاء اللہ تعالی حضرت مولانا کے بعض ملفوظات اگلی سطور میں درج کئے جائیں گے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت وارادت سے سرفراز ہونے کے بعد اپنے شیخ کی خدمت میں تقریبًا بائیس (۲۲) سال گزارے،اس دوران آپ نے حد درجہ مجاہدہ کیا،اور بطور خاص تعلیم سے فراغت کے بعد راہ سلوک کو تکمیل کرنے میں آپ زیادہ سے زیادہ منہمک ہو گئے تھے،اور آپ نے اپنے مرشد وشیخ کی خدمت کو اپنا حرز جان بنالیا تھا،آپ کی ریاضت شاقہ اور محنت ومجاہدہ کے حوالے سے مولانا عبد القدوس صاحب ساتکانوی رقم طراز ہیں کہ:

> ''آپ کی ریاضت ومجاہدہ کے بارے میں ایک واقعہ قلم بند کر دینا ہی کافی معلوم ہوتا ہے،وہ واقعہ یہ ہے کہ ساتکانیہ خاگریہ کے جناب محی الدین انسپکٹر صاحب نے آپ (مولانا عبد السلام صاحب ارکانیؒ) سے عرض کیا کہ آپ نے کس قدر ریاضت ومجاہدہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے کلکتہ مدرسہ عالیہ میں داخل ہوا، جماعت پنجم میں تھا کہ حضرت اعظم گڑھی کے ہاتھ میں بیعت کی ، اور حضرت قبلہ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے، فارغ التحصیل کے بعد زیادہ تر اوقات حضرت قبلہ کے ہاں گزارے تھے ،عشاء کی نماز کے بعد وظائف سے فارغ ہو کر حضرت پیر صاحب قبلہ جب مسجد سے روانہ ہو جاتے تو اپنی چادر مبارک مجھ پر ڈال کر جاتے تھے، میں ساری رات مراقبہ،مشاہدہ، ریاضت شاقہ اور اطاعت الہی میں گزار دیتا تھا،صبح کی آذان سے پہلے حضرت قبلہ تشریف

لاتے اور مجھ سے فرماتے کہ ''سلام آذان کا وقت ہوا ہے آذان کہہ دو'' اسی طرح میں نے متواتر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی، سبحان اللہ یہ واقعہ ائمۂ مجتہدین اور اولیاء متقدمین کی یاد تازہ کردیتا ہے، بے شک اسی کا نام ہی تصوف وطریقت ہے، اللہ پاک اپنی روحانی فیوضات سے ہم سب کو نوازے، آمین ''(۱)

غرض حضرت اعظم گڑھی کی روحانی تربیت کے تہ بتہ توفیق خداوندی نے آپ کی زندگی کو علم وعرفان، زہد ورع، تقوی وطہارت کا ایک منبع بنادیا، آپ کی ذات عالی مرتبت میں روحانی رعنائیاں بخشیں، اور آپ کو تصوف وسلوک، تزکیہ واحسان کا رمز شناس اور محرم راز بنا کر رکھ دیا، ایک عارف باکمال کی مسلسل خدمت وصحبت اور تعلیم وتربیت نے آپ کی شخصیت کو مواہب لدنیہ کا ایک ابلتا ہوا چشمہ بنادیا، بالآخر حضرت شیخ نے پہلے سلسلۂ عالیہ مجددیہ نقشبندیہ پھر یکے بعد دیگرے سلسلۂ عالیہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، شاذلیہ اور قرنیہ کی اجازت عطا کردی۔

شجرۂ طیبہ سلسلۂ عالیہ مجددیہ نقشبندیہ :

۱۔ حضرت رسالت مآب سید المرسلین، رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.
۲۔ حضرت امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالی عنہ۔
۳۔ حضرت سیدنا سلمان الفارسی رضی اللہ تعالی عنہ۔
۴۔ حضرت سیدنا قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالی عنہ۔
۵۔ حضرت سیدنا امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ.
۶۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ۔
۔ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ عنہ۔
۸۔ حضرت ابوبکر فارمدی طوسی رحمۃ اللہ علیہ۔
۹۔ حضرت ابویعقوب یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۰۔ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء، ص : ۱۹۲۔۱۹۳۔

۱۱۔ حضرت مولانا عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۲۔ حضرت محمود ابوالخیر فضوی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۳۔ حضرت علی رامتینی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۴۔ حضرت بابا محمد سماسی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۵۔ حضرت امیر سیّد کلاّل رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۶۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۷۔ حضرت مولانا یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۸۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۹۔ حضرت مولانا زاہد رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۰۔ حضرت مولانا درویش رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۱۔ حضرت خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۲۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۳۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۴۔ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۵۔ حضرت سید عبد اللہ اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۶۔ حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۷۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۸۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۹۔ حضرت سیدنا امیر المؤمنین سید احمد بن عرفان الشہید رحمۃ اللہ علیہ۔
۳۰۔ حضرت صوفی نور محمد چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ۔
۳۱۔ حضرت صوفی فتح علی اویسی رحمۃ اللہ علیہ۔
۳۲۔ حضرت مولانا غلام سلمانی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲۳۔ حضرت سید عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ۔

۳۴۔ حضرت الحاج حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ۔

۳۵۔ حضرت الحاج مولانا شاہ صوفی عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ۔

ایک ممکنہ شبہ کا ازالہ :

شاید بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ طریقت وسلوک میں حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ کوئی بدعتی اور خرافاتی سلسلہ ہے، جس طرح برصغیر پاک وہند اور بنگلا دیش میں خرافاتی اور نام نہاد سلسلوں کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن نہیں دراصل اس سلسلے کا تعلق حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور سید احمد بن عرفان الشہیدؒ کا سلسلہ ہے، جس طرح حضرات علمائے دیوبند اور علمائے دار العلوم ندوۃ العلماء کا سلسلہ ہے، ٹھیک اسی طرح یہ سلسلہ بھی صحیح عقائد، صحیح مسلک ومشرب پر مبنی ہے۔

جس طرح مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت الامام احمد بن عرفان الشہیدؒ تک درمیان میں پانچ حضرات مشائخ پائے جاتے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت امام سید احمد بن عرفان الشہید رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۳) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) حضرت الامام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ

(۶) حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

(۷) مفکر اسلام سید ابوالحسن علی الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی سے لے کر حضرت الامام احمد بن عرفان الشہیدؒ تک درمیان میں پانچ مشائخ کرام پائے جاتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت امام احمد بن عرفان الشہید رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت صوفی نور محمد بن فناہ چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۳) حضرت صوفی فتح علی اویسی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) حضرت مولانا غلام سلمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) حضرت سید عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۶) حضرت الحاج حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۷) حضرت الحاج مولانا شاہ صوفی عبدالسّلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ۔

تو ظاہر ہے کہ حضرت مولانا شاہ صوفی عبد السّلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ اوپر جا کر سید الامام احمد بن عرفان الشہید سے ملتا ہے، جو عقیدہ ومسلک اور مشرب کے اعتبار سے اہل السنت والجماعت ہے، جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

یہاں ایک حسن اتفاق کی بات بتادوں کہ مذکورہ بالا دونوں سلسلوں کا تعلق حضرت سید الامام احمد بن عرفان الشہید سے ہے، حضرت سید صاحبؒ کے دو خلفاء:

(۱) ایک حضرت مولانا نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) دوسرا حضرت صوفی نور محمد بن فناہ چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ۔

دونوں خلفاء کے اسمائے گرامی نور محمد تھے، جن دونوں محمد سے دو سلسلوں کا اجراء ہوا تھا، ان میں سے ایک نے برصغیر ہند وپاک کو شریعت وطریقت، سلوک ومعرفت، تزکیہ واحسان کے انوار سے منور کیا جب کہ دوسرے نور محمد نے سرزمین ارکان وبنگال کو روشن وتابان کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ سے لے کر حضرت الامام سید احمد بن عرفان الشہید تک کے تمام بزرگوں کی سوانح عمریاں اور تذکرے برصغیر میں ہر کہیں پائے جاتے ہیں، لیکن حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ سے لے کر حضرت سید احمد الشہید تک کے تذکرے اور سوانح عمریاں بہت کم ملتی ہیں، غالبا نہ ملنے کی برابر بھی، تو اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان درمیانی تمام بزرگوں کی سوانح عمریاں یا تذکرے اگرچہ اجمالی طور پر کیوں نہ ہوں یہاں اسی رسالہ میں درج کردیا جائے، تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ سے اوپر سید احمد بن عرفان الشہید تک کے بزرگان دین متین کون تھے، ان کے حالات کیسے تھے۔

اورتو اور حضرت مولانا مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائی پوری سے لے کر حضرت سید احمد بن عرفان الشہید تک سارے بزرگوں کے حالات ساری تفصیلات کے ساتھ پائے جاتے ہیں، تو ناقص الخیال راقم سطور اس بات کو ضروری محسوس کرتا ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی سے لے کر حضرت سید احمد بن عرفان الشہید تک کے درمیانی بزرگوں کے کچھ حالات وکوائف درج کردیا جائے، جو حاضر خدمت ہیں:

حضرت امام سید احمد بن عرفان الشہید بنگال میں :

حضرت امام سید احمد بن عرفان الشہید کے حالات یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس لئے کہ حضرت شہید کے حالات پر مشتمل برصغیر ہند وپاک میں بہت ساری کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور منظر عام پر بھی آگئی ہیں، راقم سطور کے نزدیک حضرت شہید پر مولانا غلام رسول مہر صاحب کی تصنیف اوران کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کی تصنیف ''سیرت سید احمد شہید'' ہی کافی ہے، تاہم یہاں صرف اور صرف حضرت سید صاحبؒ کی بنگال آمد اوران کے قدم کی برکت سے اس پورے علاقے میں شریعت وطریقت کا جو پوپھٹا اس کا اجمالی تذکرہ کردینا ضروری محسوس کرتا ہوں۔

یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ حضرت امیر المؤمنین شہید بالاکوٹ سید احمد بن عرفان الشہیدؒ تک جتنے بزرگان دین متین اس سلسلے میں موجود ہیں، ان کی سیرت وکردار، تذکرے اور سوانح عمریاں اس دنیائے علم وعرفان کے لئے چراغ راہ بنی ہوئی ہیں، راقم سطور کے ناقص علم کے مطابق اس سلسلے میں سب سے بڑی خدمت مفکر اسلام حضرت مولانا، مرشدنا، اماماسید ابوالحسن علی الحسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، حضرت مولانا کی تصانیف میں سے ''نبی رحمت'' تاریخ دعوت وعزیمت، سیرت سید احمد بن عرفان الشہید نے رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر سید احمد بن عرفان الشہید تک کے نامور دعاۃ ومرشدین اور حاملین دعوت وعزیمت کی زندگیوں کو محفوظ کردیا ہے، تاریخ دعوت عزیمت کا حصۂ چہارم حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کی مفصل سوانح حیات، ان کا عہد آور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی وانقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کے بیان پر مشتمل ہے، جس میں خود ان کے اوران کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر، اوران کی اصلاحی وتجدیدی اور

تربیتی خدمات کا مفصل بیان ہے، پھر تاریخ دعوت وعزیمت کا حصۂ پنجم حضرت حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اوران کے اخلاف وخلفاء کے حالات پر مشتمل ہے، جو درحقیقت ہند وپاک میں احیاء دین متین، اشاعت کتاب وسنت، اسرار مقاصد شریعت کی توضیح وتنقیح، تربیت وارشاد اور ملت اسلامیۂ ہندیہ کے تحفظ اور ملّی تشخص کی بقا کی عہد آفرین کوششوں کی ایک مفصل روداد ہے، اسی طرح سلسلۂ تاریخ دعوت وعزیمت کی ایک حیثیت سے آخری دو کڑیاں یعنی سیرت سید احمد شہید کا حصّہ اول ودوم جو حضرت سید صاحب کی مفصل سوانح عمری ہیں اور جو آپ کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے، غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد اسلامی، تنظیم وتجدید اور احیاء خلافت اسلامیہ کی تاریخ پر مشتمل ہیں، تو ظاہر ہے کہ سید صاحب تک اس سلسلہ کے بزرگان دین حق کی سوانح عمریاں محفوظ ہوچکی ہیں، تو جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ سید صاحب کے بعد آنے والے حضرات مصلحین ومرشدین جن کا تعلق ہمارے ممدوح حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی سے ہے، ان کی حیات بابرکات پر اس عجالہ میں ہی سہی کچھ روشنی ڈالی جائے، تاکہ ناظرین کو یقین ہوجائے کہ دراصل حضرت صوفی نور محمد چاٹگامی سے لے حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانیؒ اور ان کے اخلاف ومتعلقین، منتسبین واحباب بھی اس سلسلہ دعوت وعزیمت کی ایک ایک کڑیاں ہیں، اور یہ خلش باقی نہ رہ جائے کہ یہ حضرات کوئی اور سلاسل کی طرف منسوب ہیں۔

حضرت مولانا سید احمد بن عرفان الشہید کلکتے آئے تو سلہٹ، چاٹگام، اور آسام کے لوگ کشتیوں پر سوار ہو ہوکر کلکتے پہنچے تھے، اور سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر سب نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی، جن کے ہم راہ بہت ساری خواتین بھی تھیں، اس حوالے سے مفکر اسلام سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت سید احمد شہید حصہ اوّل میں لکھا ہے کہ:

> ''جب یہ حال سب اپنے اپنے ملک کا بیان کرچکے تو ان میں جو لوگ رئیس اور سربر آوردہ تھے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت جس طرح ہوسکے آپ ہمارے ملک میں تشریف لے چلیں، اور ہم لوگوں کو گویا ازسرنو مسلمان بنائیں، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ یہ ملک بہت وسیع ہے، اگر برس دو برس ہمارا رہنا ہوتا تو تمہارے ملک کا دورہ کرتے، اب جہاز کھلنے کا زمانہ قریب آیا، اب زیادہ ٹھہرنا

نہیں ہوسکتا، مگر مولوی امام الدین جوسوداراَم کے رہنے والے ہیں، اور صوفی نو محمد
سلہٹی جوکلکتہ میں رہتے ہیں اور تمہارے قریب الوطن ہیں، ان سے کہہ دیں گے،
وہ تمہیں ضرور دین کے مسائل کی تعلیم کریں گے، جس مسئلے کی تم کوضرورت ہو، ان
سے پوچھ لیا کرنا، خواہ خط کے ذریعے، خواہ خود آکر‘‘۔ (۱)

حضرت صوفی نور محمد چاٹگامیؒ :

حضرت صوفی نور محمد بن محمد فناہ رحمۃ اللہ علیہ ضلع چاٹگام بنگلا دیش (یاد رہے کہ سلہٹ کا پورا علاقہ بھی چاٹگام میں داخل تھا، جوغالباً بنگلا دیش بننے کے بعد الگ ہوا یا کردیا گیا تھا) کے مشرقی حصّے میں واقع میرسرائے مقام کی بستی ’’ملی پاش‘‘ کے رہنے والے تھے، یوں حضرت کے بعض سوانح نگار نے آپ کو سلہٹی اور بعض نے چاٹگامی لکھا ہے، چوں کہ میرسرائے کا علاقہ اب بھی چاٹگام کا حصّہ ہے، تواس لئے راقم سطور بھی آپ کو چاٹگامی لکھنا مناسب سمجھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت صوفی نور محمد چاٹگامی صاحب کواللہ تعالی کی طرف سے خواب میں بشارت ہوئی کہ سیداحمد بن عرفان الشہید حال میں رشدو ہدایے کی شمع جلائے کلکتہ میں مقیم ہیں، ان کی بیعت سے مشرف ہوجاؤ! چنانچہ آپ کلکتہ پہنچے، اور بیعت سے مشرف ہوگئے، جب بعد میں سید صاحب جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے سرحد پہنچے تو حضرت صوفی صاحب بھی آپ کے ساتھ ہوگئے تھے، وہاں کے مختلف معرکوں میں سید صاحب کے ساتھ رہے، پشاور کی فتح سے قبل ۱۸۳۰ء میں مایار کی جولڑائی ہوئی اس میں صوفی صاحب اور آپ کے بھائی حاجی چاند بھی شریک تھے، جس میں آپ شدید زخمی ہوگئے تھے، غالبًا معرکۂ بالاکوٹ کے بعد آپ اپنے وطن بنگال واپس آگئے، اور اپنے علاقے میرسرائے کے قریب بمقام ملی پاش پرگنہ نظام پور میں رشدوہدایت کا چراغ روشن کیا، اس لئے آپ کوبعض حضرات مورخین نظام پوری بھی لکھتے ہیں۔

معرکۂ بالاکوٹ سے واپسی کے بعد حضرت نے اپنی پوری زندگی کو اصلاح عقائد اور معاشرہ

(۱) سیرت سید احمد شہید حصۂ اول، ص: ۳۳۴۔

کی فلاح وبہبودی اور خوش حالی کے لئے وقف کردیا تھا، اور اسی دینی واصلاحی کاموں میں ہمہ تن مشغول رہتے ہوئے یکم نومبر ۱۸۸۵ میں انتقال فرمایا، آپ پرگنۂ نظام پوری کی بستی ملی پاس میں آسودۂ خاک ہیں، رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

حضرت صوفی نور محمد صاحب حضرت سید صاحب سے بیعت سے پہلے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سے وابستہ ہوچکے تھے، آپ کے اول مرشد حضرت شیخ زاہد دلونابی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جوضلع نواکھالی کے علاقے بھنی کے رہنے والے تھے، اور صاحب نسبت بزرگ تھے، حضرت شیخ زاہد رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ مجددیہ کے مشہور زمان بزرگ حضرت صوفی محمد دائم رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلیفہ تھے، اور صوفی محمد دائم رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ امانت اللہ (معروف بہ امانت شاہ) کے نامور خلیفہ تھے، اسی طرح یہ سلسلہ بھی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد ہندی تک پہنچ جاتا ہے۔

چاٹگام میں مغلیہ تہذیب وروایات کے خوگر، نامور فارسی ادیب، مورخ وشاعر جناب حمید الدین خان صاحب جوحضرت نور محمد چاٹگامی کے مرید خاص تھے کی چند تصنیف ملتی ہیں۔

(۱) احادیث الخواتین۔

(۲) گلزار شہادت۔

(۳) راہ نجات.

احادیث الخواتین کا اور ایک نام ’’تاریخ حمیدیہ‘‘ بھی ہے، جوفارسی زبان میں چاٹگام کی ایک مستند تاریخ ہے، جس میں علاقۂ چاٹگام کے نامور علماء، فضلاء اور بزرگان دین کے مفصل حالات وواقعات درج ہیں، جس میں حضرت شاہ امام الدین رحمۃ اللہ علیہ (جن کا نام پچھلی سطور میں گزر چکا ہے) کا تذکرہ بھی موجود ہے، علاوہ ازیں حضرت مورخ کے مرشد حضرت صوفی نور محمد چاٹگامی کے حالات بھی درج ہیں، چنانچہ موصوف ایک مقام پر رقم طراز ہیں کہ :

’’بفضل الٰہی آں ہمہ رسوم ازآں دیار بہ برکت وہدایت ذوات خیر وحسنات حاجی وغازی، زاہد وعالم وفاضل وعابد ومجاہد مولانا امام الدین مرحوم وخلاصۂ اتقیاء وزبدۂ اصفیاء، غازی وحاجی وفاضل وعالم، واورع وزاہد، حضرت پیر ومرشد صوفی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ الاحد اتباع شان برخاستہ آں اقوام بحیلۂ علم وعمل آراستہ شدند وچہ

جائیکہ دراں نواحی کسے بے نماز باشند، بلکہ قضا کردن نماز اجہل ایشاں ہم روانمی دارند، وچوں وقت نماز رسد، بہر کاریکہ باشد فی الفور آں راگزاشتہ طہارت کردہ بنماز مشغول می شوند، حتی کہ درعین وقت بازار استادہ مظہر معنی آیت کریمہ ۔ **لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلاة، الآيه** می شوند، و بلسبتحصیل رنج جزائی وعدۂ صادقہ "**ليجزيهم الله احسن ماعملوا ويزيدهم من فضله والله يرزق من يشاء بغير حساب**" دیگر امور خیر وضرر در آگاہ ہستند، **والحمدلله على ذلك وهو اعلم**"۔ (۱)

حضرت مولانا صوفی فتح علی اویسی چاٹگامیؒ

حضرت صوفی نور محمد چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلیفہ حضرت مولانا صوفی فتح علی اویسی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے ولادت جنوبی چاٹگام کا مردم خیز علاقہ ''ملک سوانگ'' سا تکانیہ چاٹگام ہے، ملک سوانگ درگاہ بارہ اولیاء کی سمت جنوب میں کوارٹر میل کے فاصلے پر شاہراہ ارکان سے ڈیڑ میل دور آباد ہے۔

آپ کے ابتدائی حالات زندگی سے تاریخ وسوانح کی کتابیں تقریبًا خاموش ہیں، البتہ مولانا زین العابدین اختری کے بیان کے مطابق آپ نہایت ذکی الطبع اور ذی استعداد اور فہیم انسان تھے، کم سنی میں ہی قرآن کریم کے حفظ کے علاوہ دیگر دینی کتابوں کے مطالعے سے فارغ ہو چکے تھے، بعد ازاں تفسیر وحدیث، فقہ واصول، عقائد وکلام، منطق وفلسفہ، بلاغت وادب اور عربی وفارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیت کے ناطے آپ نے ان تمام علوم پر عبور حاصل کرلیا، مولانا رحمۃ اللہ کے مجموعۂ کلام کا ایک دیوان دریافت ہو چکا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو فارسی زبان وادب، محاورات وامثال، بدائع وصنائع پر اہل زبان کے قادر الکلام شعراء کی طرح عبور حاصل تھا، فارسی زبان کے اس عجم میں آپ کا دیوان اسلامی ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔

متداول تعلیم سے فراغت کے بعد آپ دنیائے سلوک وتصوف کی طرف متوجہ ہوئے، اور اپنے والد گرامی کے دوست حضرت مولانا صوفی نور محمد چاٹگامی کے ہاتھ میں بیعت ہوئے، چنانچہ آپ مدت

(۱)　تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، حمید الدین خان، تاریخ حمیدیہ۔

دراز تک شیخ کی خدمت وصحبت میں رہے، بالآخر اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

خلافت واجازت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ نے کچھ دنوں تک سرکاری ملازمت کی، مگر ۱۸۶۸ء کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے، اور زندگی کے بقیہ اٹھارہ انیس سال مسلمانوں کی تعلیم وتلقین اور اصلاح عقائد کے ساتھ ساتھ دعوت وتبلیغ وارشاد میں گزار دیئے، آخر کار اللہ تعالی کے اس برگزیدہ بندہ نے ۶۱ سال کی عمر میں ۶/دسمبر ۱۸۸۶ء میں انتقال فرمایا، اور خاک کلکتہ میں مدفون ہوئے۔ (۱)

آپ ایک جلیل القدر عالم دین، عارف باکمال، داعی ومبلغ اور پابند سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چلتا پھرتا پیکر تھے، اور مرشد کامل وشیخ طریقت بھی۔

شمش العلماء حضرت مولانا شاہ غلام سلمانی عباسیؒ :

صوفی فتح علی اویسی کے نامور خلیفہ حضرت العلامہ شمش العلماء حضرت مولانا شاہ غلام سلمانی عباسی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت فرفرہ شریف ضلع ہوگلی میں ہوئی، آپ کا نسبی تعلق وہاں کے عباسی شیوخ سے تھا۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا غلام ربانی رحمۃ اللہ علیہ عربی وفارسی کے ادیب، جلیل القدر انشاء پرداز اور متبحر عالم دین تھے، اور انگریزی حکومت میں عہدۂ منصبی پر فائز تھے۔

حضرت مولانا شاہ غلام سلمانی عباسی کی ابتدائی تعلیم فرفرہ شریف ضلع ہوگلی میں ہوئی، اعلی تعلیم کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے، اور اس زمانے کی شہرۂ آفاق درس گاہ ''مدرسہ عالیہ کلکتہ'' میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے تفسیر وحدیث، فقہ واصول، عقائد وکلام، منطق وحکمت، بلاغت وادب عربی وفارسی کی تعلیم پائی، آپ تاریخ اسلام سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، نہایت ذکی وذہین طالب علم تھے، آپ نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور پر استفادہ کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ محسنیہ ہوگلی میں مدرس مقرر ہوئے، ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس بنے، بعد میں آپ کے موہوبی کمالات اور خداداد صلاحیات واستعداد کے اعتراف کرتے ہوئے انگریز سرکار نے ۱۹۱۰ء میں شمش العلماء کے خطاب سے نوازا، اور ۱۹۱۱ء میں مدرسہ

(۱)　اس تاریخ سے پتہ چلا کہ آپ کی ولادت ۱۸۲۵ء میں ہوئی تھی۔

محسنیہ ہوگلی کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے تھے۔

متداول نصاب تعلیم سے فراغت کے بعد ہی آپ کا رجحان تصوف وسلوک کی طرف بڑھا، اور سرزمین بنگال کے اس وقت کے نامور شیخ طریقت وبزرگ ترین شخصیت حضرت مولانا صوفی فتح علی اویسی کے دربار میں حاضر ہوکر بیعت وارادت سے مشرف ہوئے، آپ عرصۂ دراز تک اپنے مرشد برحق کی خدمت وصحبت سے محظوظ ہوتے رہے، بالآخر تصوف وسلوک کے مدارج ومقامات طے کرتے ہوئے خلعت اجازت سے سرفراز ہوئے۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ کی بقیہ پوری زندگی درس وتدریس، تبلیغ وارشاد، اصلاح معاشرہ، انسداد بدعات وخرافات میں بسر ہوئی، بالآخر اللہ تعالی کے اس داعی بندہ نے ۱۹۱۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور فرفرہ شریف میں آسودۂ خاک ہوئے۔

حضرت شاہ سیّد عبدالباری الحسنی والحسینیؒ:

شمش العلماء حضرت مولانا شاہ غلام سلمانی عباسی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ حضرت شاہ سید عبد الباری صاحب الحسنی والحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش موضع بالگڑی ضلع ہوگلی مغربی بنگال میں ہوئی، آپ کے اجداد میں حضرت محی الدین یا حضرت موسیٰؒ بحیثیت پیش امام پٹھان فوجیوں کی ہم راہ دہلی سے بنگال تشریف لائے، بعد میں موضع بالگڑی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

حضرت سید صاحب کے داداجان کا نام سید رمضان علی تھا، جن کے تین صاحب زادے تھے:

(۱) سید اکبر علی۔

(۲) سید شمشیر علی۔

(۳) سید احمد علی۔

موخر الذکر کے تین صاحب زادے تھے، ان میں سے ایک نے بچپن ہی میں انتقال فرمایا، جبکہ دوسرے سید عبدالباری تھے، جنہوں نے اپنے علم وعرفان سے اس سرزمین کو منور کیا بلکہ اس سید خاندان کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندگی بخش دی۔

حضرت سید عبدالباریؒ ابھی چھ سال کے بچے تھے کہ آپ کے والد گرامی حضرت احمد علی کا سایہ سر سے

اٹھ گیا، آپ کی والدہ نے اپنے شوہر کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے بالگڑی سے ہجرت کی اور ہوگلی کا ایک محلہ ''بالی'' میں جابسیں۔

سید عبدالباری صاحبؒ بچپن میں اکثر علالت کے شکار رہتے، ایک طرف عمر کی کمی تو دوسری طرف مسلسل علالت کی وجہ سے گھر کی ساری ذمے داریاں والدہ پر آن پڑیں، والدہ چرخے کاٹتیں اور صبر وشکر کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں، چوں کہ حضرت سید کو والدہ کی مسلسل تکالیف ومشقتوں کا شدید احساس تھا، یوں کچھ بڑے ہوئے تو دوسرے لڑکوں کے ساتھ آپ نے اینٹیں ڈھونی شروع کردی، یوں والدہ کی کچھ مدد ہوئی، اس طرح حضرت نے ہوگلی میں دوسال گزار دیئے تھے۔

اسی دوران آپ کے اندر دینی تعلیم کا شوق موجزن ہوا تو قرآن کریم کی تعلیم کی نیت سے محلہ بالی کے مرزا نیاز علی صاحب کے یہاں پہنچے، روزانہ مرزا صاحب کے پاس تشریف لے جاتے اور ویسی قرآن کریم کی تعلیم ہوتی رہی۔

قرآن کریم کی تعلیم مکمل کرکے آپ نے ریلوے سروس میں ملازمت اختیار کی، دفتر میں کلرک مقرر ہوئے، اور ذمے داری کو بحسن خوبی بناہتے رہے تھے، مگر سید صاحب اس ملازمت سے بعد میں مستعفی ہوگئے تھے۔

دوران ملازمت حضرت سید صاحب کا مزاج وطبیعت بدل سی گئی تھی، محبت الٰہی اور طلب صادق کا غلبہ چھا گیا، یوں ایک مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے تھے۔

حضرت سید صاحب کی طلب وجستجو کو دیکھ کر آپ کے استاد مرزا نیاز علی صاحبؒ نے آپ کو ایک شیخ شاہ نجیب الاسلام کے پاس لے گیا، مرید تو ہوئے مگر بعد میں ان کو شریعت مطہرہ کے پابند نہ پا کر ارادت سے توبہ کرلی تھی۔

حسن اتفاق سے اس وقت کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے والد گرامی حضرت میاں کریم بخش صاحبؒ جو اس وقت سروے انسپکٹر تھے اور کلکتے کی راہ پر ہوگلی کی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے سے حضرت سید صاحب کی ملاقات ہوگئی، میاں صاحب نے آپ کو پاس انفاس کا طریقہ بتایا جس کے بعد سید صاحب گھر لوٹے، اور قلب بفضل خداوندی جاری ہوگیا، دوسرے روز فرط مسرّت سے لبریز ہو کے حاضری دی اور مستقل ارادت کی خواہش ظاہر کردی، اور

میاں صاحب بھی حال سننے کے بعد بہت خوش ہوئے، اس کے بعد سید صاحب نے میاں صاحب کو اپنے مکان میں لایا، یہاں خود بھی مرید ہوئے اور چند لوگوں کو بھی مرید کروایا۔

اس کے بعد ہندوستان کے اور ایک نامور بزرگ حضرت مولانا غلام سلمانی، جن کا مختصر تذکرہ ابھی ابھی گزر چکا ہے سے حضرت سید صاحب کی ملاقات ہوئی، مولانا سلمانی اس وقت طریقۂ عالیہ مجددیہ نقشبندیہ میں بڑے شہرت یافتہ بزرگ تھے، ان کی نگاہ جب سید صاحب پر پڑی تو اپنی فراست ایمانی اور قوت روحانی سے سید صاحب کے احوال ومقام کو معلوم کرلیا، پھر آپ کے ذوق وشوق کو اندازہ لگا کر حضرت سید صاحب سے فرمایا کہ ''آپ اللہ اللہ کرتے ہیں، آیئے ہم بھی کچھ بتادیں!''۔

اس واقعہ کے بعد حضرت سید صاحب حضرت غلام سلمانی کے یہاں آنے جانے لگے، بعد میں آپ نے سید صاحب کو باضابطہ طریقۂ عالیہ مجددیہ کی تعلیم دی، اور ایک مدت تک ریاضت ومجاہدہ کرایا، بالآخر خلافت واجازت سے نوازا۔

حضرت سید صاحب کی خلافت واجازت کے حوالے سے ایک بات یہ بھی مشہور ہے اور بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا بھی ہے کہ سید صاحب نے یکے بعد دیگر تمام سلاسل کے تمام بانیوں سے روحانی طور پر خلافت واجازت پائی تھی، جن میں سلسلۂ چشتیہ کے پیشوا حضرت خواجہ معین الدین سنجری ثم اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، غوث پاک حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر بزرگان دین متین ہیں، غرض مذکورہ طریقہ سے حضرت کو سات سلسلوں یعنی چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ مجددیہ، قرنیہ، شاذلیہ، سہروردیہ میں تعلیم اور اجازت ملی۔

اللہ تعالیٰ کے اس مخلص درویش بندہ نے خلافت واجازت عطا ہونے کے بعد بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر لانے اور بندگان خدا کے قلوب کو نور عرفان وایقان سے بھر دینے میں اپنی بقیہ زندگی صرف کردی تھی۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ بڑے متوازن اور سادگی الفطرت انسان تھے، حلم وبردباری، انسانیت کا احترام وعزت، متوسلین ومتبعین سے پیار ومحبت اور اخلاص وللّٰہیت کا مجسم تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے، ان سے بعض کرامات بھی ظاہر ہوئیں، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

آپ رحمۃ اللہ علیہ وقت کے ایک بہت بڑے قطب مدار اور بلند پایہ کے قطب الارشاد تھے، مگر آپ نے عمر طبیعی بہت کم پائی اور چالیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا، اور تاریخ سے معلوم ہوا کہ آپ کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا، جب کہ آپ کے شیخ ومرشد حضرت مولانا غلام سلمانی عباسی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال آپ کے انتقال کے بارہ سال بعد ہوا تھا۔

صاحب ''اسرار الاولیاء'' حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب نے حضرت سید صاحب کے نامور مریدوں اور خلفاء کے پندرہ نام اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، وہاں پندرھویں نمبر پر حضرت مولانا حافظ حامد حسین صاحب علوی اعظم گڑھی کا نام ہے، معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحب کے خلفاء میں حضرت حافظ صاحب اور حضرت مولانا عبدالصمد صاحب اعظم گڑھی سب سے نامور تھے، اس حوالے سے مولانا عبدالقدوس صاحب ساتکانوی رقم طراز ہیں:

> ''حضرت سید صاحب کے وصال کے وقت مریدین ومعتقدین کی تعداد سب مل کر اٹھائیس تھی، وصال کے قریب نجیبن بوا نے پوچھا کہ آپ کے بعد اس کام کو کون جاری رکھے گا؟ تھوڑی دیر تأمل فرمانے کے بعد حضرت مرشدنا حامد حسین صاحب اور مولوی عبد الصمد کا نام لیا، بوا صاحبہ نے فرمایا یہ ابھی کم عمر ہیں، اس پر حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ ''میں تو ہوں نا''۔ (۱)

جہاں تک راقم سطور کے علم کا تعلق ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے ان مذکورہ بالا سلسلوں کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کی ذات وشخصیت کے ذریعے دوام ورونق بخشا ہے، آپ کی ذات عالی مرتبت کی وجہ سے حضرت سید صاحب کا نام برصغیر ہند وپاک کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی روشن ہوا ہے۔

---

(۱) مولانا عبدالقدوس اسرار الاولیاء۔

حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ :

شیخ المشائخ حضرت الحاج شاہ صوفی حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی بن حضرت مولانا شاہ میاں کریم بخش صاحب کی ولادت ۱۸۷۱ء یا ۱۸۷۲ء میں اعظم گڑھ کی ایک بستی کو ہنڈہ میں ہوئی، حضرت کا سلسلۂ نسب کاکوری کے علوی خاندان سے ملتا ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کے جید حافظ تھے، آپ نے ہدایۃ النحو تک کی تعلیم پائی، البتہ بعد میں مطالعہ کا سلسلہ بہت ہی آگے بڑھا۔

حضرت کے والد ماجد کا خاندانی پیشہ زراعت تھا، لیکن میاں صاحب سروے کے انسپکٹر تھے، یوں آپ کو برصغیر کے مختلف علاقوں میں جانا پڑتا تھا، اس سلسلے میں آپ کو سال میں ایک مرتبہ برما اور ارکان میں بھی جانا پڑتا تھا۔

راقم السطور نے چند بزرگوں سے سنا ہے کہ جب میاں صاحبؒ ارکان پہنچتے تو حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی کے خاندان کے مہمان خصوصی ہوا کرتے تھے، صرف مہمان خصوصی نہیں بلکہ اس خاندان کے علاوہ علاقے کے دیگر خاندانوں اور لوگوں کے مرشد بھی۔

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب نے ابھی ہوش سنبھالا ہی تھا تو دیکھا کہ آپ کے گھر میں ہندوستان سے ایک عظیم شیخ آتے اور پورے علاقے کو روشن اور تاباں کر دیتے ہیں، یوں بچپن میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کی آمد ورفت اور خود آپ کے والد گرامی اور اپنے خاندان کے دیگر بزرگوں کی معرفت اور تذکار سے حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے خاندان اور میاں صاحب کی عنایات خداوندی سے خاصے واقف ہو چکے تھے، جس نے بعد میں آپ کو اعظم گڑھ کی طرف رہنمائی کی اور اس اعظم گڑھی خاندان کے عظیم المرتبت شیخ حضرت حامد حسین رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں حاضری کی توفیق ہوگئی، جن کی تعلیم وتربیت اور انفاس قدسیہ نے آپ کی ذات کو منور اور تاباں کیا، صرف یہی نہیں بلکہ آپ کے واسطے سے وطن عزیز ارکان اور بنگال کے دیگر علاقوں کو بھی نور عرفانی سے تاباں اور درخشاں کر دیا تھا۔

یہ بات پچھلی سطور میں گزر چکی ہے کہ حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے نامور والد حضرت میاں کریم بخش صاحب حضرت سید عبدالباری کے مرشد اوّل تھے، سید صاحب سے میاں صاحب کی

مذکورہ ملاقات کے کئی سال بعد پھر دوسری مرتبہ اپنے مرید خاص سے ملاقات ہوئی تو میاں صاحب کو حضرت سید صاحب کے احوال ومقامات کا انکشاف ہوا تھا، اور چشم باطنی سے دیکھا کہ حضرت سید صاحب بہت ہی بلند مقام پر فائز ہو چکے ہیں، اب میاں صاحب نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اپنے فرزند ارجمند حافظ حامد حسین کو اس عظیم المرتب زرگر کا حوالہ کر دیا جائے، تو میاں صاحب نے سروے سے واپسی پر آپ کو اپنے ساتھ اپنا وطن لے آیا، اور ارادے کے مطابق اپنے فرزند ارجمند کو سید صاحب کا حوالہ کر دیا، اس حوالے سے صاحب ''اسرار الاولیاء'' مولانا عبد القدوس صاحب سا تکانوی رقم طراز ہیں کہ:

> '' آپ (حضرت حامد حسین علوی اعظم گڑھی) کے والد صاحب جب اپنے دورہ سے واپس ہوئے تو حضرت سید عبدالباری شاہ رحمہ اللہ کو بھی ساتھ لیتے آئے، اور اس اکسیر گر کے حوالے کبریت احمر یعنی مرشدنا کو کر دیا، حقیقت شناس نگاہ جب صلاحیت واہلیت پر پڑی تو لعل ویاقوت بنانے کے لئے باطن کو گرما گئی، جگمگاتے ہوئے چہرہ اور دمکتے رنگ نے دوستوں کو متوجہ کیا، مولانا عبدالصمد صاحب مرشدنا کے خاص دوستوں میں با اہل شخص تھے، مرشدنا پر وارفتگی اور مرشدنا پر فدائیت دیکھ کر پوچھنے لگے کہ کیا کوئی بڑی حقیقت ہے جو آپ پا رہے ہیں؟ مرشدنا نے بتایا کہ وہ جو ہر ہے، جو میری قسمت سے ہاتھ آیا ہے، اور والد صاحب کا بڑا احسان ہے، جنہوں نے ہم سے ملایا، ورنہ میں کہاں اور کہاں یہ آفتاب، میری کیا مجال ہے کہ اس کی شرح کروں''۔ (۱)

غرض حضرت سید صاحب نے اپنے مرید خاص کو علم وعرفان کے حوالے سے بلند مقام پر فائز کر دیا۔ حضرت حامد حسین رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے مرشد کامل پر فدا تھے۔ اپنے کو حضرت سید صاحب کے سامنے فانی اور نیست سمجھتے تھے، اور حضرت سید صاحب بھی رحمت خداوندی اور عنایات الٰہی کے پورے مظہر تھے، تربیت واصلاح میں سنت رسول انسانیت صلوات اللہ علیہ وسلامہ کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ حضرت کی تعلیم وتربیت کا طریقہ توجہ ونسبت کا ہوتا رہتا تھا، جس میں اخفا وجذب اور ارشاد کا رنگ غالب

---

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء۔

رہتا تھا، حضرت سید صاحب اپنے مرید وتلمیذ خاص کو بحمد اللہ مقام ادنیت تک کی تعلیم دی، اور خلعت خلافت عطا کردی۔

حضرت حافظ صاحب برما کے سفر میں تھے، ایک روایت کے مطابق رنگون کے کسی علاقے میں معلّمی کی خدمت پر مامور تھے، اس دوران حضرت سید صاحب کی شدید علالت کی خبر پہنچی، اور ایک روایت کے مطابق حضرت سید صاحب کی طرف سے خط پہنچا، جس میں کہا گیا تھا کہ حضرت سید صاحب شدید بخار میں مبتلا ہیں، اور چیچک کے دانے نکل آئے ہیں، خبر یا خط پہنچتے ہی آپ معلمی سے مستعفی ہو گئے اور سیدھے وطن کی راہ لی، مگر قدرت الٰہی کو اور منظور تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے پہنچنے سے قبل حضرت سید صاحب کا وصال ہو چکا تھا۔

ابھی حضرت حافظ صاحب حواس باختہ تھے، سراسیمہ اور نیم بے ہوش، ایسی حالت مین نجیبن بوا نے حضرت حافظ صاحب سے کہا کہ خلافت کا سارا بار آپ پر ڈالا گیا ہے، یہ بات کان پڑتے ہی حضرت پر سکتہ اور سراسیمگی کا مزید عالم طاری ہو گیا تھا۔

حضرت سید صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد حضرت حافظ صاحب کا اپنا دادا پیر حضرت مولانا غلام سلمانی عباسیؒ کے دربار میں بار بار آنا جانا ہوا تھا، لیکن مزید تعلیم وتربیت کی ضرورت نہیں پڑی تھی، وہ اس لئے کہ حضرت غلام سلمانی جانتے تھے کہ حضرت اعظم گڑھی ایک منتہی انسان بن چکے ہیں، یوں انہوں نے مزید تعلیم وتربیت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

اب حضرت حافظ صاحب اپنے مرشد کی طرف سے عاید کردہ ذمے داری کو نباہنے کے لئے نکلے، پہلے اور سب سے پہلے علاقۂ چاٹگام کو انتخاب کیا، جہاں آپ کے والد گرامی حضرت میاں کریم بخش صاحبؒ کے خاصے مریدان اور متعلقین تھے، یہاں اوّل اوّل تو پذیرائی نہیں ہوئی، مگر بعد میں ایسی پذیرائی ہوئی کہ ہر کجا آپ کے متعلقین ومریدین کا ہجوم نظر آنے لگا تھا۔

کہتے ہیں کہ حضرت حافظ صاحب نے اپنی تعلیم کو مقام ادنیت سے بھی بلند کر دیا تھا، روایت ہے کہ آپ نے غالبًا ۱۹۳۹ء میں اس مقام عالی سے بھی بلند مراتب کا سراغ لگایا جو مکتوبات سرہندیؒ میں مذکور ہیں، وہ ہیں :

(۱) رجوع الی الخلق مع اللہ۔

(۲) دعوۃ الحق الی اللہ۔

(۳) اکملیت کی نسبتیں۔

چناں چہ مکتوبات سرہندیؒ دفتر دوم مکتوبات نمبر ۴۲ میں اس مضمون کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ:

''میری تعلیم کا خلاصہ چار سیروں میں ہے، سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، سیر مع اللہ، سیر عن اللہ باللہ''۔(۱)

حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق واوصاف کریمانہ کے متعلق مشہور ہے کہ :

(۱) آپ علمائے اسلام کو بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(۲) یتیموں، مسکینوں، بیکسوں، رانڈوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

(۳) سنت رسولؐ کے پابند اور سنت پر فدا تھے۔

(۴) تحمل، بردباری، تواضع، خاکساری، ایثار، ہمدردی اور اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔

(۵) بڑے معتدل المزاج اور وسیع النظر بزرگ تھے۔

(۶) استقامت وحق گوئی آپ کا شیوہ تھا۔

(۷) مومنین کا اکرام واحترام اور وفود وضیوف کی خدمات میں یکتائے روزگار تھے۔

(۸) بدعات وخرافات کے خلاف سخت موقف رکھتے تھے۔

(۹) کسب حلال کی تلقین وتبلیغ واشاعت کے ہر وقت کوشاں تھے۔

(۱۰) اپنے مریدین کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

غرض آپ نے اپنی پوری زندگی علم وعرفان اور تبلیغ واشاعت دین میں صرف کیا اور بالآخر ۱۹۰۹ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ ان کی روح مبارک میں باراں رحمت برسائے۔ آمین۔

اب ضروری ہے کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان خلفاء کے دستیاب شدہ اسمائے گرامی یہاں درج کر دیئے جائیں، جن کا تعلق برصغیر ہندوپاک بشمول ارکان سے ہے۔

---

(۱) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی، دفتر دوم، مکتوب نمبر: ۴۲۔

خلفائے حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ

۱	ڈاکٹر احمد اللہ خان صاحب، دیوبند ضلع سہارنپور، یوپی۔
۲	سید عبدالجلیل صاحب، شاہ پور ضلع، فتح پور۔
۳	شاہ احسن صاحب، یحیی پور، الہ آباد۔
۴	محمد سعید صاحب، یحیی پور، الہ آباد۔
۵	صوفی عبدالمجید صاحب، برہریا، ضلع اعظم گڑھ۔
۶	محمد خلیل خان صاحب، برہریا، ضلع اعظم گڑھ۔
۷	محی الدین خان جمع دار صاحب، برہریا، ضلع اعظم گڑھ۔
۸	حافظ محمد ظہور صاحب، جلال پور، ضلع فیض آباد۔
۹	عبدالرؤوف صاحب، قصبۂ مئو، ضلع اعظم گڑھ۔
۱۰	ولی محمد میاں صاحب، قصبۂ مئو، ضلع اعظم گڑھ۔
۱۲	مولانا عبدالسمیع صاحب، ہورا، ضلع بلیا۔
۱۳	صوفی عبدالستار صاحب، ہفنیاں، ضلع پورنیا۔
۱۴	الحاج احسان صاحب، کھمیاں، ضلع پورنیا۔
۱۵	مولانا محمد شبلی صاحب، ننداؤں، ضلع اعظم گڑھ۔
۱۶	الحاج مولانا نذیر احمد صاحب، چنوتی، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۱۷	مولانا حافظ محمد منیر صاحب، حوالی شہر، چاٹگام۔
۱۸	مولانا خلیل احمد صاحب، سنواہ، بانسکھالی، چاٹگام۔
۱۹	مولانا فضل الحق صاحب، چنوتی، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۲۰	مولانا فضل الرحمن صاحب، کریہ نگر، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۲۱	مولانا شرف الدین صاحب، انوارہ بانسکھالی، چاٹگام۔
۲۲	مولانا مظفر احمد صاحب، منگڈو، اکیاب، ارکان۔

۲۳	مولانا تراب الدین صاحب، منگڈو، اکیاب، ارکان۔
۲۴	مولانا مطیع الرحمن صاحب منی بیل، بوسیدنگ، ارکان۔
۲۵	مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی، گودام فارہ، بوسیدنگ۔
۲۶	مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی، گودام فارہ، بوسیدنگ۔
۲۷	مولانا عبیداللہ صاحب، سندی فرانگ، بوسیدنگ، ارکان۔
۲۸	مولانا ولی بخش صاحب، پندوفرانگ، بوسیدنگ، ارکان۔
۲۹	مولانا نذیر احمد صاحب، بلی بازار، منگڈو، ارکان۔
۳۰	مولانا عبدالجبار بن حمید علی صاحب، مولی فارہ، اکیاب، ارکان۔
۳۱	الحاج حکیم مولانا قاری منیر احمد صاحب، چنوتی، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۳۲	مولانا جمال الدین صاحب، قطب دیا، چاٹگام۔
۳۳	سید حافظ منظور احمد، یحیی پور الہ آباد۔
۳۴	مولانا حکیم محمد عمر صاحب، قصبۂ مئو، اعظم گڑھ۔
۳۵	منشی محمد شفیع صاحب، لمبی، انڈیا۔
۳۶	ماسٹر محمد عیسی صاحب، لوکھیت، کراچی، پاکستان۔
۳۷	مولانا محمد سعید خان صاحب، نانوری اعظم گڑھ۔
۳۸	محی الدین صاحب، ہفنیاں، ضلع پورنیا۔
۳۹	مولانا عبدالمجید صاحب، گارنگیہ، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۴۰	مولانا عبدالرشید صاحب، گارنگیہ، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۴۱	مولانا عبدالحکیم صاحب، دوہزاری، چاٹگام۔
۴۲	مولانا امام الدین صاحب، کریہ نگر، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۴۳	قاری وجیہ اللہ صاحب، پوٹی بیلہ، ساتکانیہ، چاٹگام۔
۴۴	مولانا عبدالمعبود صاحب، ساتکانیہ، چاٹگام۔

حضرت سلام اپنے مرشد کی نظر میں :

جہاں تک میں نے بعض بلند پائے کے بزرگوں سے سنا اور اسی طرح بعض رسالے میں پڑھا کہ حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ان کے دیگر خلفائے کرام سے بہت بلند تھا، یہ تو شاید کہنا ٹھیک نہیں کہ سب سے بلند تھا، مگر یہ ضرور حقیقت پر مبنی ایک بات ہے کہ حضرت سلام رحمۃ اللہ علیہ حضرت اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت ہی پیارے خلیفہ تھے، اور ممدوح حضرت کے خلفاء میں السابقون الاولون کے درجے پر فائز تھے، چنانچہ حضرت اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب میں اس بات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے، لکھتے ہیں کہ :

مخلصین من !-------------------------سلام مسنون۔

خط آیا، حال معلوم ہوا، کریلا کا بیج پہنچ گیا، ظفر الاسلام سلام کہتے ہیں، اگر تم کو کچھ پوچھنا ہو تو اپنے اختیار تمیزی سے کام لیا کرو، مجھ سے مت پوچھو، عبد السلام سے اگر ملاقات ہو تو سلام کہنا، ان کا احترام کرنا، کیوں کہ وہ السابقون الاولون میں سے ہیں، فقط والسلام۔

حامد حسین علوی اعظم گڑھی۔(۱)

غرض حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی حضرت اعظم گڑھی کے خلفاء اور منتسبین میں السابقون الاولون کا درجہ رکھتے تھے، اور بہت ہی پیارے خلیفہ تھے۔

حضرت اعظم گڑھیؒ مولانا عبد السلام ارکانی ؒ کی دعوت پر چند مرتبہ ارکان تشریف لائے تھے، اور سینکڑوں بندگان خدا جو حضرت ارکانی صاحب کی طرف منسوب تھے، حضرت اعظم گڑھی کی دیدار سے مشرّف ہوئے، بعض مقامات میں ایسا بھی ہوا تھا کہ بعض لوگ حضرت اعظم گڑھی سے بیعت کی آرزومند تھے، مگر ارشاد ہوا تھا کہ مجھ سے بیعت ہونے کی ضرورت نہیں، عبد السلام موجود ہیں، ان سے بیعت ہو جاؤ، وہ میرا اور میں اس کا ہوں، یہ بات میں نے ایک سے زیادہ حضرات کی زبانی سنی تھی۔

---

(۱) مولانا عبد القدوس، اسرار الاولیاء۔ص: ۱۸۳۔ ۱۸۴۔

حضرت مجید حضرت سلام کی عزت کرتے تھے :

حضرت مولانا عبد المجید صاحب سا تکانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت اعظم گڑھی کے اجل خلفاء میں سے تھے، لیکن حضرت بھی حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی کے معترف تھے، باوجودیکہ دونوں حضرات مشائخ حضرت اعظم گڑھی رحمۃ اللہ کے جلیل القدر خلفاء تھے، لیکن حضرت مولانا عبد المجید صاحب حضرت سلام کو اپنے پر فضیلت دینے میں خود اپنی عزت وشرافت محسوس کرتے تھے، دونوں بزرگوں کے درمیان حسن برتاؤ، محبت اور ہمدردی کا ایک عالم ہوتا تھا، اس حوالے سے مولانا عبد القدوس صاحب سا تکانوی رقم طراز ہیں :

’’حضرت مولانا عبد المجید سا تکانویؒ فرماتے تھے کہ جبریل امینؑ اور سید الانبیاء کے درمیان جو نسبت تھی، بعینہ وہی احقر اور مولانا عبد السلام صاحب ارکانی کے درمیان ہے، اکثر تبلیغی طریقت کے سفر میں دونوں حضرات ساتھ ساتھ رہتے تھے، حضور قبلہ (حضر مولانا عبد المجید صاحبؒ) کی کم سخنی اور کم گوئی، خوش اخلاقی اور حسن برتاؤ اور بلند ہمتی عدیم المثال ہے‘‘۔(۱)

مولانا عبد السلام ارکانی صاحب بھی بڑے عجز و نیاز اور تواضع وانکساری کا مظاہرہ کرتے تھے، اور بلند نگاہ سے دیکھتے تھے، دونوں بزرگوں کی آپس کی محبت، خلوص واحترام ایک یادگار چیز بن گیا تھا، دونوں بڑے خلیق اور شرافت ونجابت کے پیکر تھے، چنانچہ مولانا عبد القدوس صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’سا تکانیہ بڑے ہاتیہ میں جناب الحاج حمید الرحمن فقیر صاحب کے یہاں قطب الاقطاب الحاج العلامۃ والفہامۃ شاہ مولانا عبد السلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے متعلقین اور ہمارے پیر صاحب قبلہ (مولانا عبد المجید صاحب) کے مریدین کے ساتھ تشریف فرما تھے، اسی وقت گارنگیہ اسلامیہ سینئر مدرسہ کا بانی ہمارے پیر صاحب الحاج شاہ صوفی مولانا عبد المجید صاحب قبلہ بھی تانجان کے ذریعے فقیر موصوف کے یہاں آرہے تھے، ارکانی صاحب ہمارے پیر صاحب کا قبلہ کے بارے میں یوں ارشاد فرمائے ہیں کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کا مرتبہ بڑھ گیا ہے، چلئے ہم ان کو استقبال کرلائیں، ادھر تانجان اٹھانے والوں نے تانجان کے ذریعے حضرت

---

(۱) مولانا عبد القدوس، اسرار الاولیاء، ص: ۲۰۵۔۲۰۶۔

مولانا عبدالمجید صاحب کو گھر کے صحن تک لے جانا چاہا، تو پیر صاحب قبلہ نے فرمایا کہ تا نجان رکھو! وہاں جناب ارکانی صاحب موجود ہیں، پیدل جاؤں گا، سبحان اللہ کیا ہی اخلاق، کیا ہی محبت کا کرشمہ، کیا ہی احترام وتعظیم، اخلاص وحسن برتاؤ کی تعلیم، ہمیں اس واقعہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی واقعہ یاد آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یونس علیہ السلام کی شان میں فرمایا تھا کہ:

"لاتفضلوانی علی یونس بن متی"

'حضرت ارکانی صاحب کا مقولہ بھی اسی طرح کا ہے، یہ حضرت ارکانی صاحب کی عجز وانکساری ہے، دوسرے وقت ساتکانیہ خانقاہ حامدیہ شریف میں حضرت ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور جناب پیر صاحب قبلہ دونوں ایک ہی ساتھ رہنے کے ساتھ کسی دعوت میں تشریف لے جارہے تھے، حضرت ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان (مولانا عبدالمجید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کا درجہ ہم سے بڑھ گیا ہے، یہ مقولہ حضرت ارکانی صاحب کی عجز وانکساری اور غایت درجہ اخلاص کا ثبوت ہے، واقعی جہاں اخلاص نہیں وہاں کچھ بھی نہیں ہے'۔ (۱)

گلستان عبدالباری کے دو پھول:

حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دو متعلقین یعنی حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانی اور عبدالمجید صاحب ساتکانوی کو حضرت سید عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے باغ کے دو پھول تصور کرتے تھے، جس کا ثبوت حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے ایک فرمان سے ملتا ہے، حضرت نے چاٹگام کے آخری دورہ کے اواخر میں پتنگا ہوائی اڈہ میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا، حضرت نے قاضی سراج المصطفی کو اپنے پاس بلایا اور اس کے سامنے اپنا اس خیال کا اظہار فرمایا تھا، تفصیلات مولانا عبدالقدوس صاحب کے قلم میں پڑھ لیجئے:

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء، ص: ۲۰۷۔

''چاٹگام کے پتنگا ہوائی اڈہ میں حضرت اعظم گڑھی کا ارشاد مبارک کہ حضرت مرشدنا نے فرمایا کہ آخری دفعہ جب پیر صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ پتنگا ہوائی اڈہ میں سب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت حافظ منیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حوالی شہر والے) کا جگر پارہ جناب مولانا قاضی سراج المصطفی کو بلایا، اور ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ سراج المصطفی! کسی کو فرق نہ سمجھنا، سب ایک ہی سلسلہ کا ہے، تفریق حرام ہے، عبدالسلام ہو یا مجید، جتنے میرے متعلقین ہیں، یہ میرے نہیں بلکہ ہمارے شاہ سید عبدالباری کے ہیں، ایسا ہی نہ کوئی سلام کا نہ منیر کا، چاٹگام سے چلے جاتا ہوں، خوش رہو'۔ (۱)

مجدد الف ثانیؒ کے در پر حاضری:

جہاں تک معلوم ہوا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ جبھی علاقۂ چاٹگام میں تشریف لاتے تھے حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ساتکانویؒ کے قریب رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ بہت سے اسفار میں بھی دونوں بزرگوں کو ایک ہی ساتھ رہنے کا بہت موقع ملتا تھا، ظاہر ہے کہ چاٹگام اور ارکان برصغیر ہندوپاک کی طرح برطانوی قلمرو کے اندر شامل تھے، آمدورفت اور چلنے پھرنے میں آج کل کی طرح کوئی قانونی دشواری نہیں تھی، اس لئے حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ اکثر علاقۂ چاٹگام میں تشریف لاتے تھے۔

حضرت مولانا حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ بھی چاٹگام اور ارکان میں آیا کرتے تھے، اور اسی طرح حضرت کے یہ دونوں اجل خلفاء بھی اعظم گڑھ کی حاضری دیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک دفعہ حضرت سلام اور حضرت مجید رحمہم اللہ تعالیٰ اپنے مرشد کے دربار میں پہنچے، تو مرشد کی جانب سے حکم ملا کہ دونوں سرہند حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس میں حاضری دینے جائیں، تو دونوں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سرہند پہنچے، اور دربار حضرت مجدد الف ثانی میں

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء، ص: ۳۳۰۔۳۳۱۔

حاضری دی، اس واقعہ کی قدرے تفصیلات مولانا عبدالقدوس کی تحریر میں پڑھ لیجئے :

''ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں حضرات سے ارشاد فرمایا کہ عبدالسلام اور مجید دونوں امام ربانی مجدد الف ثانی کے مزار مبارک میں تشریف لے جائیں، حضرت پیر صاحب (مولانا عبدالمجید) ادام اللہ فیضہ نے اس واقعہ کو ہمارے روبرو تذکرہ کرتے ہوئے اس طرح بیان فرمایا کہ ہم لوگ جناب پیر صاحب قبلہ کے ارشاد کے مطابق سفر کے لئے تیاری کررہے تھے، اچانک جناب ارکانی صاحب نے فرمایا کہ دعوت کے بغیر کیوں وہاں جائیں؟ نہیں جائیں گے، کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ دعوت مل گئی ہے، چلئے! اس کے بعد ہم سرہند پہنچے، ایک رات وہاں ٹھہرنے کے بعد حضرت ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، مجھے جو ملنا تھا مل گیا، اب میں دوسرے علاقے میں شریعت وطریقت کی تبلیغی کام کے لئے جاؤں گا، ان کے اس مقولہ کو سننے کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو ملا کیا ہے؟ حضرت ارکانی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ''مجھے پھول کا ایک ہار مل گیا ہے'' حضرت پیر صاحب نے ان سے فرمایا کہ جناب! آپ دوسرے علاقے میں تشریف لے جائیں، میں یہاں رہوں گا، اس کے بعد آپ دوپہر کے وقت امام ربانی کے روضۂ اقدس میں زیارت کرنے کے بعد مراقب ہوئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے ایک روشنی ظاہر ہوئی، اور کچھ دیر کے بعد چلی گئی، حضور فرماتے ہیں کہ روضۂ اقدس کے کرنچ میں دیکھتے ہیں کہ ایک بہشت کی حور بیٹھی ہوئی ہے، جو مسکراتی ہوئی اپنی انگلی سے اشارہ کررہی ہے، مسکراہٹ کے وقت اس کے دانت کی تھوڑی سی چمک ظاہر ہوئی تھی، جس سے سورج کی شعائیں بجھ گئیں، اس کے بعد حضرت قیوم ثانی حضرت محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے جناب پیر صاحب کو مٹھائیاں کھلائیں، حضرت ارکانی صاحب کے دوسرے علاقے سے پھر سرہند تشریف آوری کے بعد حضرت پیر صاحب قبلہ سے خطاب کرکے فرمایا: آپ کو کیا ملا، حضرت مرشدنا نے واقعۂ مذکورہ بیان فرمایا تب ارکانی صاحب نے فرمایا ''ہم تو آپ ہی کے لئے آئے ہیں''۔ (۱)

---

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرارالاولیاء، ص: ۲۱۳ ۔

حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ :

حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ دومرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے شرف سے مشرّف ہوئے تھے، مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حضرت نے پہلا حج کس سن میں کیا اور دوسرا حج کس سن میں، مگر اس کے بعد تیسرا حج کرنے کی بڑی آرزو تھی، لیکن حیات نے یاری نہ کی اور آپ دنیا سے رخصت لے گئے، چنانچہ حضرت کا حقیقی پوتا حافظ جعفرالاسلام صاحب کا کہنا ہے کہ :

''دادا صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی نے دو دومرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینۂ منورہ کی سعادت حاصل کی، مگر سوئے قسمتی سے ہم نے نہ حضرت دادا صاحبؒ سے اور نہ کسی خاندانی بزرگ سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ حضرت نے کس کس سن میں یہ سعادت حاصل کی تھی، مگر یقینی بات ہے کہ دومرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے تھے، البتہ عمر کے آخری سالوں میں اور ایک حج اور زیارت مدینہ منورہ کی آرزو کی تھی، مگر حیات نے یاوری نہ کی اور آپ دنیا سے چلے گئے''۔

حضرت سلامؒ کے وسیع تربیتی حلقے:

حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تعلیمی، تبلیغی اور تربیتی حلقوں کو سرزمین ارکان اور چاٹگام تک محدود نہیں رکھا، آپ کا حلقۂ اثر ان دونوں علاقوں کے علاوہ ہندوستان اور برما کے بعض علاقوں تک وسیع تھا، برما کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ برما کے دورے پر تو کبھی نہیں گئے، لیکن وہاں سے بعض لوگ آپ کے پاس ضرور آئے تھے، چنانچہ ملک برما میں آپ کے بہت سے متعلقین اور ایک سے زیادہ خلفاء بھی موجود تھے، چاٹگام کے علاقے میں حضرت کے ہزاروں مریدان اور بہت سے متعلقین وخلفاء وجود تھے، تاحال ایک دو خلفاء زندگی کے آخری مراحل سے گزررہے ہیں (۱) اور دعوت وارشاد میں سرگرم عمل ہیں۔

---

(۱) یاد رہے کہ زیرنظر معروضات حضرت مولانا عبدالسلام ارکانیؒ پر ۲۰۰۱ء میں لکھے گئے تھے، دراں حالیکہ حضرت مولانا حبیب صاحب سابق پرنسپل مدرسہ حکیمیہ چنونی وخلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی حین حیات تھے، ان کے متعلق اگلی سطور میں کچھ گزارشات آرہی ہیں، اب اس مقالہ کی نظر ثانی ۲۰۱۵ء میں کرنے کی توفیق ہوئی، مگر حبیب صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ (مؤلف)

مولانا عبدالقدوس صاحبؒ کے بیان سے پتہ چلا کہ حضرت مولانا اعظم گڑھ سے سرہند تشریف لے گئے تھے، تو وہاں سے دوسرے علاقوں میں تبلیغ وتعلیم کے لئے گئے تھے، تو ظاہر ہے کہ آپ کے حلقۂ ارادت نہ صرف ارکان اور بنگال تک محدود تھا بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی آپ نے اپنے علم وعرفان سے لوگوں کو محظوظ ہونے کا موقع دیا تھا۔

ادھر میں نے اپنے ایک سے زائد بزرگوں سے سن رکھا کہ حضرت ارکانی صاحب کی زیارت کے لئے ہندوستان سے بہت سے متعلقین آیا کرتے تھے، یہ سلسلہ برما میں جمہوری دور تک جاری رہا تھا، لیکن افسوس ہے کہ بعد میں اس کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا۔

ارکان میں حضرت مولانا کے علاوہ بھی حضرت اعظم گڑھی کے اور چند خلفاء تھے، جب کہ دیگر سلاسل کے بزرگوں کے بھی بہت سے خلفائے کرام پائے جاتے تھے، مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ حضرت کے حین حیات میں حضرت کا مقام اپنے تمام معاصرین پر بہت ہی بلند تھا، ارکان میں حضرت مولانا کے پیر بھائیوں اور مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے درج ذیل خلفائے کرام بھی اپنے فیوض وبرکات اور انوار ہدایات سے بزم عرفان کو منور اور تابناک کر رہے تھے:

(۱) حضرت مولانا مظفر احمد صاحب منگڈو۔

(۲) حضرت مولانا تراب الدین صاحب منگڈو۔

(۳) حضرت مولانا مطیع الرحمن صاحب منی بیل بوسیدنگ۔

(۴) حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندی فرانگ، بوسیدنگ۔

(۵) حضرت مولانا ولی بخش صاحب پندوفرانگ، بوسیدنگ۔

(۶) حضرت مولانا نذیر احمد صاحب بلی بازار، منگڈو۔

(۷) حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مولی فارہ، اکیاب۔

مگر ان تمام پیر بھائیوں کے حلقوں میں بھی آپ کے اثرات بہت ہی نمایاں تھے، یہاں تک پتہ چلا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ جس علاقے میں پہنچتے وہاں کے چاند ستارے دھیمے پڑ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ راقم سطور کور باطن ہے، اسے کیا معلوم قطب اور قطب الاقطاب کا کیا معنی، وہ اس کے مطالب وحقیقت سے بالکل ناواقف اور نابلد ہے، لیکن مولانا کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ قطب الاقطاب تھے، اس کے معانی ومطالب جو کچھ بھی کیوں نہ ہوں، مولانا کی زندگی اور آپ کے حالات سے ظاہر ہے کہ آپ سرزمین ارکان کے افق پر ایک چاند تھے، جب تک اس کا

اجالا رہا تو دوسرے ستاروں کا چمکنا تو کجا بلکہ ٹمٹمانا تک ختم ہوگیا تھا۔

انکشاف احوال :

مولانا کے سامنے لوگ جھوٹ بول نہیں سکتے تھے، بسا اوقات جھوٹ بولنے والوں کی زبانیں گنگ ہوجاتی تھیں، خاص طور پر آپ سے نسبت لینے والوں کے احوال آپ پر منکشف ہوجاتے تھے، اس حوالے سے مولانا عبدالقدوس صاحب ساتکانوی رقم طراز ہیں کہ:

''ایک مرتبہ اعظم گڑھ میں حضرت دادا پیر (حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی) کے ہاں ایک شخص حاضر ہوا، حال دریافت کرنے کے لئے آپ (مولانا عبدالسلامؒ) کو حکم ملا، آپ نے اس شخص کو بلا کر توجہ دی، اور ملاحظہ فرمایا کہ اس کے قلب میں ایک شخص حائل ہے، اور توجہ اثر نہیں کر رہی ہے، نیت کی تبدیلی کے بعد پیر صاحب قبلہ سے تبایا کہ یہ شخص ایک قاتل کا حامی ہے، اور توجہ اثر نہیں کر رہی ہے''۔(۱)

مولانا عبدالقدوس اور ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ :

''ایک دن اور ایک شخص آیا، حکم کے مطابق اس کو بھی توجہ دی گئی، مگر اثر نہیں ہوا تھا، حقیقت معاملہ یوں بتائی گئی کہ اس نے مذاقاً اپنی سالی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا، جس سے اس کے قلب پر داغ پڑ گیا تھا، اور توجہ کا اثر نہیں ہو رہا، اس شخص سے پوچھا گیا تو اس نے اقرار کیا اور واقعہ کی تصدیق کی''۔ (۲)

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے متعلق مذکورہ قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہم نے اپنے بعض بزرگوں سے سنے، الغرض لوگوں کے حالات آپ پر منکشف ہوجاتے تھے، باوجودیکہ آپ اپنے حالات کشفیہ کو چھپانے کی کوشش فرماتے تھے، مگر بسا اوقات پھر بھی ظاہر ہوجاتے تھے، اسی طرح خوارق عادات اور کرامات کے حوالے سے بھی بہت سارے واقعات سننے میں آئے، آپ کی کرامات میں

---

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء، ص:۱۹۱۔

(۲) مولانا عبدالقدوس، اسرار الاولیاء، ص:۱۹۱۔

سے ایک بات ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ جو لوگ آپ پر زبان درازی کرتے اور آپ پر اپنی ناپاک زبانیں رنگانے کی کوشش کرتے، ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں۔

مجھے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے مرید خاص حضرت مرحوم جمال حسین صاحب نائن چونگی نے بتایا ہے کہ:

"سردی کا موسم تھا، حضرت مولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بادبانی کشتی پر سوار ہو کر چاٹگام جا رہے تھے، اب ہم نے دیکھا کہ حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ کشتی پر سوار ایک مجذوب قسم کے آدمی کی طرف شوخین نگاہ سے بار بار دیکھ رہے تھے، کچھ دیر کے بعد حضرت نے اپنے ایک ساتھی مرید خاص سے فرمایا کہ جاؤ اور اس مجذوب نما آدمی کو ایک پیالہ چائے کا دے کے آؤ! حضرت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مرید نے ایک چائے کا بھرا ہوا پیالہ لیا اور جا کے اس مجذوب نما آدمی کو دینا چاہا، اس نے دو ایک مرتبہ انکار کے بعد چائے کا پیالہ ہاتھ لیا اور حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ کے پاس آ کر حضرت کے جسم پر دے مارا، صرف یہی نہیں بلکہ حضرت کو ملامت کرتے ہوئے ایک جگہ جا کر جا بیٹھا، حضرت مولانا اس کی حرکات سے بے زار ہوئے بغیر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے، دو ایک گھنٹہ سفر کے بعد کشتی جب منزل کو پہنچی تو وہ مجذوب جلدی جلدی سے کہیں نکل گئے، بعد میں مولانا سے اس آدمی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ اللہ تعالی کا ایک مقبول بندہ ہے، گم نامی کے پردے سے باہر آنا نہیں چاہتا ہے، میں نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ مجذوب مجھ پر ناراض ہو گئے، چوں کہ وہ ایک برگزیدہ بندہ ہے، اس لئے اس کی اس حرکت پر میں خاموش رہا، اس کے بعد بتایا کہ: ع

ولی را ولی می شناسد

ارکان میں اسلام ہمیشہ رہے گا :

کون نہیں جانتا کہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم اور معصوم روہنگیا مسلمانوں پر عرصۂ دراز سے کیا کچھ بیت رہا ہے، گذشتہ ستر سالوں سے مگھ شر پسندوں اور برمی اوباشوں نے ان مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے، آج کل تو دنیا کی طرف سے اس مسئلہ پر نسل کشی اور جینوسائڈ کا فتوی تک لگ

چکا ہے، ان تمام تفصیلات سے قطع نظر مدّعا پر آتا ہوں کہ حضرت مولانا شاہ صوفی عبد السلام صاحب گودام فاروی ارکانی بھی تو آخر ایک فرد تھے مسلمانان ارکان کے، اور تو اور آپ نے اپنے جسم کی آنکھوں سے ۱۹۴۲ء کا واقعۂ کرب و بلا بھی تو دیکھا تھا، مظالم کے حوالے سے آپ پر بھی طرح طرح کی مصیبتیں آئی تھیں، جن کے سد باب کے لئے خود حضرت مولانا کو بھی بہت ساری کوشش اور جد و جہد کرنی پڑی اور حضرت مولانا کو پریشانیاں برداشت بھی کرنا پڑا تھا، ایسے حالات میں حضرت نے اپنی نور بصیرت جسے فراست یا فراست ایمانی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہاں کے حالات کے پیش نظر چند پیشگوئیاں کی تھیں، جسے ہم المؤمن ینظر بنور اللہ پر محمول کر سکتے ہیں، ان پیش گوئیوں میں سے ایک پیش گوئی محترم جناب حافظ جعفر الاسلام صاحب قائد تحریک آزادی حضرت بی اے جعفر مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ عبد السّلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ جعفر حبیب! یاد رکھنا کہ سرزمین ارکان میں اسلام ان شاء اللہ تعالی ہمیشہ باقی رہے گا، دنیا کی کوئی طاقت یہاں سے اسلام کو ختم نہیں کر سکے گی، یہاں ایک دن اسلام کا ڈنکا بجے گا، اسلام کا پرچم ضرور یہاں لہرائے گا"۔(۱)

چند بڑے علماء کی ایک ساتھ بیعت :

حضرت مولانا عبد القدوس مظاہری، مولانا عقیل احمد قاسمی اور مولانا عبد المتین صاحب ہتالوی رحمہم اللہ تعالی سرزمین ارکان کے بڑے اور عظیم علماء میں سے تھے، جن کی علمی لیاقت و استعداد سے ارکان کے تقریباً ہر صاحب علم و دانش واقف ہیں، جنہوں نے اپنی مظلوم قوم و ملّت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیں، مظالم سہے اور ہجرت تک کی، تینوں آپس میں دوست تھے، تینوں حضرات مولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علوم رتبت سے واقف تھے، انہوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ ہم حضرت ارکانی صاحب

---

(۱) قائد تحریک آزادی حضرت جعفر حبیب علی چنگی، بوسیدنگی مرحوم کو حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ پر بڑی عقیدت تھی، شاید آپ حضرت کے مرید بھی تھے، سنا ہوں کہ قائد صاحب حضرت کی مذکورہ پیش گوئی لوگوں کو بار بار بیان کرتے تھے۔

سے بیعت ہونے چلیں، چنانچہ رخت سفر باندھا اور حضرت کی بستی پہنچ گئے، اس حوالے سے محترم مولانا نعیم حسین کیاکتوی مقیم حال مکہ مکرمہ حضرت مولانا سید حسین صاحب مرحوم ومدفون کیلوار بعۃ عشر جدہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالقدوس مظاہری، مولانا عقیل احمد قاسمی اور مولانا عبدالمتین صاحب مظاہری ہتالوی حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی سے بیعت ہونے کے لئے گودام فارہ پہنچے، موسم برسات کا تھا، انہوں نے حضرت سے ملاقات کی، حضرت مولانا کو حقہ پیتے دیکھ کر ان کے دل میں کچھ خلش سی پیدا ہوگئی تھی، مگر بعد میں ان کو یقین ہوگیا تھا کہ حضرت ارکانی ایک زندہ وتابندہ بزرگ ترین انسان ہیں، پھر انہوں نے حضرت کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی اور سبق ونسبت حاصل کرکے واپس لوٹے''۔

آپ کے تبلیغی وتربیتی حلقے:

یوں تو پوری سرزمین ارکان میں آپ کے مریدان ومتعلقین ومنتسبین ان گنت تھے، لیکن یہاں حضرت کے چند مخصوص تبلیغی وتعلیمی وتربیتی حلقے بھی تھے، جن میں قاضی آباد منگڈو، بلی بازار، نائن چنگ اور اسی طرح جنوبی بوسیدنگ میں علی چنگ اور سندی فرانگ قابل ذکر بستیاں ہیں، اسی طرح شہر اکیاب کی معروف جامع مسجد بھی ان میں شامل ہے، اسی طرح حالیہ بنگلہ دیش کے ارکان سے ملے ہوئے سرحدی علاقہ چاٹگام میں آپ کے ایک سے زائد تبلیغی وتربیتی مراکز تھے، جن میں چنوتی اور ساتکانیہ ناقابل فراموش علاقے ہیں۔

ساتکانیہ شہر میں ''خانقاہ حامدیہ'' کی بنیاد رکھی جو آج کل بھی ماشاء اللہ آباد ہے، ان علاقوں میں آپ نے اپنے سفروں اور تبلیغی دوروں کے ذریعے ہزاروں بندگان خدا کو علم وعرفان کی روشنی سے منور اور تاباں کیا، ویسے ان علاقوں میں آج بھی حضرت کے ہزاروں کی تعداد میں مریدان، منتسبین اور متعلقین پائے جاتے ہیں، چنوتی کے علاقے میں راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آج بھی حضرت کے گن گانے والوں اور نام لینے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، خاص طور پر حضرت مولانا کے نامور خلیفہ حضرت العلامۃ مولانا حبیب احمد چنوتویؒ صاحب کی عرفانی وروحانی جہد مسلسل اور ارشاد وتبلیغ کی وجہ سے آج بھی حضرت مولانا پر جان فدا کرنے والوں کی ایک دنیا آباد ہے۔

بعض کشف وکرامات:

حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف وکرامات وخرق عادات بزرگ تھے، حضرت کی کرامات اور خوارق عادات کے حوالے سے سینکڑوں کہانیاں اور واقعات اب بھی لوگوں کی زبانی سنے جاتے ہیں، جن میں چند واقعات یہ ہیں:

(۱) غالباً ۱۹۴۶ء کا واقعہ تھا کہ پورے ارکان میں وبا پھیلی ہوئی تھی، درایں حالیکہ حضرت مولانا اپنی بستی گودام فارہ میں مقیم تھے، ہر کجا لوگ پریشان حال، سراسیمہ اور ششدر تھے، اور دعاؤں کے لئے آپ کے یہاں لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا تھا، ایک روز آپ نے لوگوں کو تسلّی اور دلاسا دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگو! ویسے سراسیمہ مت ہو، انشاء اللہ ہماری بستی غضب الٰہی سے محفوظ رہے گی، اس سلسلے میں تذکرہ کرتے ہوئے راقم السطور کو ایک بزرگ نے بتایا کہ مذکورہ ارشاد کے دوسرے روز حضرت مولانا مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے، تقریباً رات کا آخری حصہ تھا کہ ہم لوگ حضرت کے پیچھے ذکر وشغل میں مشغول تھے، اچانک اللہ اکبر کی آواز دی اور جلدی جلدی لاٹھی مبارک ہاتھ لئے دوڑتے ہوئے بستی گودام فارہ کی شمالی جانب چل دیئے، اب ہم بھی آپ کے پیچھے ہوئے، دیکھتے ہیں کہ بستی کے بالکل آخری شمالی سرا میں دو خوب صورت لڑکیاں بڑی بنی سنوری دوشیزاؤں کے لباس میں ملبوس بستی میں گھس رہی تھیں، اب حضرت ان دونوں لڑکیوں کے آگے کھڑے ہوگئے، اور ان سے مخاطب ہوکر فرمایا ''تم اس بستی میں داخل نہیں ہوسکتیں''، مگر وہ دونوں بستی میں داخل ہونے کی حد سے زیادہ کوشش کر رہی تھیں، اب مولانا کی طبیعت تیز سی ہوگئی، اور جلال میں آگئے، حتی کہ ان دونوں کو مارتے پھٹتے بستی کی مغربی جانب سے بھگاتے ہوئے بستی کے سمت جنوب میں واقع جو نالہ ہے اس کے پار کر دیئے، اب ہم دیکھتے ہیں دونوں لڑکیاں بڑی اداسی اور مایوسی کی حالت میں جنوب کی طرف جانے لگیں، اس کے بعد مولانا تقریباً آدھے گھنٹے ندی کے پار کھڑے رہے، پھر کسی سے بات چیت کئے بغیر مسجد واپس تشریف لے آئے، اس واقعہ کے دوسرے دن سننے میں آیا کہ مذکورہ ندی کے جنوبی پار میں تھوڑے فاصلے پر مگھوں کی جو بستی تھی، اس میں وبا پھیل گئی، جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے دین ''مگھ'' مر گئے، اور بقیہ مگھ بھاگتے ہوئے جانب مشرق چلے گئے تھے، آج تک یہ بستی پھر سے نہ بسی اور ویران دسنسان پڑی ہوئی ہے، اس کی ویرانی راقم السطور کے سامنے تھی، بعد میں حضرت سے مذکورہ دونوں لڑکیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ دونوں دراصل شیاطین تھیں، ہماری بستی میں وبا پھیلانے آرہی تھیں، جبکہ ایک روایت ایسی بھی ملی کہ مولانا نے مذکورہ سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ

دراصل دونوں لڑکیاں نہ تھیں بلکہ بذات خود وبا تھیں، دوشیزاؤں کی شکل میں بستی گودام فارہ میں گھسنے کی کوشش کی تھیں، بفضلہٖ تعالیٰ بھاگنے پر مجبور ہوگئیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) میرے حقیقی نانا جان مرحوم جناب مفضل احمد صاحب باغگونوی بوسیدنگی (جو حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی کے مرید خاص تھے) کے علاوہ ایک سے زائد حضرات سے یہ واقعہ سنا کہ ۱۹۵۵ء میں ایک رات مجاہدین کی ایک ٹولی جن میں حضرت کے مقام عالی سے نابلد لوگ بھی تھے گشت کرنے کے دوران حضرت مولانا کے مکان میں گھس کر چندے کے مطالبہ کر رہی تھی، ان میں سے دو تین آدمی مکان کے اندر گرجتے ہوئے بڑے غصیلے انداز میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے صاحبزادۂ گرامی حضرت ماسٹر نور الاسلام صاحب (۱) کو تلاش کرتے ہوئے گھس آئے، ظاہر ہے حضرت مولانا گھر کے اندر خود موجود تھے لیکن صاحب زادۂ گرامی مارے خوف کے گھر سے باہر نکل گئے تھے، ہوا یہ کہ یہ تینوں مجاہد لوگ گھر کے اندر گھسے مگر ہزاروں کوشش کے باوجود کسی بھی طرح گھر سے نکل نہیں پا رہے تھے، ان کی آنکھیں آندھی، کان بہرے اور زبانیں گنگ ہوچکی تھیں، بالآخر ان کے پاؤں بھی شل سے ہوگئے تھے، حتی کہ ایسے حالات میں صبح ہوگئی تھی، چنانچہ بقیہ مجاہدین نے ان تینوں کو تلاش تو کیا مگر ناکام اور مایوس ہوکر ان کو چھوڑے پہاڑ کی طرف چلے گئے تھے، اب ان تینوں کو احساس ہوگیا تھا کہ حضرت سے گستاخی اور بے ادبی کے نتیجے میں ان کے ایسے حالات ہوگئے ہیں، اب تینوں حضرت کے قدم پر گڑ پڑے، بے ادبی و گستاخی سے معافی مانگی، حضرت نے بھی ان تینوں کو کچھ نصیحت کرتے ہوئے معاف کر دیا، یوں ان کی گلوخلاصی ہوگئی تھی، کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد مجاہدین حضرات یہاں سے بھی نہیں گزرتے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ جبھی انہیں گودام فارہ آنا پڑتا تھا تو وہ لوگ پہلے آپ سے اجازت چاہتے، اجازت ملتی تو گھستے، ورنہ یہاں آنے اور گھسنے کا خیال تک دل سے نکال دیتے تھے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خواص بندوں سے بے ادبی اور گستاخی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

---

(۱) صاحب زادۂ گرامی ماسٹر نور الاسلام صاحب کی ولادت ۱۹۱۴ء میں گودام فارہ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم خاندان کے مکتب میں پائی، مولانا غلام احمد صاحب سے پڑھے، اردو جماعت چہارم تک پڑھی، جبکہ برمیز جماعت ہفتم تک مگھ بستی کے پگوڈا میں حاصل کی، بڑے جید الفکر اہل اللہ سے لگاؤ رکھنے والے سخی منش تھے، نستعلیقی کیفیت سے زندگی گزارے، مرید تو حضرت مولانا عبد السلام ارکانی کے تھے اور راہ سلوک میں اعلیٰ منزل تک پہنچے، مگر خلافت حضرت مولانا کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی صاحب سے ملی، آپ نے ۱۹۸۹ء میں گودام فارہ میں انتقال فرمایا۔

سماع وغنا سے نفرت :

مولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سماع، غنا اور مزامیر سے حد درجہ متنفر تھے، مولانا کے نامور مرید حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی کیوکتوی کے خلیفہ ومجاز بیعت جناب ماسٹر جمال حسین صاحب مرحوم نائنچونگی رحمۃ اللہ علیہ (۱) نے فرمایا کہ:

> ''ایک روز کا واقعہ تھا، حضرت مرشدنا ومولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قاضی آباد میں ایک صاحب ثروت زمین دار کے گھر میں تشریف فرما تھے، جہاں آپ کے درجنوں مریدان، متعلقین ومنتسبین آپ کے گرد جمع تھے، اچانک ان میں سے حضرت کی نگاہ مبارک صدیق مکرّم جناب ماسٹر حبیب اللہ صاحب قوّال جو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب رامیوبیلی (مجاز بیعت و خلیفہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سیندی فرانگی) کے مرید خاص تھے پر پڑی، حضرت نے پوچھا کہ تم حبیب اللہ ہو؟ جواب ملا کہ حضرت! ناچیز کا نام حبیب اللہ ہے، پھر فرمایا کہ تم کیا ارشاد حسین کو قوالی، غنا وسماع سے محظوظ کرتے ہو؟ اب حبیب اللہ صاحب مارے خوف خاموش ہوگئے، اب حضرت مولانا کھڑے ہوگئے اور حبیب اللہ صاحب سمیت حضرت

---

(۱) حضرت ماسٹر جمال حسین صاحب نائن چنگی کی ولادت تقریباً ۱۹۱۵ء میں شمالی منگڈو کی معروف بستی نائن چنگ میں ہوئی، قاضی آباد والی اردو اسکول سے جماعت چہارم تک اردو کی تعلیم پائی، آپ مولانا ارکانی رحمۃ اللہ کے مرید خاص تھے، لیکن خلافت مولانا نور محمد خنڈ لی کیوکتوی سے ملی، بڑے لائق وفائق اور عاشق رسول ﷺ بزگ تھے، جہاں تک میں نے دیکھا اور میرا ذاتی مطالعہ ہے کہ عاشق صادق ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے، شرافت ونجابت کے پیکر بڑے عابد وزاہد انسان تھے، راقم سطور کو حضرت سے بڑا لگاؤ تھا، ان سے علمی، فکری، روحانی استفادہ بھی کیا تھا، شاعروں میں اقبال اور غالب کے شیدائی تھے، جہاں تک دیکھا کہ آپ ایک بڑے پائے کے صاحب دل انسان تھے، صاحب کشف تو تھے ہی ان سے خرق عادات وکرامات بھی ظاہر ہوئیں، حضرت کے ساتھ بچپن اور تعلیمی زندگی کے دوران مختلف سفر کئے گئے، سفر وحضر میں حضرت یاد الٰہی میں محو رہتے تھے، ہر حال میں زبان ذکر الٰہی سے لبریز رہتی تھی، بڑے نرم دل، نرم مزاج بزرگ تھے، لوگوں کے ساتھ حسن برتاؤ ان کی زندگی کا گویا شیوہ تھا، اخلاق کے پیکر تھے، حضرت نے ۱۹۹۰ء میں انتقال فرمایا اور اپنے گاؤں نائن چنگ میں مدفون ہیں۔

مولانا ارشاد حسین پر برسنے لگے اور گرجتے ہوئے فرمایا کہ:

'' تم جیسے لوگوں کی وجہ سے تصوف وسلوک، تزکیہ واحسان کا طریقہ بدنامی سے دوچار ہورہا ہے، طریقۂ عالیہ مجددیہ میں سماع، غنا، رقص وسرود، قوالی اور مزامیر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، تم اس سلسلے میں شریک ہوکر حرام سے کوئی پرہیز نہیں کرتے ہو''۔

تقریباً نصف گھنٹے تک گرجتے برستے حبیب صاحب کو ملامت کررہے تھے، اب جلال کا حال جمال میں بدل گیا تو حضرت بیٹھ گئے، اور ارشاد ہوا کہ حبیب اللہ تم مجھے ایک شعر بغیر مزامیر کے ایسا سناؤ جیسا تم ارشاد حسین کو سناتے ہو! اب حبیب اللہ صاحب نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی اور کہا :

شعلۂ آہِ رسا سے دائرہ سارا جل گیا
کعبہ میرا جل گیا، بت خانہ میرا جل گیا

اب مصرع ختم ہونا ہی تھا کہ حضرت پر حال طاری ہوگیا، اور گرجتے ہوئے فرمایا کہ حبیب اللہ نے کیا کہا، حبیب اللہ نے کیا کہا؟ اب حبیب اللہ صاحب بھی چھوڑنے والے کب تھے کہ جلتی آگ پر تیل ڈالتے ہوئے مزید چند اشعار پڑھ دیا کہ :

آمدہ بقتل من آں شوخ ستمگارے		ایں طرفہ تماشائی ناکردہ گنہگارے
خواہی کہ شفا باشد بیمار محبت را		اک جرعہ خدارا دے از شربت دیدارے
از لذت دیدارش خسرو چہ تواں گفتم		بے جانم و بے خوابم نادیدرخ یارے
گرنام ونشانے من پرسندہ بگو قاصد		آوارہ بجنونے رسوا سر بازارے

شعر ختم ہوا مگر حضرت کا حال ختم ہونے والا نہ تھا، اسی طرح حضرت تقریباً آدھے گھنٹے تک گرجے، اور ٹہلتے رہے، بالآخر کچھ سکون ہوا تو حضرت بیٹھ گئے تھے۔

اب مجلس میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، پھر حضرت نے حبیب اللہ صاحب کو چند مرتبہ شوخیں نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا کہ حبیب اللہ جیسوں کے لئے شعر بغیر مزامیر کے مباح ہے۔

راقم سطور نے حضرت حبیب اللہ قوال صاحب کے متعلق حضرت ماسٹر جمال حسین صاحب مرحوم نائن چنگی سے بہت ساری باتیں سن رکھی تھیں، ۱۹۸۴ء کا واقعہ تھا کہ ایک روز کوانچی بنگ شمالی منگڈو

کا معروف مدرسہ اشرف العلوم میں جانا ہوا، سن رکھا تھا کہ حضرت حبیب اللہ قوال صاحب اسی مدرسہ میں مدرس ہیں، برمیز اور انگریزی کے استاد ہیں، وہاں پہنچا تو تلاش کی گئی تو آپ مل گئے، رات آپ کا مہمان بنا اور آپ نے مجھے بہت ہی شفقت دی، آپ بڑے دریا دل انسان تھے، صاحب حال، صاحب نسبت وسیع الخیال درویش صفت بزرگ تھے، آپ سے میں نے مذکورہ واقعہ پوچھا تو تفصیل سے بتاتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پائے کے اہل اللہ تھے، ان جیسے بزرگ آج ملتے کہاں ہیں؟۔

شعروشاعری کے متعلق سید العرفاء وقدوۃ الصلحاء حضرت نصر بن محمد بن ابراہیم ابواللیث السمرقندی اپنی معروف تصنیف ''بستان العارفین'' میں فرماتے ہیں کہ '' بعض حضرات نے شعر خوانی کو مکروہ کہا ہے اور بعض نے اس کی اجازت بھی دی ہے''۔

کراہت کی دلیل کے طور پر حضرت سمرقندیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث پیش کی ہے کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی پیٹ کا پیپ اور خون سے بھر جانا اس سے بہتر ہے کہ اس میں شعر بھرا ہوا ہو، نیز ارشاد ربانی ہے کہ:

والشعراء یتبعهم الغاوون۔

امام شعبی فرماتے ہیں کہ لوگ شعر لکھنے سے پہلے بسم الرحمن الرحیم کا لکھنا ناپسند جانتے تھے، مسروقؒ سے منقول ہے کہ وہ کوئی بیت اگر بطور مثال بھی ذکر کرتے تو اس کو کاٹ کر الگ الگ کردیتے، کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میری کتاب میں شعر کا ایک بیت بھی لکھا ہوا مل جائے۔

کثیر بن ہشام کہتے ہیں کہ عبدالکریم سے آیت:

ومن الناس من یشتری لهو الحدیث

کے متعلق سوال ہوا تو فرمانے لگے کہ لہوالحدیث سے مراد گیت (گانا) اور شعر ہے۔

حضرت عطا سے منقول ہے کہ ابلیس نے عرض کیا کہ یا اللہ تو نے مجھے جنت سے آدم کی وجہ سے نکال دیا ہے، اب میری قیام گاہ کونسی ہوگی، فرمایا حمام پھر اس نے کہا میری مجلس کیا ہوگی، فرمایا: بازار، میں نے کہا میری قرأت کیا ہوگی، فرمایا شعر، اس نے کہا میرا جال کیا ہوگا، فرمایا عورتیں، کہا میری گفتگو کیا ہوگی، فرمایا غیبت اور جھوٹ، کہا میری تحریر؟ فرمایا بدن گودنے کی نشانات، اس کے بعد حضرت سمر

قندیؒ نے شعر کے مباح ہونے کی دلیل میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض شعر سراپا حکمت ہوتے ہیں، نیز ہشام بن عروۃ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے کسی عورت ایسی نہیں دیکھی جو شعر میں طب میں لغت میں اور فقہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر ہو۔

بعد ازاں حضرت سمرقندی نے چند روایات بھی نقل کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کسی آیت کی تفسیر جب سمجھ میں نہ آتی ہو تو اشعار میں غور کرلیا کروٗ، کہ شعر عرب کے دیوان ہیں۔

حضرت ابودرداءؓ سے کسی نے کہا کہ آپ کے سوا تمام انصار شعر کہہ لیتے ہیں، فرمایا میں بھی کہہ لیتا ہوں، اور کئی شعر پڑھے۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ابو ہریرہؓ پر رحم فرمائے حضور کا ارشاد ہے کہ کسی کا پیٹ پیپ اور خون سے بھر جانا اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھر جائے، ان اشعار کے متعلق ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو تھی۔

پھر حضرت سمرقندی فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ شعر کے متعلق نہی اس وقت ہے جب کہ اس میں اتنا انہماک ہوجائے کہ قرأت قرآن اور ذکر وغیرہ کی پرواہ نہ رہے، اور اگر یہ صورت نہ ہو تو حرج نہیں ہے۔

پھر حضرت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اشعار کے بارے میں اختلاف علماء کے مابین ہوا ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ سے کوئی شعر منقول ثابت نہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بطور مثال شعر بھی پڑھ لیتے تھے؟ تو آپؓ نے جواب دیا کہ حضور کے نزدیک سب سے مبغوض کلام شعر تھا، ہاں ایک بار آپؐ نے ابن قیس بن طرفہ کے بھائی کا شعر مثال کے طور پر پڑھا تو اس کی ترکیب بدل کر شعر کے آخر حصہ کو اوّل کردیا وہ شعر یہ ہے:

ستبدی لک الأیام ما کنت جاھلاً ÷ و یاتیک بالاخبار من لم تزود

آپ نے دوسرے مصرعہ کو بدل کر **و یاتیک من لم تزود بالأخبار** پڑھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ شعر یوں نہیں ہے، آپ نے جوابًا ارشاد فرمایا کہ میں شاعر نہیں ہوں، اور نہ ہی شعر میری شایانِ شان ہے۔

پھر بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شعر کہنا جائز اور ثابت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آپؐ نے یوم خندق میں یہ شعر پڑھا۔

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ ÷ فارحم الانصار و المھاجرۃ

انصار نے اس شعر کا جواب دیا:

نحن الذین بایعوا محمدا ۔ علی الجھاد ما بقینا ابدًا

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودتے ہوئی کدال ماری اور یہ شعر پڑھا :

بسم اللّٰہ و بہ بدینا ۔ و لو عبدن غیرہ شقینا

پھر براء بن عازب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شعر روایت کرتے ہیں :

انا النبی لا کذب ۔ و انا ابن عبد المطلب

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں چلے جا رہے تھے کہ پاؤں پسل گیا، پتر سے انگلی زخمی ہوکر خون بہنے لگا، اس پر آپؐ نے یہ شعر پڑھا :

ھل انت الا اصبع رمیت ۔ و فی سبیل اللہ ما لقیت

اس بحث کے آخر میں حضرت فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں روایات تو صحیح ہیں، تاہم یہ احتمال باقی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر پڑھنا مقصود نہ تھا، بلکہ بلا قصد موزون ہوکر اشعار کے موافق بن گیا، نیز یہ ابیات جو آپ سے منقول ہیں یہ از قسم رجز ہیں اور رجز کو شعر کہا نہیں جاتا، وہ ایک قسم کی مقفیٰ عبارت ہی ہوتی ہے۔ (۱)

تبحر علمی اور شخصیت کی دلاویزی

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی بڑے متبحر عالم دین، بلند پائے کے مفسر قرآن ومحدث وفقیہ

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: بستان العارفین ابو اللیث السمر قندیؒ، ترجمہ مولانا عبد المجید انور، مع حواشی مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ۔

تھے، رشد و ہدایت، تبلیغ وتلقین کے علاوہ رہ رہ کر اور وہ بھی ضرورت کی حد تک فقہ وفتوی میں بطور اصلاح معاشرہ حصّہ لیا کرتے تھے۔

حضرت کے جمیع بیانات میں زبان کی حلاوت وشیرینی، طرز ادا میں انکسار وتواضع کے ساتھ رشد وہدایت کا رنگ غالب اور نمایاں رہتا تھا، بات کرنے کا انداز منفرد اور دل چسپ ہوتا تھا، جس میں حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ صادقہ نمایاں طور پر نظر آتا تھا، گویا حبّ رسولؐ میں استغراق، اور اطاعت رسولؐ میں انہماک آپ کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا۔

علمی تبحر، خاندانی وجاہت، شخصیت میں جاذبیت، اور طرز حیات میں اتنی دلکش ودلاویزی ہونے کے باوجود بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ حضرت نے نہ اپنے حالات خود قلم بند کئے اور نہ کسی کو لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، غرض آداب واطوار، زہد وورع، قناعت وتوکل، فہم وفراست، انابت ودیانت علمی لیاقت وعرفانی استعداد اور کتاب وسنت کے ذوق عملی کی حیثیت سے آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں اس پورے علاقے کے گل سر سبد تھے۔

فقہ وفتاوی کے حوالے سے بعض مسائل اور وہ بھی معرکۃ الآراء میں اختلاف کرنے والے حضرات علماء وفقہا کے مابین حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حکم ہوا کرتے تھے، حضرت مولانا مظہر الحق صاحب بانگلونوی بوسیدنگی مرحوم جن کا تذکرہ راقم السطور کی مخطوطہ ''سرزمین ارکان کے درخشاں ستارے'' کی زینت بنا ہوا ہے، ایک بڑے عالم دین، اور فقیہ تھے، وہ بھی مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل تھے، ان کا بیان ہے کہ:

میرے ہم عصروں میں پورے علاقۂ بوسیدنگ میں صرف دو تبحر عالم دین ہیں، ان میں سے ایک حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فوئما لوی، جب کہ دوسرے حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی ہیں، مولانا ارکانی افسوس ہے کہ آج ہمارے مابین نہیں ہیں، اللہ تعالی مولانا سلطان احمد کی حیات میں برکت دے، آمین''۔

مولانا مظہر الحق صاحب جید عالم دین ہونے کے علاوہ بھی کوچہ طریقت کے سالک تھے، مگر کم

لوگوں کے معترف تھے، مزاج ایسا تھا کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں تک کو نمایاں ہونے نہیں دیتے تھے، مگر ایسے محتاط انسان بھی ان مذکورہ دونوں بزرگوں کے معترف تھے، ان کا اعتراف اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی صاحب نہ صرف کوچۂ طریقت کے منتہی تھے بلکہ راہ شریعت کے رمز شناس بھی۔

مولانا کے سامنے وقت کے بڑے بڑے جید علماء، فقہ وفتاوی کے شہسواران بھی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، اسرار شریعت پر مہارت تامہ اور طریقت وسلوک کی رمز شناسی کے حوالے سے حضرت کی ذات وشخصیت علاقہ بھر میں نمایاں اور معروف تھی، قرآن وسنت کی ایسی ایسی تشریح فرماتے تھے کہ مفسرین ومحدثین آپ کی تشریحات پر متحیّر ہوجاتے تھے، اس حوالے سے مولانا عبدالقدوس صاحب نے بہت خوب لکھا ہے، ان کے بیانات سے چند اقتباسات ناظرین کرام کی خدمت میں حاضر ہیں:

''ایک مرتبہ چاندگاؤں (چاٹگام) میں (حضرت مولانا عبدالسلام ارکانیؒ) مدعو ہوئے، وہاں اپنے خلیفہ جناب مفضل الرحمن صاحب کی زیارت کی، اور راقم الحروف سے دریافت فرمایا کہ **ربنا ظلمنا انفسنا الخ** جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا، حالانکہ توبہ کرنے والا ایک ہے، جواب عرض کیا کہ مقام تعلیم ہے، اور اس سے غیر وغیب کے حق میں دعا قبول ہوتی ہے، کیونکہ صیغہ جمع علامت ہے قبولیت دعا کی، اور بھی بہت سی تاویلات پیش کیں، آپ نے فرمایا ایسی توخیر کتابوں میں تحریر کی گئی ہے، لیکن یہاں اعضاء وجوارح مقصود ہیں، جیسے ہاتھ پاؤں، ناک کان اور آنکھ وغیرہ، یعنی اعضائے جسمانیہ سمیت توبہ کرنا مراد ہے''۔ (۱)

مولانا عبدالقدوس صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس کے بعد مزید سوال کیا گیا کہ قلب کو قلب کیوں کہا جاتا ہے! حاضرین میں سے کسی نے جواب نہیں دیا، بالآخر اس کے جواب میں آپ نے دونوں ہاتھوں کو دراز کیا اور فرمایا کہ قلب جسم کے بالکل بیچ میں ہے اس لئے اسے قلب کہا جاتا ہے، اس سے آپ کی تبحر

---

(۱) مولانا عبدالقدوس اسرار الاولیاء، ص: ۱۹۱۔ ۱۹۲۔

علمی اور باریک بینی کا پتہ چلتا ہے'' (۱)

مولانا بحیثیت واعظ ومبلغ :

حضرت ماسٹر جمال حسین صاحب نائن چنگی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ:

''حضرت مولانا شاہ عبد السّلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ رہ رہ کر پند و نصیحت بھی کیا کرتے تھے، مگر بہت کم، ان کے مواعظ حسنہ وعرفانیہ عام لوگوں پر عموما اور بطور خاص مریدین اور متعلقین کے دلوں پر خصوصا بجلی کی طرح اثر کر جاتے تھے، دلوں کو گرماتے اور روحوں کو تڑپا دیتے تھے، ان کے مواعظ عرفانیہ کے اثرات مدتوں گزر جانے کے باوجود دلوں میں تازہ رہ جاتے تھے، مواعظ کے مضامین بڑے دل نشین اور لوگوں کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہوا کرتے تھے، پھر جس وقت جس ماحول میں جو بیماریاں علی العموم پھیلی ہوئی ہوتی تھیں، ان کے خلاف حضرت مولانا کی زبان تند و تیز ہوا کرتی تھی، ہر قسم کی ناروا حرکات اور خلاف شرع کاموں اور غلط معتقدات کے خلاف ان کے یہ مواعظ ہوا کرتے تھے، ان کے علاوہ ایک بات یہ ہوتی تھی کہ متعلقین ومریدان جو محفل میں شریک ہوتے وہ مولانا رحمۃ اللہ کے پند ونصائح سے اپنے مجروح دلوں کے مرہم پاتے، اور اپنے اندر پائی جانے والی روحانی بیماریوں کی دوا پاتے، ساتھ ہی ساتھ ان سے بعض پیچیدہ سوالات کے جوابات بھی پا جاتے تھے، زبان کی حلاوت کے ساتھ ساتھ ان کے مواعظ حسنہ میں بڑی دل کشی بھی ہوتی تھی، عام طور پر مضامین توحید خالص اور اخلاق حمیدہ پر مشتمل ہوتے، لوگوں کو ایمان کی تجدید کرانے اور لوگوں کو دینی، ایمانی اور روحانی ذمے داریوں کا احساس دلاتے تھے، آپ کے مواعظ دلوں میں ایمان وایقان بھرتے اور ان سے ایک قسم کی روحانی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی، افسردہ اور مردہ دلوں میں محبت واخلاص کے ساتھ ایک خاص قسم کی رعنائی اور

(۱) مولانا عبد القدوس، اسرار الاولیاء، ص:۱۹۱۔۱۹۲۔

تازگی پیدا ہوجاتی تھی، امراض باطنیہ اور روحانی علاج کے لئے آپ کے مواعظ حسنہ اکسیر اعظم کا کام دیتے تھے''۔

مقبولیت ورجوع عام :

حضرت مولانا شاہ صوفی عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ سرزمین بنگال اور ارکان میں اپنے زمانے میں محفل عرفانی وروحانی کے نقوش رفتہ تھے، خصوصی طور پر ملت ارکانیہ اسلامیہ کے کے دینی اور روحانی ماحول میں آپ کو انفرادیت کا درجہ حاصل رہا تھا، چاٹگام اور ارکان کے دینی اور روحانی حلقوں میں حضرت کی مقبولیت ہنوز بھی باقی ہے، جس کا بین ثبوت چنوتی اور ساتکانیہ میں سورج کی طرح عیاں دیکھا جاسکتا ہے، غرض آپ کی جلوتیں مخلوق خدا کی رشد وہدایت میں بسر ہوتیں تو خلوتین اور شبانہ روز کی محنتیں اپنے خالق کی بندگی اور راز ونیاز کی عبادت گزاری، اذکار واوراد ومشاغل اور مراقبے میں صرف ہوتی تھیں، ان ساری چیزوں کے علی الرغم آپ کی شخصیت کا اصلی جوہر اور حقیقی اظہار آپ کی دینی اور روحانی سرگرمیوں میں ہے۔

حضرت مرحوم جمال حسین صاحب نائن چنگی نے فرمایا کہ:

''حضرت مولانا شاہ صوفی عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری دور میں خاص طور پر ارکان میں رجوع عام کا دور دورہ ہوگیا تھا، لوگوں کو حضرت مولانا کے ساتھ والہانہ محبت وعقیدت ہوگئی تھی، حضرت ایک جگہ سے دوسری جگہ تشریف لے جاتے تو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بندگان خدا آپ کے پیچھے ہوجاتے تھے، کبھی کبھار اہل طلب کا ہجوم بھی ہوجاتا تھا، آپ اپنے تبلیغی و اصلاحی دوروں اور تبلیغی سفروں میں جہاں کہیں بھی جاتے لوگ والہانہ وعقیدت مندانہ طور پر حضرت کے ارد گرد جمع ہوجاتے تھے، اور جو جمع ہوتے ان کی اکثریت شرف بیعت سے مشرف ہوتی تھی، آپ کا اخلاق ایسا تھا کہ رجوع کرنے والوں کو کبھی بھی محروم نہیں کئے جاتے تھے، اور جو بھی قریب آتے، اسے اپنے سینے سے لگا لیتے تھے، ویسے بھی مولانا کا دامن شفقت بڑا وسیع تھا''۔

آخری علالت :

درج ذیل میں حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرض موت، اور وفات حسرت آیات کے حوالے سے چند روایات نقل کر دیتا ہوں:

(۱) چنوتی میں حضرت مولانا کے چند متعلقین نے راقم سطور کو بتایا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ انتقال کے کچھ دن پہلے چاٹگام میڈیکل ہسپتال میں زیر علاج رہے، پھر وطن واپس چلے گئے تھے، انتقال کے چند مہینے پہلے حضرت کے اندرونی حالات میں بڑی تبدیلی آئی تھی، سرود و مستی کی سی حالت و کیفیت طاری رہتی تھی، بعض احوال ظاہر ہو رہے تھے، زبان مبارک سے ایسے ایسے فقرے نکل رہے تھے جو اپنے جلو میں حقائق و معارف کی ایک ایک دنیا سمائی تھی، حضرت مولانا کے طرز عمل سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ دنیا وفیہا سے بے زار اور محبوب حقیقی کے لقاء کے مشتاق ہو چکے ہیں، بڑے منتظر سے معلوم ہو رہے تھے، چہرۂ مبارک آفتاب و ماہتات کی طرح درخشاں ہو گیا تھا، ایک قسم کی محویت و کیفیت کے ساتھ آپ میں حال و استغراق کی شان نمایاں ہو چکی تھی۔

(۲) حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی کا حقیقی پوتا مکرمی جناب حافظ جعفر الاسلام بن نور الاسلام صاحب کا بیان ہے کہ:

''حضرت دادا مرحوم مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیشاب کی لائن میں آپریشن ہوا تھا، مرض موت کے حالات میں حضرت مولانا برتن میں پیشاب کرتے تھے، ساگ تناول فرمانے سے پیشاب کے مرض میں اضافہ ہو جاتا تھا، وقت رحلت قریب آیا تو اپنوں کو دیکھتے تو بیزاری کی حالت میں ادھر ادھر کی باتیں بکتے تھے، گویا یہ سارے اپنے حضرت کے دشمن ہو گئے ہیں، لال چائے کے عادی تھے تو مرض وفات میں لال چائے کی فرمائش کیا کرتے تھے، وفات سے پہلے ایک روز کا واقعہ ہے کہ میری والدہ محترمہ حضرت کے پاس آئی تو فرمانے لگے کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ اتنے لوگ ہمارے یہاں آئے اور تم ان کے سامنے آ گئی ہو، تو ظاہر ہو رہا تھا کہ حضرت کے استقبال کے لئے اولیاء کبار حضرت کے یہاں آئے ہوئے ہیں، وفات حسرت آیات کی صبح حضرت نے

فرمایا کہ ''میرا کپڑا بدل دو'' اور حضرت مولانا پالنگ سے اتر گئے، حضرت کی شدت علالت کی خبر عام ہوئی تو مدرسہ اشاعت العلوم سندی پرانگ میں ختم تہلیل ہو رہا تھا، حضرت نے آخری وقت میں میرے کاندے پر ہاتھ رکھا اور کچھ فرما رہے تھے، مگر زبان سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، حضرت مولانا عبدالمجید صاحب (مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، عارف باللہ اور سوز دروں کے مالک واعظ بزرگ تھے، مثنوی معنوی کے حافظ سمجھے جاتے تھے، آپ کے دو صاحب زادے حضرت مولانا حافظ مقبول احمد اور حافظ محی الدین صاحبان بھی قابل قدر عالم دین تھے) حضرت کے سرہانے پر بیٹھے بیٹھے کلمۂ توحید کا ورد کر رہے تھے، سکرات سے کچھ وقت پہلے میرے والد مرحوم حضرت نور الاسلام صاحب نے حضرت سے پوچھا کہ آپ کے بعد تعلیم کس سے حاصل کروں؟ جواب ملا مگر کچھ تامل کے بعد کہ مولانا نور محمد خنڈلی اور مولانا حبیب چنوتوی سے میرے بعد تعلیم حاصل کرو، اس کے بعد حضرت والد صاحب نے پوچھا کہ قبر مبارک کہاں دی جائے؟ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میری زمینداری کے احاطے میں جو پہاڑ ہے وہاں دینا، مگر کچھ تامل کے بعد فرمایا کہ مسجد کے پاس قبر دی جائے، اس کے بعد کوئی سوال و جواب نہ ہو سکا، اب وقت سکرات قریب آ گیا تھا، ایسے حالات میں دونوں آنکھوں سے تھوڑے پانی نکلے، آپ کی زبان مبارک سے اللہ اللہ کی حرکت محسوس ہو رہی تھی، ایسی حالت میں حضرت اللہ کو پیارے ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون''۔

(۳) مکرمی جناب جعفر الاسلام بن نور الاسلام نے بتایا کہ:

''دادا جان حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ جب چاٹگام میڈیکل ہسپتال میں زیر علاج تھے، اسی دوران حضرت محمد جعفر حبیب رحمۃ اللہ علیہ (صدر روہنگیا فدائین محاذ (RPF) حضرت کی عیادت کرنے ہسپتال گئے تھے، آپ نے ڈاکٹروں سے حضرت کے حالات پوچھے تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہم نے جہاں تک ممکن ہو سکا آپ کی تشخیص و معالجہ کیا، لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت کا ویسا کوئی مرض نہیں ہے، الّا یہ کہ ان کا پورا جسم مبارک اللہ اللہ کا ورد اور ذکر الٰہی میں مشغول ہے، یہ مجھے خود حضرت محمد جعفر حبیبؒ نے بتایا ہے''۔

وفات حسرت آیات :

حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے سن پیدائش کے متعلق کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سن پیدائش ۱۸۹۱ء ہے اور سن وفات تو معلوم ہے کہ ۱۷/جون ۱۹۶۸ء روز دوشنبہ ہے، اس حساب سے حضرت کی عمر شریف ستہتر سال (۷۷) سال بنتی ہے، لیکن حضرت مولانا کا حقیقی پوتا جناب مکرمی حافظ جعفرالاسلام صاحب کا بیان ہے کہ:

”حضرت دادا جان مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بیاسی یا تراسی سال کی عمر پائی، اور ظاہر ہے کہ حضرت کی وفات ۱۹۶۸ء میں ہوئی، اس حساب سے حضرت مولانا کا سن پیدائش ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۵ء بنتا ہے“۔

حضرت مولانا کی وفات حسرت آیات پر خانقاہ حامدیہ ساتکانیہ کی دیوار میں ایک قصیدہ ملا ہے، اور یہ قصیدہ خوبخو حضرت کے مرقد مبارک کے سرہانے پر پتھری لوحہ میں بھی ملا ہے، جو حاضر خدمت ہے:

مکین جنت است ہم راز رضواں

شہ عبد السلام بحر عر فا ں

بسال ہشت وشست وصدنوردو ÷ ہفدہ ۱۷ جون دوشنبہ یقیں داں

سن ہشتادوہشت صدسیزدہ بستم ÷ ربیع الاولین شد وصل جاناں

مبارک شہید انوار عر فا ن ÷ مدار طا لبا نِ قرب رحماں

نور دہ پنج و شش در ازماں ÷ اساس خا نقاہ حا مدی داں

خوشا ایں منزل تدریس قرآں ÷ حماہا اللہ از آفات دوراں

سلامیہ شد نامش کہ نبیاں ÷ شدہ عبد السلام بحر عرفاں

نگاہ کیمیا انداخت ہر آں ÷ بریں عبد المجید مہر تا ہا ں

خانقاہِ حامدیہ سلامیہ ساتکانیہ:

خانقاہ حامدیہ سلامیہ اور اس کے ملحق مدرسہ فرقانیہ اسلامیہ کی سنگ بنیاد حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی، آپ کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد پڑی تھی، الحمدللہ

تعالی یہ خانقاہ اور ملحق مدرسہ بڑے آب وتاب سے چل رہا ہے، جس کے متعلق مولانا عبدالقدوس صاحب ساتکانوی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

”ساتکانیہ حامدیہ سلامیہ مجیدیہ خانقاہ شریف جس کا خادم الحاج فقیر صدیق احمد صاحب ہیں، یہ پہلے ایک معمولی قسم کا گھر تھا، ایک دن آگ سے جل کر راگ ہوگیا تھا، آج وہ پختہ دومنزلہ مسجد کے ساتھ فرقانیہ مدرسہ کی شکل میں قائم ہے، اس خانقاہ کی اطراف میں باغ باغیچہ اور یہ دوسرے سب سروسامان سے بھری پڑی ہے، لوگ وہاں نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں آرام محسوس کرتے ہیں، ہر سال یہاں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے، جس میں حضرات علمائے کرام مختلف مضامین پر تقریریں کرتے ہیں، اور حضرات اولیائے کرام حاضر ہوتے ہیں، فقیر موصوف کو حضرت مرشدنا مدظلہ العالی نے اس خانقاہ شریف کا خادم مقرر فرمایا، اور حضرت اول صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے ان کو مبارک باددی، کیوں کہ خانقاہ شریف کے متعلق ان کو مختلف مصیبتیں اٹھانی پڑیں، یہ حضرت پیر صاحب قبلہ اور حضرت ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیش گوئی ہے، جناب حاجی نورالحق صاحب بھی اس خانقاہ شریف کے پرخلوص خدمت میں مصروف ہیں“۔ (۱)

حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھیں، اور چار بیٹیاں دو بیٹے تھے، سلسلۂ نسب کے آخری حصہ سمیت مختصر طور پر درج ذیل شجرہ میں آپ کی اولاد کے اسمائے گرامی حاضر خدمت ہیں:

عبدالعلیؒ

حضرت احمد علیؒ (معروف بہ پانچکری سوداگر)

حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) ماسٹر نورالاسلامؒ۔

(۲) ماسٹر حمیدالاسلام مرحوم۔

---

(۱) مولانا عبدالقدوس، اسرارالاولیاء، ص:۱۹۱۔۱۹۲۔

(۳) محمودہ۔

(۴) سیدہ۔

(۵) فاطمہ۔

(۶) سالمہ۔

اولادو :

(۱) حضرت محترم ماسٹر نورالاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا کی بڑی بیوی کے بطن سے تھے، بڑے پائے کے بزرگ اور سخی انسان تھے، انہوں نے حضرت مولانا سے طریقت کے منازل طے فرمائے، اور حضرت کی وفات کے قبل پوچھا کہ آپ کی وفات کے بعد کس بزرگ سے تعلیم حاصل کروں گا؟ جواب ملا تھا کہ ارکان میں مولانا نور محمد خنڈ لی کیوکتوی اور چاٹگام میں مولانا حبیب احمد صاحب چنوتوی سے مزید تعلیم حاصل کرو! چنانچہ حضرت مولانا کے انتقال کے بعد نور الاسلام صاحبؒ نے حضرت مولانا نور محمد خنڈ لیؒ سے رجوع کیا، بالآخر ان سے خلافت پائی، میں نے حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ سے ایک موقع پر پوچھا کہ کیا ارکانی صاحب کے انتقال کے بعد کبھی نور الاسلام صاحب آپ کے یہاں آئے تھے، تو آپ نے ہاں میں جواب دیا تھا۔

(۲) جناب مرحوم ماسٹر حمید الاسلام صاحب حضرت کے دوسرے نرینہ بیٹے تھے، انہوں نے بھی حضرت سے تربیت پائی، اور منازل سلوک طے بھی کئے، بڑے آن بان کے آدمی تھے، سخی اور خدمت خلق کے حوالے سے علاقہ بھر میں معروف تھے، اللہ تعالی ان کو بخش دیں، آمین۔

(۳) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صاحب زادی محترمہ محمودہ کی شادی حضرت مولانا سکندر صاحب رائی شنگ فاروی/ سندی فرانگی سے ہوئی، مولانا راقم سطور کے اساتذہ میں شامل ہیں، بڑے پائے کے عالم دین تھے، تادم حیات مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ کے مدرس رہے تھے، بڑے آن بان کے بزرگ ترین عالم دین اور درویش صفت انسان تھے۔

(۴) حضرت مولانا کی صاحب زادی محترمہ فاطمہ کا نکاح جناب مظفر احمد رنگیا دنگی بوسیدنگی سے ہوا، ان کے متعلق زیادہ معلومات نہیں حاصل ہوئیں۔

(۵) حضرت کی صاحب زادی سیدہ کا نکاح جناب مرحوم عبدالحمید صاحب رواسوگری سندی فرانگی

سے ہوا، عبدالحمید صاحب اس علاقے کے زمیندار، حکمران اور صاحب دولت وثروت انسان تھے، فیاض بھی تھے اور خلق خدا سے محبت کرنے والے بھی۔

(۶) محترمہ سالمہ کا نکاح سرزمین کے ارکان کے دور آخر کے ایک جید عالم دین، حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین علی صاحب دابری چنگی بوسیدنگی رحمۃ اللہ سے ہوا، حضرت مولانا حسین علی صاحب مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ کے فارغ التحصیل اور وہاں کے مدرس اعلی تھے، آپ نے حضرت مولانا شیخ الحدیث عبدالسبحان گراخالوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھرپور استفادہ کیا، اور ان کے بعد حضرت علامہ مولانا شیخ الحدیث سید الامین منگنماوی سے بھی، بعد میں حضرت مولانا حسین علی صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ آئے، وہاں کے مہتمم اور شیخ الحدیث بھی رہے، چند مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے، ان سے راقم سطور کی چند مرتبہ ملاقاتیں تھیں، جن میں ایک مرتبہ ڈھاکہ بنگلادیش میں حضرت مولانا شاہ مظفر احمد (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) اور حضرت العلامہ مولانا سید الامین صاحب کی معیت میں رہی، بعد ازاں سرزمین مقدس مکہ المکرمۃ میں چند مرتبہ اور ملاقاتیں رہیں، مولانا بڑے پائے کے عالم دین، محدث، مفسر، فقیہ، کلامی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے پاکیزہ صفت انسان اور عابد وزاہد تھے، علم النحو والصرف میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، طلبائے مدارس دینیہ نے ان سے بہت ہی استفادہ کیا تھا، انہوں نے ۲۰۰۷ء میں انتقال فرمایا، اللہ تعالی ان کے مرتبہ کو بلند کرے، آمین۔

چند نامور خلفائے کرام :

پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ ارکان اور بنگال کے علاوہ برصغیر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی ایک سے زیادہ تبلیغی سفر کر چکے تھے، بعض حضرات کا بیان ہے کہ حضرت کے ایک سے زیادہ خلفاء ہندوستان میں بھی تھے، مگر اس حوالہ سے حتمی طور پر کوئی پتہ نہ چل سکا۔

ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب اور منگڈو، بوسیدنگ، راسیدنگ کیاکتو کے علاوہ چاٹگام کے علاقوں

میں آپ کے بے شمار مریدین، منتسبین اور متعلقین آج بھی ماشاء اللہ پائے جاتے ہیں، جہاں تک آپ کے خلفاء کا تعلق ہے، ارکان میں نور محمد صاحب خنڈ لی کیوکتویؒ، جب کہ چاٹگام میں حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ کے علاوہ حضرت مولانا محمد حضر صاحب پکویؒ اور حضرت مولانا شفیق احمد صاحب چنوتویؒ بڑے شہرت کے حامل بزرگان دین تھے، کہتے ہیں کہ ان حضرات کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے چند خلفاء تھے، مگر سر دست ان پر مزید معلومات حاصل نہ ہوسکیں، حضرت کے خلفاء میں حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لیؒ اور حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ نے آپ کے سلسلہ کو بہت رونق بخشا، اللہ تعالی ان دونوں بزرگوں کے مراتب بلند کریں۔ آمین۔

حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ :

حضرت العلامہ مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ سابق پرنسپل مدرسہ حکیمیہ عالیہ چنوتی ایک عالم، فاضل، فقیہ، کامل بزرگ ترین انسان تھے، آپ حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل اور نامور خلیفہ تھے، حضرت سے راقم السطور کو چند مرتبہ ملاقات کی توفیق ہوئی، آپ کو ایک صاحب دل، صاحب نظر، داعی و مرشد برحق پایا، تبلیغ دین اور ارشاد کے حوالے سے آپ کی مساعی جمیلہ انشاء اللہ زندہ جاوید رہے گی، آپ صاحب ثروت تھے مگر سخی و کریم، اسی طرح شرافت ونجابت کے حوالے سے آپ سلف صالحین کے ایک زندہ نمونہ تھے۔

راقم سطور نے حضرت مولانا حبیب صاحب کے سامنے اپنی دیرینہ آرزو ظاہر کی تھی کہ وہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ پر قلم اٹھانا چاہتا ہے، تو حضرت نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا، یوں اس نے بڑی کوشش اور پیہم تگ و دو کے بعد حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ پر ایک مقالہ زیر قرطاس کر کے حضرت مولانا کے سامنے پیش کیا تو حضرت نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھایا اور اسے چوما، اور راقم کو دعائیں دیں، پھر فرمایا کہ رات کو میں اس پر نظر ڈالوں گا، پھر اگلے دن مقالہ پر بعض ہلکے سے ملاحظات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ آپ کو حضرت ارکانی صاحب پر تفصیل سے لکھنے کی توفیق دے، اور تم اسے تیار کرلو، انشاء اللہ طباعت کی ساری ذمے داری میری ہوگی، مگر افسوس ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی، اور حضرت مولانا اللہ تعالی کو پیارے ہوگئے۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لیؒ

خاندانِ سید الاول اور خاندان مولوی عبد الکریم شجاع قاضی کے چشم و چراغ حضرت مولانا شاہ نور محمد صاحب خنڈ لی کا سلسلہ نسب باپ کی جانب سے سرزمین ارکان کے عظیم قومی وتاریخی شاعر حضرت شاہ صوفی الاول رحمۃ اللہ سے ملتا ہے، جب کہ ماں کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب ارکان کے اور ایک نامور شاعر، تاجر اور سیاست دان مولوی عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی مرحوم سے جاملتا ہے۔

شیخ طریقت مولانا نور محمد صاحب کی پیدائش کیوکتو کے معروف ومردم خیز قصبہ خنڈل میں ہوئی، باپ کی جانب سے سلسلۂ نسب یہ ہے:

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی بن حضرت علامہ جناب مولانا محمد بدیع الرحمن بن مولانا عبد الباری الخطیب بن مولانا عبد اللہ الامام بن مولانا محمد ناہیک امام بن حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق بن قطب زمان شاعر ارکان حضرت سید الاول رحمۃ اللہ علیہ۔

ماں کی جانب سے خنڈ لی صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی بن بی بی نور عین (زوجۂ حضرت علامہ مولانا بدیع الرحمن صاحب) بنت عظیم الدین کیونگ بن اعلی حضرت نواب مولوی عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی مرحوم۔

مولانا خنڈ لی صاحب کی تعلیم وتربیت اپنے علاقے کے بعد ارکان کی دیگر دینی درسگاہوں میں ہوئی، تعلیم سے فراغت کے معا بعد (ایک روایت کے مطابق دوران تعلیم) آپ نے حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی گودام فاروی (خلیفۂ اجل حضرت مولانا حافظ شاہ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ) کے ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت کی اور طویل مجاہدہ وریاضت کے بعد آپ کو خرقۂ خلافت واجازت سے نوازا گیا تھا۔

مولانا نور محمد خنڈ لی صاحب خاندانی طور پر صاحب ثروت بزرگ تھے، اللہ تعالی نے آپ کو باطنی نعمت کے ساتھ ظاہری دولت سے بھی نوازا، آپ بڑے سخی وشریف اور خادم ملت وقوم انسان ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔

یوں تو حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی کے بہتوں خلفاء تھے، جنہوں نے بھی اپنے مرشد کامل کی طرح دین کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، جن میں سے چند نامور خلفاء یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا شفیق احمد صاحب چنوتوی۔

(۲) حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب بانسکھالوی۔

(۳) حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قطب دیاوی۔

(۴) حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب ارکانی/نہلوی۔

(۵) حضرت مولانا سیف الدین صاحب صدیقی چنوتوی۔

(۶) حضرت مولانا محمد خضر صاحب پکوی، چکریا۔

(۷) حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتوی۔

(۸) حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈلی ارکانی۔

(۹) حضرت مولانا رشید احمد صاحب، ساک فورا، بوال خالوی۔

(۱۰) حضرت مولانا مفضل الرحمن صاحب چاندگاؤں، چاٹگامی۔

(۱۱) حضرت مولانا عبد القدوس صاحب چنوتوی۔

(۱۲) حضرت مولانا عبد الغنی صاحب نائکان چری۔

(۱۳) صوفی صدیق احمد صاحب، سانکانوی۔

(۱۴) حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب، تیزگاؤں، ڈھاکہ۔

لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی کے ان متذکرہ اور غیر متذکرہ تمام خلفائے کرام میں دو خلفاء زیادہ نامور تھے، جن میں ایک مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ جب کہ دوسرا حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈلی رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا ارکانی صاحب کے پوتے صدیق مکرم حافظ جعفر الاسلام صاحب (مرحوم) کا بیان ہے کہ حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ مولانا نور محمد صاحب کے گھر خنڈل میں چند مرتبہ تشریف لے گئے تھے، جہاں بہت سارے لوگ حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مولانا ارکانی کے زمانے سے مولانا نور محمد صاحب کی فتوحات شروع ہو چکی تھیں، بعد میں ان میں بڑی وسعت

ہوئی، ارکان اور برما خصوصاً رنگون کے علاقوں میں آپ کی بڑی شہرت رہی تھی، جہاں آپ کے ہزروں متعلقین ومنتسبین کے علاوہ درجنوں خلفائے کرام تھے اور ہیں۔

شمالی منگڈو میں حضرت مولانا خنڈلی صاحبؒ کے نامور خلفاء میں حضرت شیخ جمال حسین نائن چنگی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو گذشتہ صدی کی نویں دہائی میں انتقال کر کے اپنی آبائی بستی کی خاندانی قبرستان میں مدفون ہیں۔(۱)

مولانا خنڈلی صاحب شمالی ارکان کے علاقہ جات میں گاہِ گاہِ تشریف لاتے تھے، چنانچہ بستی نائن چنگ، قاضی آباد اور بلی بازار وغیرہ علاقہ جات میں آپ کے انگنت متعلقین تھے، اور اب بھی ہیں، جن میں میری نظر میں حضرت مولانا محمد انور ندوی مرحوم ناقابل فراموش ہیں۔

حضرت مولانا خنڈلی صاحب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے۔ اور آخری حج کے دوران آپ کا انتقال مدینۃ الرسولؐ میں ہو کر بقیع میں مدفون ہوئے۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب کو بہت ساری اولاد سے نوازا، بالترتیب ان کے اسمائے گرامیاں یہ ہیں:

---

(۱) حضرت شیخ جمال حسین صاحب نائن چنگی کی ولادت تقریباً ۱۹۱۵ء میں شمالی منگڈو کی معروف بستی نائچونگ میں ہوئی، قاضی آباد والے اردو اسکول سے ساتویں جماعت تک اردو کی تعلیم پائی، آپ مولانا ارکانی رحمۃ اللہ کے مرید خاص تھے، لیکن آپ کو خلافت مولانا نور محمد خنڈلی کیوکتوی سے ملی تھی، بڑے لائق وفائق اور عاشق رسولؐ انسان تھے، جہاں تک میں نے دیکھا اور میرا ذاتی مطالعہ ہے کہ عاشق صادق ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے، شرافت ونجابت کے پیکر بڑے عابد وزاہد انسان تھے، راقم سطور کو حضرت سے بڑا لگاؤ تھا، ان سے علمی، فکری، روحانی استفادہ بھی کیا تھا، شاعروں میں اقبال اور غالب کے شیدائی تھے، جہاں تک دیکھا کہ آپ ایک بڑے پائے کے صاحب دل انسان تھے، صاحب کشف تو تھے ہی ان سے خرق عادات وکرامات بھی ظاہر ہوئیں، حضرت کے ساتھ بچپن اور تعلیمی زندگی کے دوران مختلف سفر کئے گئے، سفر وحضر میں حضرت یاد الٰہی میں محو ومگن رہتے تھے، ہر حال میں آپ کی زبان ذکر الٰہی سے لبریز رہتی تھی، بڑے نرم دل، نرم مزاج بزرگ تھے، لوگوں کے ساتھ حسن برتاؤ ان کی زندگی کا گویا شیوہ تھا، اخلاق کے پیکر تھے۔ حضرت نے ۱۹۹۰ء میں انتقال فرمایا اور اپنے گاؤں نائچونگ میں مدفون ہیں۔

۔محمد احمد۔

۲۔مولانا عبدالرحمن۔

۳۔مولانا محمد مصطفی۔

۴۔محمود احمد۔

۵۔رابعہ۔

۶۔مریضہ۔

۷۔خدیجہ۔

۸۔بدرالدجی۔

۹۔مریم۔

۱۰۔مولانا نور محمد۔

۱۱۔رابعہ۔

۱۲۔اسحاق۔

۱۳۔خیر النساء۔

۱۴۔مولانا شمس الضحی۔

حضرت مولانا نور محمد خنڈلی بھی صاحب اولاد بزرگ تھے،آپ کی اولاد بالترتیب یہ ہیں:
۔فاطمہ۔رشید احمد۔شیخ احمد۔صفیہ۔ظفر احمد۔نور حسین۔نورعین۔زینب۔شبیر احمد۔حسین احمد۔آمنہ خاتون۔

حضرت کے چند نامور خلفاء:

کہتے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی کے ارکان اور بنگال میں چالیس سے زائد خلفائے کرام ہیں،جن میں سے چند بزرگ یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا شفیق احمد صاحب چنوتوی۔

(۲) حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب بانسکھالوی۔

(۳) حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قطب دیاوی۔

(۴) حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب ارکانی ثم نہلوی۔

(۵) حضرت مولانا سیف الدین صاحب صدیقی چنوتوی۔

(۶) حضرت مولانا محمد خضر صاحب پکوی،چکریا۔

(۷) حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتوی۔

(۸) حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈلی ارکانی۔

(۹) حضرت مولانا رشید احمد صاحب،ساک فورا،بوال خالوی۔

(۱۰) حضرت مولانا مفضل الرحمن صاحب چاندگاؤں،چاٹگامی۔

(۱۱) حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب چنوتوی۔

(۱۲) حضرت مولانا عبدالغنی صاحب نائکان سری۔

(۱۳) حضرت صوفی صدیق احمد صاحب ساتکانوی۔

(۱۴) حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب،تیز گاؤں،ڈھاکہ۔

مولانا بڑے متواضع انسان تھے :

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی بڑے متواضع اور سادہ مزاج کے انسان تھے،کسی مجلس میں بیٹھتے تو پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے،چھوٹے ہو یا بڑے،مسکین ہو یا تونگر ہر ایک کو سلام کرنے میں سبقت لے جاتے تھے،مخصوص طور پر اپنے مریدوں،متعلقین اور منتسبین کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتے تھے،کسی بھی مجلس میں امتیازی نشست کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے،حضرت کی پوری زندگی تذلل وخضوع،عاجزی وانکساری سے عبارت تھی،حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے اور ہمیشہ حق باتوں کو قبول کرتے تھے،کبھی بھی آپ نے غرور وسربلندی کا مظاہرہ نہیں کیا،اگر کسی نے مذمت کی تو اس سے کبھی جھگڑا نہیں کرتے،لیکن کسی نے اگر تعریف کی تو اس کا شکریہ ضرور ادا کیا کرتے تھے۔
حضرت نے تواضع کی اصل حقیقت کو پہنچانا تھا،اس لئے حضرت نے تواضع وتکبر وذلت میں اعتدال کو قائم رکھا،کبھی آپ نے اپنے آپ کو اپنے مرتبہ سے بلند سمجھتے ہوئے تکبر نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو اتنا

گرادیا کہ انہی حقیر سمجھا جائے۔

کون نہیں جانتا کہ بڑائی کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دراصل تکبر ایک ایسی صفت ہے، جس کی مستحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، اگر مخلوق کا کوئی بھی فرد اس کا دعوی کرے تو وہ جھوٹا ہے، کبروغرور خود پسندی سے پیدا ہوتا ہے، اور خود پسندی محاسن سے ناواقفیت کا دوسرا نام ہے، اس قسم کی جہالت انسانیت کی مخالفت ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے متکبرین کو بہت برا کہا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے کہ :

انه لا یحب المتکبرین (۱)

پھر دوسری آیت میں ہے کہ:

الیس فی جھنم مثوی للمتکبرین (۲)

''کیا جہنم متکبروں کا ٹھکانہ نہیں؟''

الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدمنھما قذفته فی النار (۳)

نیز حدیث قدسی میں ہے کہ:

''کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میرا لباس ہے، جس نے ان دونوں میں سے کوئی چیز مجھ سے لینے کی کوشش کی، میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا''۔

انسان کے اعضاء اور جوارح پر تکبر کے اثرات سے مختلف بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جن میں سے کچھ ایک دوسرے سے کثیف ہوتی ہیں، جیسے شیخی، گھمنڈ، غرور وخودداری۔ عزت وخودداری صورت کے لحاظ سے کبروغرور کے مشابہ ہے، مگر حقیقت کے لحاظ سے مختلف ہے، جس طرح تواضع ذلت کے ساتھ مشتبہ ہوجاتی ہے، حالانکہ تواضع پسندیدہ فعل ہے، جبکہ ذلت برا فعل ہے، اسی طرح کبروغرور مذموم ہے اور عزت اچھی صفت ہے اور کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل سمجھے، اور عزت کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہنچانے اور اس کا احترام یہ ہے کہ اسے دنیا

(۱) سورۃ النحل، ۱۶: ۲۳۔

(۲) سورۃ الزمر، ۳۹: ۹۰۔

(۳) سنن ابی داؤد، ۲: ۲۱۱، کتاب اللباس۔

کے عارضی مفاد کے لئے نہ استعمال کرے، اور کبروغرور کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے ناواقف ہو اور اس کو اس کے مرتبے سے بالا تصور کرے۔

جو شخص ذلت کی طرف منحرف ہوئے بغیر تواضع کی حد پر رہتا ہے وہ عزت کی راہ پر ہے، جو آتش کبر کی پشت پر قائم ہے، لہذا ایسے موقع پر صرف راسخ علماء ومقربین بارگاہ اور ابدال وصدیقین ہی ثابت قدم رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ جو تکبر کرتا ہے وہ اپنے نفس کی پستی کا ثبوت دیتا ہے، اور جو تواضع کرتا ہے وہ اپنی شریفانہ طبیعت کا اظہار کرتا ہے، تو حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی متواضع رہ کر اپنی شریفانہ طبیعت کا ثبوت دیا ہے۔

اہل فضل کے قدردان تھے:

حضرت مولانا اہل علم وفضل کے بڑے قدردان تھے، اہل علم میں سے اگر کسی کی فضیلت سے واقف ہوتے تو اس کو ہر حال میں اپنے سے مقدم رکھتے تھے، اس قسم کی بے شمار باتیں ہماری کان میں آئیں، حتی کہ کسی مجلس میں اگر کوئی اہل علم وفضل آجاتے تو مجلس میں اس کے ساتھ گنجائش کر کے عمدہ مقام کے لئے اسے ترجیح دیتے تھے، جو عدل وانصاف کا تقاضا ہے۔

ظاہر ہے کہ عدل وانصاف نے ہی دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے، اگر یہ اٹھ جائے تو کارخانۂ عالم درہم برہم ہوجائے گا، یوں حضرت انصاف وعدل کے بڑے حامی تھے، آپ کے نزدیک دوستی ودشمنی، رنگ ونسل، رشتہ داری واجنبیت، امارت وغربت عدل وانصاف کی راہ میں حائل ہونا ایک ظلم تھا۔

اس عدل گستری کی وجہ سے حضرت کے معاصر علماء آپ کے قدردان تھے، آپ کے علاقے میں اس وقت بہت بڑے بڑے علماء پائے جاتے تھے، جہاں تک دیکھا گیا سارے کے سارے تقریبا آپ کے مدح سرا تھے، حضرت مولانا عبدالمجید صاحب گودام فاروی رحمۃ اللہ جو حضرت مولانا حافظ مقبول احمد اور مولانا حافظ محی الدین مرحوم کے والد بزرگوار تھے، بڑے جیّد عالم دین اور مثنوی معنوی حضرت علامہ جلال الدین رومی کے گویا حافظ تھے، جن کو راقم السطور نے دیکھا، آپ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ کے علماء اور اہل علم وفضل کی قدردانی کے بڑے مداح تھے، اور تعجب کرتے تھے کہ اتنے بڑے عالم اپنے معاصر علماء کو کتنے ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

دوستی وغم خواری :

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی ایک عادت یہ تھی کہ آپ ہر کس وناکس کو اپنا قریبی دوست نہیں بناتے تھے، اپنا قریبی دوست یا ساتھی بناتے وقت اس پر بنظر غائر تحقیق کیا کرتے تھے، یوں بھی سلف صالحین کے اخلاق کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح اور روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ بلاتحقیق کسی کو اپنا بھائی یا دوست نہیں بناتے تھے، کہ اس کو دنیا وآخرت کے کاموں میں اپنا شریک بنالیں اور کچھ ہی عرصہ بعد ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں، بلکہ ایک مدت تک تحقیق کر لیتے کہ آیا وہ شخص کہ جس کو وہ اپنا بھائی یا دوست بنارہے ہیں احکام خداوندی کو بجالاتا ہے یا نہیں، جیسا کہ قول مشہور ہے کہ **فساد الانتهاء من فساد الابتداء** ’’انجام کی خرابی ابتدا کی خرابی سے ہوتی ہے‘‘ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاتحقیق دوستی کے متعلق فرمایا ہے۔

ماتواد اثنان ففرق بينهما الاّ بذنب يحدثه احدهما (۱)

’’دو شخص آپس میں ایسی دوستی نہ کریں کہ ان میں جدائی واقع ہو بغیر اس کے کہ ان میں سے ایک گناہ کا مرتکب ہوا‘‘
اسی طرح حضرت مولانا کی پوری زندگی مسلمان بھائیوں میں گزر گئی ہے، آپ بلا طلب عوض غم خواری میں پیش پیش رہتے تھے، جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: ’’جس قدر دوست کی غم خواری کم ہوگی، اسی قدر اس کی محبت کم ہوگی، اس جگہ قرض سے مراد حقوق ہیں۔
حضرت علی بن بکار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانے میں کسی کو ابراہیم بن ادھمؒ کی مانند دوستی کے حقوق پر قائم نہیں دیکھا، آپ درہم، کھجور اور منقی تک بھی دوستوں میں تقسیم کر دیتے اور اگر کوئی دوست موجود نہ ہوتا تو اس کا حصہ رکھ لیتے یہاں تک کہ وہ آجاتا۔
یوں حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی بھی اپنے دوستوں کا بڑا پاس اور لحاظ کرتے تھے، اسی لئے حضرت مولانا حبیب احمد صاحب فرماتے تھے کہ ہم نے کبھی بھی آپ کے دوستوں کو آپ سے جدا یا علیحدہ ہوتے نہیں دیکھا۔

(۱) مسند احمد بن حنبل، ۲: ۶۸، ۵: ۷۱۔

مخلصانہ محبت :

حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ مخلصانہ محبت کا ایک حسین پیکر تھے، آپ کے اندر صرف اور صرف اللہ تعالی کے لئے محبت کرنے کی نشانیاں نمایاں تھیں، جس میں دنیاوی اغراض ومقاصد کا شائبہ تک نہیں تھا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جو محبت غرض سے ہوتی ہے وہ پوری ہونے کے بعد زائل ہوجاتی ہے، اور جس محبت میں خلوص ہو اور اس کے ساتھ غرض وابستہ نہ ہو وہ محبت پائیدار ہوتی ہے۔
فرماتے تھے کہ حضرت مولانا کسی بھائی کے مال ودولت پر حسد نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے لئے دعا کرتے تھے، حضرت کا یہ وصف ایسا ہے کہ جس سے حضرت کی پاکیزہ محبت کی تکمیل ہوتی ہے، آپ کے اندر دنیا کی کسی چیز پر حسد کا جذبہ تھا ہی نہیں، ساتھ ساتھ آپ اپنے مقدور بھر لوگوں کو احسان اور ایثار بھی کیا کرتے تھے۔
حضرت مولانا کے بہت سارے مریدوں سے راقم سطور کی ملاقات رہی، تقریباً ہر ایک کا یہی کہنا ہے کہ مولانا عبدالسلام صاحبؒ کے اندر جو محبت تھی، وہ صرف اور صرف اللہ تعالی کے لئے تھی، جس میں دنیاوی مقصد وغرض بالکل نہیں تھی، آپ کی یہی مخلصانہ محبت لوگوں کے دلوں کو جیت لیتی تھی، جو بھی آپ سے ملے اس نے اس بات کا ضرور اقرار کیا کہ حضرت مولانا مخلصانہ محبت کا ایک حسین وجمیل پیکر ہیں۔

عیب پوشی :

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی اللہ تعالی کا ایک صالح اور نیک بندہ تھے، تو اللہ تعالی کے نیک بندوں کی طرح آپ میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے عیبوں کو چھپایا کرتے تھے، جس طرح کہ عیبوں کو چھپانے کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

من ستر مسلما ستره الله يوم القيامة (۱)

’’جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا‘‘۔
حضرات صوفیائے کرام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے روحانی اور دینی بھائیوں کے لئے غائبانہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم، ۱: ۳۳۰، رقم: ۲۳۱۰۔

استغفار کرتے ہیں، اور اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوکر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ان کی تکالیف کو دور کرے، تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ بھی اپنے وقت کے ایک عظیم المرتبت بزرگ صوفی انسان تھے، ایک طرف تو وہ اپنے کسی بھی مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرتے اور دوسری طرف اگر کسی بھائی سے کوئی لغزش ہوجاتی تو اس کے لئے غائبانہ استغفار کرتے تھے، اور دعا کرتے تھے اللہ تعالی اپنے خاص فضل کرم سے اس کے جملہ عیوب کو دور کردے۔

غرباء ومساکین سے محبت:

اللہ تعالی کے نیک اور صالح بندوں کا ایک امتیازی وصف ہے کہ وہ غرباء اور مساکین سے محبت رکھتے ہیں، اور ان کے سامنے تواضع کرتے ہیں، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

اللھم احیینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔ (۱)

’’اے اللہ مجھے مسکین حالات میں رکھ، اور مجھے مسکین حالت میں موت دے، اور قیامت کے دن مساکین کے زرے میں اٹھا‘‘۔

کہتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام مسکین کے لقب سے بلائے جانے کو پسند کرتے اس کے علاوہ انہیں اور کوئی نام پسند نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فقراء کی تواضع کرتے اور جب ان کے ساتھ بیٹھتے تو گھٹنے پر گھٹنا رکھ کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں غلام ہوں اور غلاموں کی طرح بیٹھتا ہوں، تو حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی کو اگرچہ اللہ تعالی نے ظاہری دولت سے بھی نوازا تھا، زمیندار تھے اور زمیندار کے فرزند تھے، مگر آپ کی پوری زندگی مسکینوں کی طرح گزرگئی اور حضرت ہمیشہ اس باب میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا تھے، اور آپ کے اندر صالحین کا یہ وصف نمایاں تھا۔

(۱) جامع ترمذی، ۲: ۵۸۔ کتاب الزہد۔

حضرت اور عفو ودرگزر:

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عفو ودرگزر معاشرہ کے استحکام کا ضامن تھا، ایسی صورت میں جب کسی دوست سے ظاہری وباطنی جدائی ہوجائے یا ظاہری جدائی ہوا اور باطنی تعلق قائم رہے تو ایسے معاملے میں مختلف اشخاص کے مختلف حالات کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تبدیلی ایسی صورت میں نمودار ہوتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالی کی راہ سے ہٹ جاتے اور ان کی سابقہ برائی ظاہر ہوجاتی ہے، ایسے لوگوں سے بغض رکھنا ضروری ہے۔

پھر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے اتفاقیہ کوئی لغزش ہوگئی، یا غفلت وکوتاہی واقع ہوگئی ہو، لیکن ان کی اصلاح کی توقع ہو تو ایسے لوگوں سے بغض نہیں رکھنا چاہئے، تاہم بحالت موجود ان کے عمل سے نفرت کی جائے، لیکن خود ان کو محبت کی نظر سے دیکھا جائے، بلکہ ان کی نجات واصلاح کی امید رکھی جائے۔

حضرت مولانا کے نزدیک انتقام لینے سے انسان میں تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوجاتا ہے، جب کہ معاف کرنے سے وسعت قلبی پیدا ہوتی ہے اور اخوت ومحبت کا احساس وجذبہ انسان کے دل میں موجزن ہوتا ہے، حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ گناہ سے نفرت کرتے تھے لیکن گنہگار سے نہیں، ہمیشہ گنہگار کی اصلاح کی امید رکھتے تھے۔

پھر صوفیائے کرام کے اخلاق کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ دیتے ہیں، اور زیادتی وظلم پر عفو ودرگزر کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کردیتے ہیں، تو اس حوالے سے حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانیؒ کا بھی یہی حال تھا کہ آپ نے اپنی پوری زندگی میں کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا، بلکہ برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا تھا۔

عفو عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی معاف کرنا، بخش دینا، درگزر کرنا، بدلہ نہ لینا، مٹا دینا، پھر ڈھانپ لینے اور گناہ پر پردہ ڈالنے کے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں عفو سے مراد کسی کی زیادتی وبرائی پر انتقام کی قدرت وطاقت کے باوجود انتقام نہ لینا اور معاف کردینا ہے، قدرت وطاقت نہ ہونے کی وجہ سے اگر انسان انتقام نہ لے سکتا ہو تو یہ عفو نہیں ہوگا، بلکہ اسے بے بسی کا نام دیا جائے گا،

عفوصرف قادر ہونے کی صورت میں ہے۔

عفو کا ادنی درجہ یہ ہے کہ آدمی معاف کردے، خواہ طبیعت اس پر آمادہ نہو، اور اعلی درجہ یہ ہے کہ دل کی رضاوخوشی کے ساتھ معاف کرے، اور اگر ممکن ہو تو اس کے ساتھ کچھ احسان بھی کردے۔

ہنس مکھ چہرہ:

حضرت مولانا کے بہت سارے مریدوں کا بیان ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ ہمیشہ کھلی کتاب کا جیسا رہتا تھا، ہمیشہ چہرہ میں خوش باشی نظر آتی تھی، مولانا اللہ کے ایک بڑے ولی تھے، آپ کے اندر صفت ولایت جو تھی اس کے آثار بھی ہمیشہ دکھائی دیتے تھے، حضرت ہمیشہ شگفتہ اور خوش باش نظر آتے تھے۔

یوں بھی صوفیائے کرام کے اخلاق کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سورج کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ صوفی خلوت وتنہائی میں اللہ تعالی کی بارگاہ میں گڑگڑا کر روتا ہے، مگر وہ لوگوں کے سامنے شگفتہ رو اور خوش باش نظر آتا ہے، اس کے دل کی تجلیات کی وجہ سے اس کے چہرے پر مسرّت کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، کیوں کہ اس کا باطن روحانی منازل طے کرتا ہے اور خدا کی طرف سے اس پر ایسے انعامات نازل ہوتے ہیں کہ جن سے اس کا قلب نور الہی سے لبریز ہوجاتا ہے، تو پھر چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں، تو حضرت بھی اپنے وقت کے ایک عظیم صوفیاء میں سے تھے، آپ کے چہرے پر صوفیائے کرام کے آثار نمایاں رہتے تھے، مولانا کبھی کبھار ہنسی مذاق بھی کرتے تھے، اور لوگوں کی طبیعتوں کے مطابق برتاؤ کرتے تھے، آپ حد اعتدال میں رہتے اور ہمیشہ اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے راہ اعتدال پر چلتے تھے۔

انسان کے لئے جس طرح مزاج کے اعتدال کو قائم رکھنا مشکل ہے، اسی طرح ہنسی کے اعتدال کو بھی برقرار رکھنا مشکل ودشوار ہے، ہنسی انسانی خصوصیت ہے، جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے، ہنسی عجیب وغریب پر آتی ہے، اور تعجب غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے، جو انسان کے لئے باعث شرافت اور اس کی ممتاز خصوصیت ہے، لہذا اس کے اعتدال سے بخوبی واقف ہونا ان لوگوں کا کام ہے جو علم واخلاق میں

ثابت قدم ہوں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زیادہ ہنسی سے بچو، کیوں کہ یہ دل کو مردہ کرتی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہنسی کی کثرت رعونت کی علامت ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ ایک جلیل القدر عالم دین، ایک شیخ ومرشد اور اخلاق کے پیکر انسان تھے، آپ مذکورہ بالا ساری چیزوں سے بدرجۂ اتم واقف تھے، تو آپ کی زندگی بھی اس حوالے سے افراط وتفریط سے دور اعتدال پر گزر گئی تھی۔

قناعت وشکر گزاری :

اللہ تعالی نے حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانیؒ کو باطنی دولت کے ساتھ ظاہری ثروت سے بھی نوازرکھا تھا، آپ بڑے زمیندار اور صاحب ثروت انسان تھے، لیکن آپ کی پوری زندگی قناعت سے گزرگئی، حضرت کی ایک اخلاقی خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ نے اللہ تعالی کی دی ہوئی دنیاوی نعمتوں سے تھوڑی ہی چیز پر قناعت کرلی، یوں انصاف کے ذریعے آپ نے اپنے نفس پر قابو پالیا، حضرت مولانا نفس کے رجحانات اور قناعت کے فوئد سے آگاہ اور نفس کو قانع بنانے کا علم رکھتے تھے، آپ کو اس کے امراض اور علاج خوب خوب معلوم تھا، یوں قناعت کے ذریعے اپنے حرص سے انتقام لیتے تھے۔

اسی طرح حضرت مولانا بڑے شکر گزار انسان تھے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح عرض کی گئی ہے کہ مولانا کو بظاہر دنیاوی مال ودولت کی کمی نہیں تھی، پوری زندگی دعوت وتبلیغ اور رشد ہدایت میں گزرگئی، مصاریف خود برداشت کرتے تھے، آپ کی شکر گزاری دراصل محبت کے باب میں تھی، جس نے اپنے آپ سے اللہ کے لئے محبت کی آپ اس کے شکر گزار رہے۔

صوفیائے کرام کے اخلاق کی ایک نمایاں خصوصیت محسن کے احسان کی شکر گزاری اور اس کے لئے دعا گوئی ہے، ان کے اندر اپنے پروردگار پر توکل کا جذبہ پایا جاتا ہے، اس طرح ان کی توحید بھی واضح ہے کہ ان کی نظریں اغیار کی طرف نہیں ہوتیں، بلکہ وہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ خدائے وحدہ لاشریک لہ ہی کو سمجھتے ہیں، تاہم وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں انسان کا شکر یہ بھی ادا کرتے ہیں، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکر بن قحافہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی نے ہمیں اپنی محبت اور احسانات سے ممنون نہیں کیا۔

خاطر مدارات:

حضرت مولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صوفیائے کرام کے اس اصول پر کار بند تھے کہ صوفیائے کرام اپنے ساتھی کو خاطر مدارات کا محتاج نہیں بناتے اور نہ اسے معذرت پر مجبور کرتے اور نہ ہی اپنے ساتھی کے لئے اس قدر تکلف کرتے ہیں کہ وہ اسے ناگوار سمجھے، بلکہ جیسے ان کا ساتھی ہے ویسے ہی رہتے ہیں، اور اس کے مقصد کو اپنے مقصد پر ترجیح دیتے اور مقدم رکھتے ہیں، حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ وعلیہ السلام کا ایک قول ہے کہ:

"بدترین دوست وہ ہے جو تمہیں خاطر مدارات کا محتاج بنائے یا تمہیں معذرت پیش کرنے پر آمادہ کرے، اور تم اس کے لئے تکلف کرو"۔

یوں بھی اللہ تعالی کے نیک اور صالح بندوں کی اخلاقی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر انہیں مخلوق کی طرف سے کوئی اذیت یا تکلیف پہنچے تو اس کا انتقام نہیں لیتے، بلکہ تحمل ومدارات کے ساتھ اس کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔

انسان کے اندر ایک نفس ہے جس کو نفس امارہ کہا جاتا ہے، اگر کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف کیا جائے تو اسے ناپسند کرتا ہے اور اس وقت اس میں غیض وغضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اللہ تعالی کے نیک اور صالح بندے صبر وتحمل سے حسن مدارات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں، اور نفس امارہ پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، یوں حسن مدارات سے نفس کی حدّت طیش نفرت کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بلخ کے ایک نوجوان نے حضرت شیخ ابو یزید بسطامیؒ سے پوچھا کہ زاہد کی تعریف کیا ہے؟ تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ:

"ہمیں جو کچھ ملتا ہے کھا لیتے ہیں اور اگر نہ ملے تو صبر کر لیتے ہیں"۔

تو اس پر اس بلخی نوجوان نے کہا کہ ہمارے ہاں بلخ کے کتے بھی ایسا کرتے ہیں، اس پر شیخ ابو یزید بسطامیؒ نے اس نوجوان سے زاہد کی تعریف پوچھی تو اس نے عرض کیا

"جب ہمیں نہیں ملتا تو ہم شکر کرتے ہیں اور جب ہمیں ملتا ہے تو ایثار کرتے ہیں"۔

حضرت شیخ ذوالنون مصری کے نزدیک فراخ دل زاہد کی تین نشانیاں ہیں:

(۱) جمع کی ہوئی چیز کو خرچ کرنا۔

(۲) گم شدہ چیز کو تلاش نہ کرنا۔

(۳) اپنی خوراک دوسروں کو دے دینا۔

تحمل وبردباری:

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی کے اندر تحمل وبردباری کی صفت نمایاں تھی، حضرت کو لوگوں میں سے اگر کوئی اذیت پہنچاتے تو اس کی زیادتی پر ضبط کرتے اور اس کی غلطی سے چشم پوشی کر جاتے تھے۔

اگر اللہ تعالی کے نیک بندوں کے اخلاقی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اگر اللہ کے ان بندوں کے ساتھ کوئی عداوت رکھتے اور لڑائی جھگڑے پر اتر آتے تو حلم وبردباری کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں، تا آں کہ اس کا فتنہ سرد ہوجاتا ہے، اور اپنے کئے پر شرمسار ہوکر ان کے قدموں میں آ گرتا ہے، معافی مانگتا ہے اور بالآخر وہ ان کا دوست بن جاتا ہے۔

ٹھیک یہی حالت مولانا ارکانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، یہ تو دنیا ہے آخر دنیا، اللہ والوں کے دشمن بھی تو ہوتے ہیں، بوسیدنگ کے علاقے میں حضرت کے ساتھ بعض گستاخوں نے گستاخی بھی کی تھی، لیکن بعد میں حضرت کے تحمل وبردباری اور حلم وقوت برداشت کو دیکھ کر خود وہ گستاخ بھی تائب ہوگئے، اور بعد میں تدریجاً حضرت کے ساتھی بن گئے تھے، ایسے چند واقعات علاقے کے لوگوں کی زبانی سنے گئے ہیں، غرض آپ بڑے نیک اور صالح بزرگ تھے، حضرت کے دل میں کینہ اور نفس میں جھگڑے کا وجود ہی نہیں تھا، حضرت مولانا کے نزدیک نفس میں کینہ کا وجود باطنی کشمکش کے مترادف ہے، اس باطنی کشمکش سے دور رہنا ضروری ہے۔

انسان سے ہمدردی:

کون نہیں جانتا ہے کہ تعلق اخوت کے استحکام کے لئے ہمدردی شرط اولین ہے، اس کے برعکس دھوکہ دہی اس رشتہ کے تقدس کو پامال کرکے رکھ دیتی ہے، کیوں کہ ہمدردی ایک ایسی چادر ہے، جس کے باعث اخوت ومحبت کو طمانیت نصیب ہوتی ہے، اس لئے اہل دل جب کسی کے ساتھ رشتۂ اخوت کی بنا پر

دوستی کا دم بھرتے ہیں تو ہمدردی کرتے ہیں، اور جدا ہونے سے پرہیز کرتے ہیں۔

تو حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ارکانی ہر انسان سے ہمدردی کرتے تھے، دشمن ہو یا دوست، اپنا ہو یا غیر، گنہگار ہو یا نیکوکار غرض آپ ہر ایک سے ہمدردانہ معاملہ فرماتے تھے۔

برادرانہ تعلق کے لئے شفقت و ہمدردی بہت اہمیت کی حامل ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا ہر چھوٹے بڑے سے شفقت و ہمدردی سے پیش آتے تھے، حضرت کو اگر کہیں بھی بلایا جاتا تو محبت، شفقت اور ہمدردی کے جذبے سے وہاں پہنچ جاتے تھے۔

اس ہمدردی اور شفقت کے علاوہ بطور خاص حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے روحانی بھائیوں سے بڑے بے تکلف تھے، حضرت کا یہی بے تکلفانہ انداز دراصل ایک صالح بندہ ہونے کی علامت تھا، وہ اپنے روحانی بھائیوں سے تکلف نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر حال میں بلا تکلف پیش آتے تھے، حضرت مولانا کی خصوصیت میں سے نرمی، سادگی، ملنساری اور بے تکلفی بہت قابل ذکر چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا بطور خاص گنہگار پر شفقت فرماتے تھے، جیسے کہ حضرت عبداللہ مغاربی کا قول ہے کہ جو شخص گنہگار کو بنظر رحمت نہ دیکھے وہ صوفیاء کے طریق سے خارج ہے، اسی طرح حضرت معروف کرخی کی عادت تھی کہ جب وہ کسی گنہگار کو دیکھتے تو اس کی بخشش کے لئے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھاتے اور اس کے لئے رحمت کی امید رکھتے اور فرماتے کہ اللہ تعالی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نجات وشفاعت کے لئے مبعوث فرمایا ہے، جب کہ شیطان لعین کو لوگوں کی ہلاکت، تباہی وبربادی اور ان کی برائی پر خوش ہونے کے لئے بھیجا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت معروف کرخیؒ کا ایک ایسی جماعت پر سے گزر ہوا جو دریائے دجلہ میں کشتی پر سوار تھی اور وہ اپنے پاس شراب رکھی ہوئی تھی، لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ ان نافرمانوں کے لئے بددعا کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ:

''اے اللہ جس طرح تو نے ان کو دنیا میں خوش کیا ہے اسی طرح ان کو آخرت میں بھی خوش رکھ، لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے آپ سے بددعا کی گزارش کی تھی اور آپ نے ان کے حق میں دعا کی، آپ نے فرمایا معاذ اللہ میں کسی مسلمان کے لئے

بددعا کروں، بیشک اللہ تعالی آخرت میں ان کو اسی وقت خوش کرے گا جب دنیا میں توبہ کی توفیق دے کر انہیں معاف کردے گا۔ منقول ہے کہ وہ جماعت بعد ازاں تائب ہوگئی تھی''۔

مادیت سے بے زاری:

حضرت مولانا مادیت اور مادہ پرستوں سے بڑے بیزار تھے، مادہ پرست نہ صرف حضرت کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ مادہ پرستوں کو حضرت بسا اوقات اپنے دشمن ہونے کا اعلان فردیتے تھے، شریعت کے پابند اور روحانی دنیا سے لگاؤ رکھنے والے آپ کے دوست اور آپ کی نظر میں صاحب عزت ہوتے تھے، اور دین دار حضرات اور سنت رسول اللہ صلی اللہ کے پابند لوگ دیکھتے تو بڑے خوش ہوتے تھے، خاص طور پر علمائے دین اور طالبان علوم نبوت آپ کے محبوب ترین انسان تھے، کوئی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پاتے تو حضرت مولانا اپنے آپ کو اس سے قریب کردیتے تھے، آپ رحمۃ اللہ کے نزدیک ارباب فضل وکمال وہ لوگ ہوتے جو ایمان وایقان اور علم نبوت کے ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند ہوں، آپ کی گفتگو اور طرز زندگی وانداز کلام آپ کی درد دلی اور سوز دروں کی عکاسی ہوتا تھا، حضرت مولانا زہد وغنا، خود شناسی وخود آگہی کے پیکر تھے، صاحب ثروت وصاحب علم تھے مگر محسن، متواضع اور منکسر المزاج۔ ع

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

ایثار وسخاوت:

مولانا رحمۃ اللہ علیہ محبت خلق خدا، ایثار وسخاوت کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھے، صاحب ثروت زمین دار تھے، یوں کسی کو محروم کرنا نہیں جانتے تھے، بڑے دریا دل انسان تھے، آپ کی فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ آپ نہ صرف اپنوں کے لئے دروازۂ سخاوت کھولتے بلکہ بسا اوقات آپ کی سخاوت اور فراخ دلی سے جانے مانے دشمن بھی محروم نہیں رہتے تھے، دوستوں کی طرح آپ اپنے دشمنوں کے

ساتھ بھی بڑے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے، رحم دلی اور خیر خواہی کا جذبہ ہمیشہ آپ کی طبیعت میں چھایا رہتا تھا، حضرت عفو و درگزر، ایثار و ہمدردی کا گویا شہنشاہ تھے، ساتھ ہی ساتھ بے نفسی اور للّٰہیت کی جیتی جاگتی تصویر و پیکر بھی۔

حضرت مولانا بحیثیت داعی و مبلّغ :

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر داعی و مبلغ، معلم اور مرشد کامل تھے، حضرت دعوت و تبلیغ اور تعلیم و رشد کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ خروج کرتے رہتے، اور سال میں مشکل سے ایک دو مہینے اپنے گھر میں رہتے تھے، اس حوالے سے حضرت کا حقیقی پوتا حافظ جعفر الاسلام صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''دادا جان حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کی خاطر گاؤں گاؤں شہر در شہر اور علاقہ در علاقہ پھرا کرتے تھے، گھر سے جبھی نکلتے تو نو دس مہنے باہر رہتے تھے، بمشکل گھر میں سال میں دو مہینے حضرت کا قیام ہوتا تھا''۔

حضرت مولانا کی ذات میں اللہ تعالی نے دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کی ساری صفات بھر دی تھیں، چنانچہ بعض حضرات علماء نے جو ایک داعی و مبلغ کے لئے چند صفات بیان کی ہیں وہ سب حضرت مولانا کے اندر پائے جاتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک داعی و مبلغ کے اندر درج ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے:

(۱) خلوص نیت۔
(۲) عمل و کردار میں پختگی۔
(۳) کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیع مطالعہ۔
(۴) صبر و استقامت۔
(۵) حسن خلق۔
(۶) تواضع و انکساری۔
(۷) عفو و درگزر۔
(۸) صداقت۔

(۹) توکل۔
(۱۰) ریاضت و مجاہدہ۔
(۱۱) تقوی و طہارت۔
(۱۲) قوت ارادی۔
(۱۳) شخصی وجاہت۔
(۱۴) ملنساری۔
(۱۵) دینی عصبیت و حمیت۔
(۱۶) برداشت ملامت۔
(۱۷) مخاطبین کی نفسیات کا لحاظ۔

اب ہم حضرت مولانا کے حوالے سے مذکورہ صفات پر مختصر مختصر انداز میں بحث کریں گے۔

(۱) خلوص نیت :

جہاں تک ملاحظہ کیا گیا ہے کہ حضرت کے سارے افعال و اقوال خلوص نیت پر مبنی تھے، اور کہا جاتا ہے کہ اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی موجب خیر و برکت ہوتا، اور باعث ثمرات حسنہ ہوتا ہے، اور بغیر اخلاص کے دنیا میں پھل نہیں ہوتا اور آخرت میں بھی کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا، اس کے لئے ہر عمل کا دار و مدار حسن نیت اور اخلاص پر ہے، اور دعوت کا تعلق بھی بطور خاص باطن کی نیت سے ہے، چوں کہ حضرت کی زندگی حسن نیت اور اخلاص و للّٰہیت سے عبارت تھی، اس لئے آپ کی دعوتی اور تبلیغی کوشش برگ و بار لائی، اور انشاء اللہ تعالی ان کوششوں کا بھرپور ثواب آخرت میں بھی یقینی ہے۔

(۲) عمل و کردار میں پختگی :

امر حق کے داعی کے لئے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کا موافق ہو، عمل کی دلیل چوں کہ قوی ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کا رویہ اس کے دعوی کے خلاف ایسی حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے داعی کا صاحب کردار ہونا بہت ہی اہم اور ضروری ہے، جب وہ شریعت رسول صلی

اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح عمل کرے تو اس کی دعوت کے اثرات بھی زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے داعی کا کردار ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں کہیں جھول نہ آئے بلکہ اس کا کردار خود اس کی گواہی بن جائے، تو حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ کی پوری زندگی ایسی گزری کہ آپ جس عمل کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے، خود اس پر عمل کرتے تھے، اس لئے آپ کی دعوت میں بہت ہی تاثیر ہوتی تھی۔

(۳) کتاب وسنت کا وسیع مطالعہ :

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی اپنے وقت میں ایک جلیل القدر عالم دین تھے، کتاب وسنت کا آپ کو وسیع مطالعہ تھا، جو بھی کام کرتے کتاب وسنت کے موافق کرتے تھے، چوں کہ ایک داعی کے لئے کتاب وسنت کی تعلیمات سے آگاہی ایک لازمی چیز ہوتی ہے، اسی لئے حضرت اپنے مریدوں، ہم نشینوں اور متعلقین کو قرآن وسنت کے مطالعہ کی طرف توجہ دلایا کرتے تھے، کیوں کہ حضرت جانتے تھے کہ اگر سالک داعی خود قرآن وسنت کے صحیح مفہوم سے بہرہ ورنہ ہوگا، تو دوسروں کو دین اسلام کے صحیح تقاضے سے آشنا نہیں کر پائے گا۔

(۴) صبر واستقامت:

حضرت مولانا کو دعوت دین اور تبلیغ اسلام کی راہ میں بے شمار مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، کبھی لوگوں کی طرف سے اور کبھی برمی حکومت اور اس کے لالے پالے غنڈوں کی طرف سے اس راہ حق میں بہت سارے چیلنجز کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا، مگر اللہ تعالی نے حضرت کے اندر صبر وثبات اور استقامت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا، چنانچہ آپ نے دین ودعوت اور رشد وہدایت کے راستے میں پورے صبر واستقامت کا ثبوت دیا تھا۔

جہاں تک پتہ چلتا ہے کہ حضرت کو اس بات کا صحیح صحیح علم تھا کہ ایک داعی کو صبر واستقامت کی صفت سے متصف ہونا ازبس ضروری ہے اور داعی کو بطور خاص پیکر صبر ہونا چاہئے، تاکہ دین کی دعوت کے سلسلے

میں آنے والے مصائب وآلام، تنگی وترشی اور ناسازگار حالات کا پامردی سے مقابلہ کر سکے، اس لئے کسی بھی حالت میں آپ کا قدم ڈگمگایا نہ تھا، اور آپ ہر حالت میں سرخرو ہوئے تھے۔

(۵) حسنِ خلق :

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی حسن خلق اور خوش خلقی سے عبارت تھی، حضرت کا یہ وصف تھا کہ بسا اوقات اس نے دشمن تک کو دوست بنا دیا تھا، حضرت مولانا کے چہرۂ زیبا میں ہر وقت تبسم اور شگفتگی کے آثار نمایاں رہتے، حسن خلق کا یہ عالم تھا کہ جو بھی حضرت سے ایک بار ملتا تو دوبارہ ملنے کی آرزو اور تمنا کرنے لگتا تھا، اور حضرت کی خوش گفتاری کے ساتھ ساتھ حسن کرداری کی وجہ سے لوگوں میں آپ سے ملنے اور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنے کی رغبت ہو جاتی تھی۔

(۶) تواضع وانکساری:

تواضع وانکساری ایک داعی ومبلغ کا ایک اہم ترین وصف ہے، یہ اسے نفس کے حملوں سے بچانے کے لئے اسلحہ کا کام دیتا ہے، یہ اسے احساس برتری سے بھی بچائے رکھتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانیؒ کے طرز زندگی اور طرز عمل عجز وتواضع سے بھرا ہوا تھا، حضرت کو تواضع کے برخلاف غرور وپندار، تکبر نخوت سے اتنی نفرت تھی جتنی کہ کفر وشرک سے ایک بندۂ مؤمن کو نفرت ہوتی ہے۔

(۷) عفو ودرگزر :

حضرت مولانا کے اندر عفو ودرگزر کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس طرح کہ ارشاد باری تعالی ہے کہ :

خذو العفو وأمر بالمعروف واعرض عن الجاهلين۔ (۱)

"(اے حبیب مکرم!) آپ درگزر فرمانا اختیار کریں، اور بھلائی کا حکم دیتے رہیں اور جاہلوں سے کنارہ

---

(۱) سورۃ الاعراف، ۷: ۱۹۹۔

کشی اختیار کرلیں‘ دوسری جگہ میں ارشاد باری ہے کہ:

فاعف عنهم واستغفر لهم۔ (۱)

’’سو آپ ان سے درگزر فرما کریں اور ان کے لئے بخشش مانگا کریں‘‘۔

(۸) صداقت :

حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ کے لئے بحیثیت ایک شیخ کامل، داعی برحق، مبلغ ومرشد کے راست روی، راست بازی، ظاہر وباطن کی یکسانیت، حسن عمل وقول کی سچائی لازمی چیز بن گئی تھی۔

آپ نے اپنے آپ سے اور اپنے پروردگار سے یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ سچ بولیں گے اور سچ کے برعکس کسی چیز کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گے، تو ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ حضرت کے لئے بدی سے بچنا اور نیکی اور سچائیت کی راہ پر چلنا آسان ہو چکا تھا، یوں اس سچائی اور راست گفتاری وکرداری کی وجہ سے حضرت کے اندر بلند حوصلگی اور شجاعت پیدا ہوگئی تھی، سچائیت کی راہ میں حضرت کو صرف اور صرف اپنے آقا کا خوف تھا، خوف خدا کے سوا دنیا ومافیہا سے ڈرنا آپ کے نزدیک ایک بزدلی تھا، جوان سے کبھی نہیں ہو پایا تھا۔

(۹) توکل:

توکل کے معنی ہیں: اللہ تعالی کو اپنا وکیل بنانا، اور اس پر پورا اعتماد کرنا، اور وکیل کہتے ہیں سرپرست کو، اور سرپرست اس کو کہتے ہیں کہ جو بہترین اور بھلائی کی بات سوچے، اور خرابیوں سے بچائے، یوں مومن کا وکیل صرف اور صرف اللہ تعالی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے جو کچھ آئے وہ بھلائی ہی بھلائی ہے، اس میں میری بہتری ہے، خدا تعالی جس حال میں رکھے گا میں اس سے خوش ہوں، مومن اپنی سی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے معاملہ کو خدا تعالی کے حوالہ کردیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اے رب! میں تیرا ایک کمزور اور ناتواں بندہ ہوں، اس کام میں جو کوتاہی رہ گئی ہے وہ تو ہی پوری کردے، تو غالب اور طاقت ور ہے، تو بندۂ مومن کے لئے ضروری ہے کہ کسی چیز کو

---

(۱) سورۃ آل عمران، ۱۰۹:۳۔

حاصل کرنے کی جو تدبیر ہو سکتی ہے، وہ اسے اختیار کرے اور پھر خدا تعالی سے دعا کرے کہ میں نے تو ممکن تدبیر کرلی ہے، اب تو ہی مدد فرما، یہ ہے توکل۔

تو حضرت مولانا ارکانی صاحب بحیثیت ایک داعی ومبلغ کے آپ کو اللہ تعالی پر پورا پورا بھروسہ تھا، اور یقین تھا کہ اللہ تعالی آپ کی محنت کو دنیا وآخرت میں رائگاں جانے نہیں دے گا، جب کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ جب تم کسی کام کا ارادہ کرلو تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے آگے بڑھو، اور اللہ تعالی پر مکمل توکل کرتے ہوئے اس کا انجام اس پر چھوڑ دو، ارشاد ربّانی ہے کہ:

فاذا عزمت فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين۔ (۱)

’’پھر جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیا کریں، بے شک اللہ توکل والوں سے محبت کرتا ہے‘‘۔

(۱۰) ریاضت ومجاہدہ :

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانیؒ کی پوری عملی زندگی ہی ریاضت ومجاہدہ سے عبارت تھی، حضرت ایک داعی الی اللہ تھے، آپ کو اس بات کا پورا پورا علم تھا کہ دعوت الی اللہ کا کام مسلسل محنت اور متواتر ریاضت ومجاہدہ کا متقاضی ہے، اس لئے آپ نے تقوی، طہارت، پاکیزگی، نظافت اور عبادت الہی اور اطاعت وبندگی کے تہ بتہ اپنے اندر راہ حق میں آنے والے مصائب وآلام کی برداشت کا حوصلہ پیدا کرلیا تھا، یوں اس راہ میں حضرت کی زندگی کا ہر لمحہ مجاہدہ اور ریاضت میں بسر ہوا تھا۔

(۱۱) تقویٰ وطہارت:

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تقویٰ وطہارت کی ایک حسین وجمیل پیکر بن چکی تھی، حضرت مولانا کی زندگی کا ہر لمحہ احکام الہی کی بجا آوری میں بسر ہوا، اور تقوی وطہارت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

---

(۱) سورۃ آل عمران، ۳: ۱۵۹۔

(۱۲) قوت ارادی:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ایک داعی الی اللہ مضبوط قوت ارادی کے مالک بزرگ تھے، کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ ایک داعی کے لئے قوت ارادی ہی وہ وصف ہے، جس پر تمام اوصاف کا انحصار ہے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ جب داعی خود قوت ارادی کے اعتبار سے کم زور اور اپنی کم زوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگا تو اس سے دوسروں کی اصلاح کی توقع کیسے کی جائے گی۔
حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی پہلی چیز جو کسی کو متاثر کرتی تھی وہ حضرت مولانا کی ظاہری شخصیت تھی، لوگ پہلے ہی نظر میں اندازہ کر لیتے تھے کہ آپ ایک عظیم المرتبت شخصیت کے مالک ہیں۔

(۱۳) شخصی وجاہت:

حضرت کے اندر علم و دانش اور عمل و کردار کی پختگی کے ساتھ ساتھ خاصی شخصی وجاہت تھی، جس سے لوگ بہت ہی متأثر ہو جاتے تھے۔

(۱۴) ملنساری:

حضرت مولانا بڑے ملنسار انسان تھے، جو ایک داعی الی اللہ اور مرشد برحق کے لئے ضروری امر ہے، حضرت کے اندر انسانوں سے مل ملاپ اور لوگوں سے گھل مل جانے کی داعیانہ و مرشدانہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی، لوگوں کو حضرت سے مل کر مانوسیّت کا احساس ہوجاتا تھا، لوگوں کے دکھ درد، خوشی و غمی، سکھ وراحت میں شریک ہوجاتے تھے، جس کی وجہ سے لوگوں میں ایک اپنائیت کا احساس پیدا ہوجاتا تھا، حضرت کی یہ ایک ایسی صفت تھی جو لوگوں کو بہترین انداز میں تعلیم کرنے میں کام آتی تھی۔

(۱۵) دینی عصبیت وحمیت:

جس طرح ایک داعی الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ بوقت ضرورت اللہ کے دین کی خاطر جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا جائے، ٹھیک حضرت مولانا رحمۃ اللہ بھی ایسے تھے، حضرت کے اندر اپنے

دینی بھائیوں کے لئے رحمت کا جذبہ بھرا ہوا تھا اور دین دشمن قوتوں سے بڑی نفرت وعداوت تھی، آپ مؤمنین سے محبت والفت رکھتے تھے اور کفار و مشرکین سے عداوت۔

(۱۶) برداشت ملامت:

ظاہر ہے کہ دین کے کام کرنے والوں کے سامنے مشکلات، رکاوٹیں، اور ملامتیں ضرور آتی رہتی ہیں، مگر داعی الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرلیں، چنانچہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ بھی بحیثیت ایک داعی الی اللہ کے آپ پر ہونے والی لعن طعن اور مشکلات وملامتوں سے کبھی بھی بددل اور بے حوصلہ نہ ہوئے تھے، آپ سے مخالفت بھی کی گئی تھی، مگر مخالفوں کے طعن وتشنیع اور زبان درازیوں کی طرف متوجہ ہوئے بغیر حضرت نے اپنی تمام تر توجہ مقصد ومنزل کی طرف لگا رکھی تھی، حضرت نے ہر آنے والی مزاحمت اور رکاوٹ کو مردانہ وار مقابلہ کرنا اپنا شعار بنالیا تھا۔

(۱۷) مخاطبین کی نفسیات کا لحاظ:

حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی ؒ کے بہت سارے مریدین متعلقین اور ایک سے زیادہ خلفائے کرام کے بیانات سے اندازہ ہوا ہے کہ حضرت نفسیات کے ماہر بزرگ تھے، جس میں آپ کے علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی قوت بھی بے شک کام کرتی تھی، حضرت مولانا کو بہت ہی کم مدت میں اور کبھی کبھار پہلی ہی نظر میں لوگوں کی نفسیات، رجحانات، میلانات اور حالات کا بخوبی علم ہوجاتا تھا، گویا حضرت مخاطبین کے حالات، نفسیات، رجحانات، میلانات کو دیکھ کر بات کرتے اور بات کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

حضرت کے متعلق حافظ جعفر الاسلام کا بیان:

گرامی قدر محترم حافظ جعفر الاسلام صاحب مقیم حال مملکت سعودی عرب حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی پوتا ہیں، صاحب زادۂ گرامی مرحوم حضرت نور الاسلام صاحب مجاز بیعت حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی کیوکتوی کا بیٹا ہیں، حافظ صاحب کو میں بچپن سے جانتا ہوں،

آپ نے مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں تعلیم حاصل کی، جسمانی اعتبار سے اللہ تعالی نے ان کو بہت ہی خوب صورت بنایا ہے، اور اخلاقی اعتبار سے بھی حسن سیرت کے مالک انسان ہیں، حافظ صاحب سے میری بار ہا ملاقاتیں رہیں، اور حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی کے متعلق ان سے بڑی اچھی معلومات حاصل کیں، آج کل جدہ میں مقیم ہیں(۱) ان سے ابتک کی میری آخری ملاقات ۲۲/۲/۲۰۱۸ء میں مکہ مکرمہ میں ہوئی، اس ملاقات میں حضرت کے حوالے سے حافظ صاحب نے جو بیان دیا تھا اس میں سے چند ضروری چیزیں حاضر خدمت ہیں۔

(۱) دادا صاحب کی ایک کرامت دیکھی گئی تھی کہ ہماری بستی کے مشرق میں جوندی ہے، اس کے پار ہماری خاندانی بہت ساری زمین اور جائداد ہیں، دادا صاحب کبھی کبھی ادھر بھی جایا کرتے تھے، ندی پار تو کرتے مگر بالکل سوکھے ہوتے تھے، نہ جانے آپ دریا پار بھی کرتے اور کس طرح سوکھے رہتے تھے؟

(۲) ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے گھر کے احاطے میں برمی آرمی کا ایک اوباش جوان گھس آیا، مرغیاں پکڑیں، دراں حالیکہ دادا صاحب گھر ہی میں موجود تھے، اب اس اوباش نے ہر چند کوشش کی مگر نکلنا تو کجا وہ گونگا، بہرہ اور اندھا ہو چکا تھا، بہت دیر کے بعد اس کا کمانڈر اسے ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر میں آیا، اور دادا صاحب سے پوچھا کہ یہاں کوئی آرمی کا جوان تو نہیں آیا؟ اب دادا صاحب نے فرمایا کہ احاطے میں اس طرف ایک جوان کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا، تم جا کے اسے ڈھونڈھ لو، اب کمانڈر اس طرف گیا تو دیکھا اس اوباش کا حال اندھا، بہرہ اور گونگا جیسا ہو چکا ہے، کمانڈر نے اسے جا کے پکڑا اور حضرت سے معافی مانگی، اب حضرت نے معاف کر دیا تو ہی وہ جا سکا تھا۔

---

(۱) آج اس مقالہ کی نظر ثانی ۲۰۲۴ء میں ہو رہی ہے، افسوس ہے کہ آج سے تقریبا دو سال پہلے محترم جعفر الاسلام صاحب کا انتقال رنگون میں ہو چکا ہے، کہتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کی راہ پر جدہ، سعودی عرب سے رنگون پہنچے ہوئے تھے، ان کو جان لیوا مرض نے آدبوچا، جس کی وجہ سے وہ رنگون ہی میں انتقال کر گئے، مجھے علم ہے کہ ان کو ارکان آنے کی بڑی تمنا تھی، لیکن سوئے قسمتی سے ارکان آنے کی راہ پر ان کو داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا، اللہ تعالی جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے۔

(۳) دادا صاحب کو کبھی بھی ہم نے برمی آرمی کے اوباشوں اور مجاہدین کے خوف سے گھر سے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا، جبھی ایسے خطرات سامنے آتے تو آپ درود سیف یعنی اللھم صل علی محمد سیف اللہ علی الظالمین وآلہ وسلم کے ورد کرتے تھے، یوں اللہ تعالی نے آپ کو ہر ظالم کے مظالم اور اوباشیت سے نجات دی، الحمدللہ تعالی یہ معمول ہمارے خاندان میں اب بھی ہے۔

(۴) ہم نے بہتوں سے سن رکھا کہ حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ساتکانوی معروف بہ بڑے پیر صاحب (مجاز بیعت حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ) کبھی کبھار سحری کے وقت دادا صاحب کے لئے لوٹا ہاتھ لئے کھڑے کھڑے انتظار کیا کرتے تھے، جب کہ حضرت مولانا عبد المجید صاحب ایک تو حضرت دادا صاحب کے پیر بھائی تھے، اور عمر میں بھی دادا صاحب سے بڑے تھے، دیکھئے اللہ والوں کی شرافت ونجابت اور احترام واکرام کا حال۔

(۵) ہم نے سنا کہ دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ساتکانویؒ نسبت یعنی سبق لیا کرتے تھے، سنا تو تھا باقی اللہ معلوم۔

(۶) حضرت دادا صاحب کے پاس انگنت لوگ سبق (نسبت) لینے آیا کرتے تھے، اور ظرف کا معاملہ ہے، جس کا ظرف جتنا بڑا اور وسیع ہوتا تھا وہ زیادہ مستفید ہو سکتا تھا، البتہ سبق اور نسبت ہر کسی کو دیتے تھے۔

(۷) دادا صاحب رحمۃ اللہ تہجد اور قیام اللیل اکثر گھر ہی میں کرتے تھے، اور کبھی کبھار مسجد کو بھی جاتے تھے، اللہ تعالی کا کرم ہے کہ دادا صاحب کے زمانے سے تہجد اور قیام اللیل کا معمول ہمارے گھر میں آج تک موجود ہے، گھر کے افراد اس کے بڑے پابند ہیں۔

(۸) دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنتیں گھر میں ادا کرتے تھے، اور جماعت قائم ہونے سے پہلے مسجد میں آتے اور نماز با جماعت ادا کرتے ہی واپس گھر چلے جاتے تھے۔

(۹) سنا تھا کہ دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا حامد حسین علوی اعظم گڑھی کی بیٹی فاطمہ کو نسبت اور سبق دیا تھا، یعنی فاطمہ نے حضرت سے بیعت کی تھی، اور حضرت اعظم گڑھیؒ کے نواسے ظفر الاسلام صاحب سے دادا صاحب کا رابطہ ہمیشہ رہا، مگر یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا ظفر الاسلام صاحب بھی حضرت کے مرید تھے یا نہیں۔

(۱۰) حضرت دادا صاحب کو میں نے اکثر دیکھا کہ دو دو گھنٹے مراقب ہوتے مگر کبھی ہلتے یا پہلو بدلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۱۱) دادا صاحب مریدوں کو نسبت اور سبق مسجد جو ہمارے گھر کے ملحق ہے میں دیا کرتے تھے، البتہ خواتین کو گھر ہی میں نسبت یا سبق دیتے تھے۔

(۱۲) دادا حضرت عام لوگوں کو طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کراتے اور نسبت وسبق بھی اس طریقۂ عالیہ سے دیتے تھے، البتہ کسی کی مناسبت دیکھ کر طریقۂ عالیہ چشتیہ، یا قادریہ، یا سہروردیہ میں نسبت دیتے تھے، اور خلفائے کرام کو سارے طرق وسلاسل کا سبق اور نسبتیں دیتے، البتہ شاذلیہ اور قرنیہ کا جہاں تک سوال ہے کہ ان دونوں طریقوں کی بہت کم لوگوں کو نسبت اور سبق دیتے تھے۔

(۱۳) فرمایا کرتے تھے کہ سلطان محمود صاحب اکیابی (سابق وزیر برائے امور صحت مرکزی حکومت برما) بڑے ذہین وفطین آدمی تھے، ہمارے ساتھ پڑھتے تھے، لیکن کتابیں نہیں خریدتے، اور دوسرے لڑکوں کی کتابوں سے مستفید ہو کر امتحان دیا کرتے، اور پاس بھی اچھے نمبرات کے ساتھ ہوتے تھے۔

(۱۴) دادا حضرت گھر میں ہوتے تو بسا اوقات کھیت کلیان دیکھنے جایا کرتے تھے، اسی طرح بھینس بیل کی ریوڑ جو ہمارے تھی، دیکھنے جایا کرتے تھے۔

(۱۵) دادا حضرت بڑے نستعلیقی کیفیت کے انسان تھے، بڑے نظیف اور نظافت پسند تھے، حتی کہ آپ کے بستر سے ہمہ وقت خوشبو آتی تھی۔

(۱۶) دادا حضرت نے چند مرتبہ کیوکتو کا سفر فرمایا، جہاں آپ ہمیشہ آپ کے خلیفہ حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈلیؒ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، میں بھی وہاں گیا تھا، حضرت نور محمد صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ گھر کی پہلی منزل میں جس پالنگ پر حضرت مولانا سویا کرتے تھے، حضرت کی کرامت ہے کہ آج تک اس پالنگ تک کسی کافرنجس کا گزر نہیں ہو پایا ہے، یہ حضرت کی زندہ کرامت ہے۔

ملفوظاتِ حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ:

(۱) ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اخلاق حسنہ کا بہتر نمونہ بنے۔

(۲) جس کے دل میں دنیا کی حرص ہوتی ہے اس میں اللہ تعالی کا انس قرار نہیں پکڑتا۔

(۳) بزرگ وہی ہے جس کے دل میں خدا کا خوف ہو، خوف خدا بڑی نعمت ہے، جس میں آمیزش میں نہیں ہے، اس کی امید میں آمیزش ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ محبوب ہونا لازمی امر ہے۔

(۵) تقوی وطہارت احسان وصبر اختیار کرنا یہ اللہ تعالی کو محبوب ہے۔

(۶) دنیا کی محبت خسارہ کا باعث ہے۔

(۷) طالب کو ''میں''، یعنی تکبر سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے۔

(۸) شریعت کے متروکات سے پرہیز واحتراز کرنا لازمی امر ہے، وہ طریقت میں رکاوٹ کا باعث ہیں، اسی لئے ہر حال میں امر کی تعمیل ہو اور منکرات سے پرہیز ہو۔

(۹) اللہ تعالی کی محبت کے لئے اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لازمی امر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے فقر وفاقہ سے دروازے کھل جاتے ہیں، اور یاد رہے کہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں لازمی امر ہے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کی محبت کے طالب کے لئے مصیبتوں اور بلاؤں سے امتحان لیا جانا ضروری ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے طالب کے لئے فقر وفاقہ سے دووازے کھل جاتے ہیں۔

(۱۱) جب اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت (کیفیت) آئے تو اس سے اف نہیں کرنا چاہے، بلکہ ھل من مزید کہنا چاہئے۔

(۱۲) طالب کو اندھیرے میں ہرگز سفر نہ کرایا جائے، خطرہ کا بہت اندیشہ ہے، جب تک کسی نسبت کا مقام نہ کھلے، یا اس میں کمال حاصل نہ ہو، اور روشنی میں روحانی کمال حاصل نہ ہو یا روشنی میں روحانی سفر طے نہ ہو، نیز آگے دوسری نسبت کا دروازہ جب تک نہ ملے نسبت نہ دی جائے۔

(۱۳) راہ خدا میں جو شئی رکاوٹ کا باعث ہو، اسے چھوڑ دینا چاہئے۔

(۱۴) خشوع وخضوع جس شخص کو حاصل ہو، اس کی صحبت سے نعمت حاصل کی جائے، اور خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کرنا مرتبہ اور ثواب میں سات گنا اضافہ کا باعث ہے۔

(۱۵) فیض کے آنے سے حیات طیبہ کی منزلیں پوری ہوتی ہیں، اس کی بڑی عزت کرنی چاہئے، اور فیض کی ناقدری سے مقام سیاہ ہوجاتا ہے، اور دوبارہ فیض نہیں آتا۔

(۱۶) نیک عمل سے مقامات میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔

(۱۷) کم کھانا کم سونا اور کم بولنا طالب کے لئے ازبس ضروری ہے۔

(۱۸) حسن عبادات، حسن معاملات، حسن معاشرات، حسن عقیدت نیز حسن اخلاق یہ وہ صفات عالیہ ہیں، جو ہر طالب میں ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

(۱۹) ہر طالب کے لئے ضروری ہے کہ خلیفۂ وقت اور مبلغ کا ادب واحترام کرے اور ان سے حسن عقیدت رکھے۔

(۲۰) شیخ کا ادب واحترام بہت ضروری ہے، اور شیخ سے بے ادبی سے فائدہ بند ہوجاتا ہے، اور یاد رہے کہ شیخ کی ناراضگی وناخوشی کا حجاب ہٹنا بہت مشکل ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ شیخ کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہے۔

(۲۱) فنافی الشیخ سے فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ملتا ہے، اور فنافی الرسولؐ سے فنافی اللہ کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔

(۲۲) مخلصانہ انداز سے خلوت میں عبادت کرنا ازبس ضروری ہے۔

(۲۳) طالب کو نام ونمود اور شہرت سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲۴) طالب کو ہمہ وقت پاس انفاس یا وقوف قلبی جاری رکھنا چاہئے۔

(۲۵) عمل میں اخلاص ومحبت ہو تو فوائد کثیر ہوتے ہیں۔

(۲۶) ہمیشہ نظر اللہ تعالیٰ شانہ پر رکھو، ماسواء اللہ پر نظر رکھنا ریا ہے، اور خود پر نظر رکھنا تکبر ہے، اور خدا تعالیٰ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

(۲۷) کلام اللہ کے احکام وہدایات، حدیث شریف کے ارشادات وہدایات، اور شیخ کے ارشادات وہدایات پر عمل کرنے سے صراط مستقیم حاصل ہوتا ہے۔

(۲۸) ہر نماز کے بعد استغفار ضروری ہے۔

(۲۹) تعلیم کے ترک کرنے سے قلب میں ایک سیاہ داغ ہوجاتا ہے، اور تعلیم کے بغیر کام کرنے سے فائدہ بہت کم محسوس ہوتا ہے، اور کام میں ہزاروں ایک کا فرق ہوجاتا ہے۔

(۳۰) یاد رہے کہ مراقبہ یک سوئی فکر کا نام ہے، مراقبہ چوبیس گھنٹے میں چار مرتبہ لازم ہے، بلحاظ حالات سہولت کے پیش نظر ظہر کے وقت مراقبہ کے عرصہ میں کمی بھی کی جاسکتی ہے، جس کی تلافی کرنی ضروری ہے۔

(۳۱) طالب کے لئے اکل حلال اور صدق مقال انتہائی ضروری ہے۔

(۳۲) دنیا کو دین بنانا چاہئے۔

(۳۳) مشتبہ اشیاء کے استعمال اور صحبت غیر سے پرہیز بہت ہی لازمی امر ہے، بدپرہیزی سے فوائد بند ہوجاتے ہیں۔

(۳۴) شیطان جن قلوب کو نجس کردیتا ہے، ان میں عبادت سے حلاوت نہیں آتی۔

(۳۵) یقین پر فوائد کا مدار ہے۔

(۳۶) برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا چاہئے۔

(۳۷) اعمال صالحہ سے قلوب کو استوار کرنا چاہئے، تاکہ سلوک کی منزلیں آسانی سے طے ہوں۔

(۳۸) سالک کو چاہئے کہ ''اندرون آشنا، بیرون بیگانہ'' کے مانند رہے۔

(۳۹) کام آپس میں مشورہ کے ساتھ کیا جائے۔

(۴۰) وسیلے کو مضبوطی سے تھامو، اور مجاہدہ طریقۂ تعلیم اور ہدایات کے بموجب کرو، تاکہ فائدے ہوں۔

(۴۱) بیعت ہر سلسلہ میں لی جاتی ہے، اور بیعت کے بعد تعلیم دوسرے مبلغین بھی دے سکتے ہیں، مگر تعلیم حتی الامکان ابتدا سے انتہا تک ایک ہی شخص کو دینا چاہئے، اشتراک عمل سے متعلقین کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۴۲) ختم شریف، فاتحہ شریف، درود شریف، اذکار، مراقبہ یہ فرائض باطنی ہیں۔

(۴۳) واقعات اور مشاہدات کا انکشاف طریقہ کے لئے اکثر بدنامی وبے وقعتی کا سبب ہوتا ہے، ان مشاہدات میں تمیز کرنی چاہئے، یہ کبھی روحانی تربیت سے ہوتے ہیں، یا کبھی امتحان یا اعلام سے۔

(۴۴) نسبت دینے کے لئے ان حضرات کو مقرر کیا جائے جن کے قلب کا مکمل سلوک مکمل ختم ہو چکا ہو۔

(۴۵) سود خور یا ناجائز آمدنی کھانے والے حضرات کو پانچ ہزار مرتبہ درود شریف پڑھایا جائے

بشرطیکہ وہ آئندہ کے لئے ثابت قدم ہو چکے ہوں۔

(۴۶) دیکھنا معیار فضیلت نہیں ہے، تجربہ اکثر امتحان کے واسطے کرایا جاتا ہے۔

(۴۷) مشاہدات کے ذریعے جو معلومات ہوں، ان کا انکشاف اکثر سلب کا موجب ہوتا ہے۔

(۴۸) توکل وصبر طالب کے لئے بہت ضروری ہے۔

مرثیہ بروفاتِ حسرت آیات شیخ طریقت حضرت شاہ صوفی

مولانا عبدالسلام صاحب ارکانیؒ متوفی: ۱۷رجون ۱۹۶۸ء

رخِ زیبا تھا جن کو نور افشاں	نگاہیں جستجو میں جن کو حیراں
گلستاں پر بہاریں جو رہی تھیں	خزاں دیدہ ہے بے رونق ہے بے جاں
چلے معشوق کے دیدار میں تم	رلاکر سب کو اے محبوبِ رحماں
ہوے آزاد قیدِ عنصری سے	بنے ہو طائرِ قدسی گلستاں
ہوے محبوب سے مل کر کے تم خوش	جدائی میں ترے لاکھوں ہیں گریاں
توجہ تھی تری اکسیرِ اعظم	دلِ عشاق اس سے زیست ساماں
قلوبِ قاسیہ کی تھی جو صیقل	خذاقت تیری بر اصلاحِ انساں
تری تعلیم و تلقین تزکیہ سب	بتحریکِ لطافت برقِ ساماں
ہزاروں دل اجاگر کر گئے تم	تری تھی تربیت شمعِ شبستاں
وہ سادی زندگی تقوی طہارت	وہ اخلاق حسن چوں خلقِ قرآں
وہ پرواز بلندی صبر و ہمت	وہ استغراق اور استقلال اور عرفاں
تھا تو اسلاف کا نادر نمونہ	ترے اخلاق اخلاقِ بزرگاں
گئی ہے عمر تیری خدمتوں میں	افادہ با اضافہ تھا تری شاں
مکیں کون و مکاں کا تھا تو لیکن	ترے ادراک میں افلاک حیراں
ترے کشف و کرامت کا وہ عالم	حجابِ عنصری تجھ سے گریزاں

طریقت کے تمامی سلسلوں میں	رہا تو ناخدائے بحرِ عرفاں
فیوضِ صحبت و کیفِ توجہ	کئے مردہ دلوں کو زندہ شاداں
ترا رتبہ ہمیں کیا ہو تصور	مکاں سے لا مکاں تک تیرا جولاں
تری روشن ضمیری کیا بیاں ہو	خجل ہے تیرے آگے مہرِ تاباں
زمیں ہے شور سا قلب مکدر	تیری صحبت سے لاکھوں اب گلستاں
بنے ہو ساکنِ دار السلام اب	تم اے عبد السلام شیخِ عرفاں
بسال ہشت و شصت و صد نور دہ	بہفدہ جوں ہوے واصل بہ یزداں
جو سچا عشق لے آیا ترے پاس	ہوا ہے پورا اس کے دل کے ارماں
جو درد دل کو لے آیا ترے ہاں	ملا ہر درد دل کا اس کو درماں
رزائل کو فضائل سے بدلنا	مہارت تجھ کو تھی از طرف یزداں
جدائی میں تری بے تاب سارے	یتیموں جیسے روتے ہیں مریداں
وہ تیری خندہ پیشانی مروت	مزاحی گفتگو گہ گہ بیاراں
امیر آئے کوئی یا کوئی مفلس	ترے دربار میں تھے سب ہی یکساں
رہی دنیا تری قدموں پہ لیکن	ترا دل خالقِ دنیا پہ قرباں
ترا فضل و کرم ہو یا الٰہی	نہ ہو نسبت سے ان کی ہم کو حرماں

ازطرف

محدث العصر مفکر اسلام صاحب طرز ادیب

علامہ ابوالبرکات محمد فضل اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فرخالوی

مولانا عبدالشکور صاحب کی ولادت ۱۸۹۸ء میں موضع فرخالی شمالی بوسیدنگ کے ایک دیندار گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد ایک شریف، دین دار اور زاہد قسم کے انسان تھے، اور والدہ بھی بڑی نیک صفات خاتون تھی۔

مولانا عبدالشکور صاحب کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے علاوہ علاقے کے مدارس میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے عالمیت کے درجہ تک تعلیم حاصل کر وطن واپس آئے تھے، وطن واپس آنے کے بعد آپ درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور علم دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا، البتہ رہ رہ کر دعوت وتبلیغ کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف توجہ دلاتے رہے تھے۔

۱۹۴۲ء میں جب ارکان کے مسلمانوں پر بلا کا سایہ پڑا تو آپ اس بلا کو ہٹانے کے میدان جہاد وکفاح میں کود پڑے، اور ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے خود بھی جہاد کے میدان میں اترے اور لوگوں کو بھی جہاد کے لئے تلقین کی، کہتے ہیں کہ مولانا بڑے پائے کے خطیب ومقرر تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء کے جہاد کے دوران آپ نے اپنے دل جلے اور شعلہ بیان خطاب کے ذریعے بہت سے لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کئے تیار کرلیا، اور بنفس نفیس اپنی جان اور مال سے جہاد اسلامی میں شرکت کی تھی۔

۱۹۴۳ء کے بعد جب شمالی مغربی ارکان میں ''شانتی کمیٹی'' کے نام سے مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں آپ شمالی جوسیدنگ والی کمیٹی کے رکن رہے، اس کمیٹی کے تحت آپ نے بہت ساری دینی، ملی، سماجی اور سیاسی خدمات انجام دی تھیں۔

بعد میں آپ نے اپنی بقیہ زندگی درس وتدریس اور خدمت قوم میں گزاری، اور ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ آپ کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ ایک عالم دین، داعی الی اللہ اور بڑے مجاہد فی سبیل اللہ تھے، اللہ آپ کے درجات بلند فرمائے، امین یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب میورکلی ارکانی

مولانا عبدالشکور صاحب کی ولادت انیسویں صدی کی آخری دہائی میں موضع میورکل میں ایک دیندار اور علم دوست گھرانے میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد ایک دیندار، زمیندار اور سخی انسان تھے، علاقے بھر میں پرہیزگاری کے حوالے سے یکتائے روزگار مانے جاتے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی، بڑے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق آپ نے اپنی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مکمل کی، فراغت تعلیم کے بعد آپ نے عمدۃ السالکین، زبدۃ العارفین حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی نقشبندی مجددی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت شیخ المشائخ محی الدین ابوالخیر صاحب دہلوی) سے ناطہ جوڑا، اور طویل مدت تک ان جیسی بابرکت ہستی کے سائے تلے ریاضت ومجاہدہ کے بعد علم وعرفان سے مالا مال ہو کر مجاز بیعت ہوئے تھے۔

بعد ازاں مولانا وطن واپس لوٹے اور اپنے علاقے کے مدارس میں دینی تعلیم کو فروغ دیا، ساتھ ہی ساتھ لاکھوں بندگان خدا کو اپنی دعوتی خدمات کے ذریعے مستفید کیا، آپ ایک شیخ کامل تھے، تصوف کی دنیا میں آپ کا بڑا نام ہوا، آپ کے بہتوں خلفاء اس علاقہ میں گزرے، ارکان کے طول عرض میں آپ نے تصوف کے رشتے سے سفر کیا، چنانچہ ہزاروں بندگان خدا آپ کے مرید ہوئے تھے۔

مولانا کا مزاج جمالی تھا، لوگوں سے بڑی محبت کرتے تھے، اور سخاوت میں بھی اپنے والد کی طرح آپ نے بڑا نام پیدا کیا تھا، علمی پختگی کے ساتھ ساتھ اخلاقی بلندی بھی تھی، عرصۂ دراز تک دنیائے عرفان میں آپ نے بڑی بڑی خدمات انجام دیتے ہوئے اس جہان فانی سے رخصت لی۔

یاد رہے کہ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی کے اور خلفاء بھی ارکان میں تھے، مگر آپ کو یہاں ان کا خلیفۂ اعظم کہا جاتا تھا، میں نے اپنے ننہال کے چند بزرگوں کو دیکھا جو آپ کے منتسبین میں تھے، اور ایک بزرگ کو ایسا بھی دیکھا کہ وہ شیخ کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے تھے، چنانچہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ وہ بزرگ فنا فی الشیخ کے درجہ تک پہنچے ہوئے تھے۔

حضرت مولانا حاجی عبدالغفور صاحب بندری

حضرت مولانا عبدالغفور صاحب کی پیدائش موضع بندر مروہانگ میں اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائی میں ہوئی،شنید ہے کہ آپ کے والد ایک عالم دین اور سیاست دان تھے،اور خاندان بھی حکمران خاندان تھا،آپ کے خاندان کے پچھلوں میں علماء،صلحاء،شعراء اور سیاست دان پیدا ہوئے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی،ارکان کے دیگر مشائخ سے بھی مستفید ہوئے،بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا،علاوہ ازیں ہندوستان کی بعض دینی درس گاہوں سے مستفید ہوکے وطن واپس آئے تھے۔مولانا تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے،اور پند و نصیحت کے ساتھ درس وتدریس میں بھی مشغول رہے،بعد میں حج بیت اللہ اور زیادت مدینہ منورہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

آپ ایک جلیل القدر عالم دین تھے،جہاں تک پتہ چلا کہ آپ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ تھے، مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کے مرشد کون تھے،آیا آپ کسی ارکانی مرشد کی تربیت یافتہ تھے یا کسی بنگالی یا ہندستانی مرشد کے فیض یافتہ،تاہم آپ کے متعلق اس بات کا ضرور پتہ چلا کہ آپ میلاد اور قیام کو پسند کرتے تھے،کہتے ہیں کہ آپ نے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی،جس میں میلاد النبی صلی اللہ کے حوالے سے بہت سی باتیں درج تھیں،اور میلاد وقیام کے طریقے بھی اس کتاب میں بتایا گیا تھا۔

مولانا جس مسلک کے کیوں نہ ہو،اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین،شیخ طریقت اور صاحب تصنیف بزرگ تھے،ذہین وفطین اور نہایت تیز وطرار بھی تھے،آپ کے حلقۂ درس سے فارغین اور آپ کے متبعین سب کے سب میلاد اور قیام سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے،آپ نے ایک طویل مدت تک وعظ ونصیحت،درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے حلقے کو گرم رکھتے ہوئے بالآخر مروہانگ میں وفات پائی،انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالکریم مجاہد یکمائی فاروی تنگ بازاری

مولانا عبدالکریم بن مولانا عبدالرحمن مئی/۱۹۶۷ء میں یکمائی فارہ تنگ بازار میں پیدا ہوئے،آپ کے والد بڑے عالم اور خدا ترس بزرگ تھے،اور والدہ بھی بڑی اعلیٰ صفات کی دیندار خاتون تھی۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے علاقے کی معروف درسگاہ مدرسہ عربیہ دارالعلوم تنگ بازار سے حاصل کی، اور دینی تعلیم کے تہ بتہ سرکاری اسکول میں بھی داخلہ لیا،جہاں سے پانچویں کلاس تک کا امتحان امتیازی شان کے ساتھ پاس کیا،جہاں تک پتہ چلا کہ آپ برمی زبان بڑی روانی سے بول سکتے تھے،حتی کہ آپ کے انداز گفتگو سے بسا اوقات برمی اہل زبان بھی حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔

مولانا ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے کہ آپ کے لئے اپنے وطن کی زمین تنگ ہوگئی تھی، اس کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ مولانا کی فطرت میں اظہار حق کا غلبہ تھا،جس کی وجہ سے طاغوت اور اس کے لالے پائے غنڈے آپ کے پیچھے پڑ گئے تھے،یوں مولانا نے عنفوان شباب ہی میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا،اس حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب جو مولانا مرحوم شہید کے قریبی دوستوں میں تھے،رقمطراز ہیں کہ:

> ”مولانا عنوان شباب میں قدم رکھ چکے تھے،جوانی کے پھل سے متمتع ہورہے تھے،باغ وبہار کی لذت اور عشق ومحبت سے آشنا ہورہے تھے،لیکن اس عین خوشی اور مسرت کے دوران تنگ بازار کی زمین مولانا کے لئے تنگ ہوگئی،اور مولانا کی دوراندیش نگاہ نے مستقبل کے مصائب دیکھ لئے تھے“۔(۱)

بہرحال مولانا ۱۹۸۸ء میں اپنا وطن چھوڑ کر کراچی پہنچ گئے،اور ۱۹۸۹ء میں مدرسہ مدینۃ العلوم نارتھ ناظم آباد کراچی میں داخلہ لیا،جہاں سے آپ نے درجۂ خامسہ تک تعلیم حاصل کی،پھر بقیہ دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا،جہاں سے ۱۹۹۲ء میں سند فراغت

(۱)مولانا حافظ محمد صدیق،مشاہیر ارکان برما،ص:۲۳۶۔

حاصل کرلی تھی۔

فراغت سے ایک سال پہلے ۱۹۹۱ء میں آپ حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان برما کے معاون بنے، جس کے بعد حرکۃ الجہاد کے مجاہدین کے ساتھ افغانستان چلے گئے، جہاں سے آپ نے عسکری تربیت بھی حاصل کرلی تھی، چنانچہ اس حوالے سے مولانا محمد صدیق لکھتے ہیں کہ:

''مولانا جانتے تھے کہ تربیت حاصل کئے بغیر اپنا دفاع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی خدمت کرنا مشکل ہے، اس لئے کسی جہادی تنظیم میں شمولیت اختیار کرکے ٹریننگ کے سلسلے میں افغانستان جانا چاہئے، چنانچہ مولانا رجب المرجب/ ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۹۹۱ء میں حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان برما کے معاون بنے، اور شعبان المعظم میں عسکری تربیت کے سلسلے میں حرکت کے مجاہدین (راقم الحروف اس قافلۂ حق کا امیر تھا) کے ساتھ افغانستان چلے گئے، اور افغانستان میں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزار کر بڑی محنت اور لگن سے جہادی ٹریننگ حاصل کی''۔(۱)

۱۹۹۳ء میں مولانا مدرسہ مظاہر العلوم لطیف آباد (حیدرآباد) کے مدرس مقرر ہوئے، جہاں تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا مفتی وجیہ اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے افتاء کے اصول وضوابط سیکھے، مولانا حافظ محمد صدیق کے بیان کے مطابق مولانا شہید نے کافی تعداد میں فتاویٰ لکھے، جو ایک مسودہ کی شکل میں محفوظ ہیں۔

مولانا نے مذکورہ مدرسہ میں نور الانوار اور ہدایہ اول جیسی کتابیں پڑھائیں، ساتھ ساتھ دو سال تک مدرسہ کی مسجد میں بعد نماز فجر درس قرآن بھی دیا، پھر ۱۹۹۶ء میں مسجد اولیاء، لطیف آباد کے امام مقرر ہوئے، جو مدرسہ مظاہر العلوم کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور اس مسجد ہی میں رہنے کے دوران مولانا کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

۱۹۹۵ء میں حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان برما کا یونٹ حیدرآباد میں قائم ہوا، مولانا اس یونٹ کے صدر مقرر ہوئے، مولانا نے دو سال تک وہاں بڑی محنت وکوشش کرکے عوام کی ذہن سازی کی اور

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۳۷۔

حرکۃ الجہاد کے لئے فضا ہموار کی تھی، آپ نے وہاں کی دیگر مساجد میں جا جا کر تقریریں کیں اور برمی مظلوم مسلمانوں کی داستان مظلومیت سنائی تھی۔

۱۹۹۷ء میں مولانا نے حرکۃ الجہاد الاسلامی کے مندوب بنے سعودی عرب کا سفر کیا، مکہ المکرمہ میں پائی جانے والی برمی برادری کے دینی مدارس کے مدیروں اور اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور جگہ جگہ دورہ کرکے عوام الناس کی ذہن سازی کی تھی۔

۱۹۹۸ء میں مولانا کی شادی اپنی پھوپی زاد بہن سے ہوئی، اور اگلے سال ۱۹۹۹ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ دوبارہ حج بھی کیا تھا، مولانا کی اہلیہ محترمہ کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق لکھتے ہیں کہ:

''۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۸ء میں مولانا کی شادی اپنی پھوپی زاد محترمہ۔۔۔۔ بنت مولانا محمد ایوب صاحب سے ہوئی، رب ذوالجلال نے محترمہ صاحبہ کو حسن صورت اور حسن سیرت سے نوازا، مولانا کو ان سے بے انتہا محبت اور چاہت تھی، وہ چاہتے تھے کہ انہیں تعلیم دلوا کر عالمہ بنائیں، اس نقطۂ نظر کے تحت ان کو مدرسۃ البنات حیدرآباد میں داخل کروا دیا تھا، مولانا کی شہادت کے وقت محترمہ درجۂ رابعہ کی ذہین وفطین طالبہ تھیں''۔(۱)

مولانا کو ۲۰ / جمادی الثانی بمطابق یکم/ اکتوبر/ ۱۹۹۹ء بروز جمعہ بعد نماز عشاء ظالموں نے شہید کر ڈالا، قتل کے بعد ظالموں نے آپ کو بوری میں ڈال کر کچرا کنڈی پھینک دیا تھا، آپ کی شہادت کے سبب پر حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''قدرت کے نظام اور اصول کے مطابق موت کسی سبب کے تحت ہوتی ہے، آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ مولانا کی شہادت کا اندوہناک واقعہ اور ظلم وبربریت کا اتنا بڑا حادثہ کس طرح پیش آیا، مولانا کو کچھ پیسوں کی ضرورت تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنی زوجۂ محترمہ کی زیورات فروخت کرنا چاہتے تھے، زیورات فروخت کرنے کے لئے

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۳۸۔

ایک ہفتہ تک مولانا نے کوششیں کیں، لیکن ناکامی ہوئی، مولانا زیورات ۱۹ ہزار روپئے سے کم میں نہیں دے رہے تھے، جب کہ سنار حضرات ۱۸ ہزار روپے دینا چاہتے تھے، بالجملہ ۲۰ / جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق یکم/ اکتوبر/ ۱۹۹۹ ء بروز جمعہ حسب معمول مولانا نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور خطبہ دیا، سامعین کا کہنا ہے کہ آج کی تقریر کا انداز اور لہجہ بالکل الگ تھا، ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ مولانا کی آخری اور الوداعی تقریر ہے، ہفتہ کی رات عشاء کی نماز پڑھائی، اور گھر چلے گئے، بقول بیوی صاحبہ کہ عشاء کے بعد مولانا دس منٹ کے لئے نکلے، پھر واپس نہ آئے، بلکہ اتوار کو مولانا کی لاش زخمی شہادت کی حالت میں ملی، اس دوران کیا کھیل کھیلا گیا، وہ قاتلین اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، تاہم قرائن اور علامات کے تحت ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عشاء کے بعد ظالموں نے مولانا کا گھراؤ کرلیا، سب سے پہلے لوہے کے ڈنڈوں سے مارا، جس کا مولانا نے مقابلہ کیا، پھر مولانا کو گرا کر کند چاقو سے ذبح کرڈالا، مولانا پر بہت ہی زیادہ تشدد ہوا، چہرے، ہاتھ اور کلائیوں پر سیاہ داغ اور نیلے دھبے واضح طور پر نظر آرہے تھے، سر پر جگہ جگہ زخم تھے، قتل کرنے کے بعد بوری میں ڈال کر نعش ڈگری کالج کے ساتھ کچرا کنڈی میں رکھ دی گئی، ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات نعش ملی، ملتے ہیں سول ہسپتال حیدرآباد پہنچادی گئی، پیر کو ساڑھے دس بجے لاش وارثین کو ملی، مولانا کی شہادت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی، ہر طرف سے لوگ آرہے تھے، علماء، فضلاء، طلباء اور عامہ الناس کا سیلاب تھا، جو مدرسہ مظاہر العلوم کی طرف آرہا تھا، ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، ہر ایک حسرت و یاس کی حالت میں اخبار میں شائع شدہ لاش دیکھ رہے تھے اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، اور لوگ ان بے رحمانہ تشدد و بربریت پر غم و غصہ کا اظہار کررہے تھے، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے نماز جنازہ کے لئے صف بندی کی گئی، کل پندرہ صفیں ہوئیں، ہر ایک صف تقریبا ۱۵۰ افراد پر مشتمل تھی، شیخ الحدیث مولانا محمد وجیہ صاحب دامت برکاتہم نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد مظاہر العلوم سے ڈیڑھ میل دور جنوب مغرب میں واقع قبرستان میں مولانا شہید مرحوم کو دفنایا گیا"۔(۱)

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۳۸۔۲۳۹۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب زادی فرانگی

مولانا عبدالقادر صاحب راسیدنگ کی مردم خیز بستی زادی فرانگ میں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب ایک مال دار اور زمیندار ہونے کے ساتھ نہایت پرہیز گار اور خدمت خلق کے رسیا انسان تھے، اور والدہ بھی اطلاع کے مطابق پارسا اور عابدہ خاتون تھی۔

مولانا کی تعلیم کے متعلق جہاں تک پتہ چلا کہ اپنے علاقے میں آپ کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم ہوئی تھی، کچھ بڑے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور مدرسہ عالیہ چندن پورہ چاٹگام سے تکمیل کی سند حاصل کی تھی۔

مولانا تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے، اور تعلیم و تعلم تبلیغ وارشاد میں حصہ لینا شروع کردیا، آپ ۱۹۴۲ء کے ہنگامۂ رستخیز میں جناب مرحوم محمد جرنیل صاحب زادی فرانگی کے ساتھ مجاہدین میں شامل ہوکر مگھوں سے زبردست مقابلہ کیا، یوں آپ کی روشن خدمات اور کارنامے کے ناطے ہزاروں مسلمانوں کی جان بچ گئی تھی۔

حضرت قائد تحریک محمد جعفر حسین قوال صاحب رنگون سے واپسی پر چند دن مولانا کے گھر ٹھہرے تھے، بعد میں عوام کو آپ نے جہاد کی زبردست تلقین کی تھی، اور آپ کے ولولہ انگیز خطاب، وعظ و نصیحت اور جہاد کی تلقین سے سینکڑوں مجاہدین اس علاقے سے جہاد کے لئے تیار ہوگئے، یوں آپ نے ایک بڑی جماعت کو جہادی قافلے کے لئے تیار کردیا تھا۔

علاوہ ازیں جہاد کونسل کے لئے افرادی قوت کے ساتھ ہی ساتھ مالی تعاون کے حوالے سے آپ کی روشن خدمات موجود تھیں، آپ جہاد کونسل کے لئے دامے درمے قدمے سخنے ہر اعتبار سے مدد پہنچاتے رہے تھے، اور جہادی قافلے میں ہونے والے اختلاف کو ختم کرانے کی ہر چند کوشش کرتے تھے۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ علمی پختگی اور تقوی شعاری کے ساتھ ساتھ آپ کے اندر سیاسی بصیرت بھی کافی تھی، غیرت و حمیت کے حوالے سے آپ یکتائے روزگار تھے، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین، یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب نلبنوی

حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب کی ولادت ۱۹۱۵ء میں جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی نلبنیہ میں ہوئی، آپ کے والد نے آپ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے منت مانی تھی کہ اللہ تعالی ان کو ایک فرزند عطا کرے گا تو اسے کسی دوسرے کام میں لگانے کے بجائے ایک عالم دین بنانے کی کوشش کیا جائے گا، چنانچہ اللہ تعالی نے ان کی منت پوری کی کہ ان کا یہ باسعادت بیٹا دنیا میں آیا جو ایک عالم دین بننے کے ساتھ ایک عظیم داعی الی اللہ بن کر نہ صرف ارکان بلکہ برما کی فضاء میں بھی چمک اٹھا تھا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب کے بعد مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ہوئی، مولانا نے یہاں ان حضرات علمائے عظام سے اکتساب فیض کیا، جو از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نہ صرف فیض یافتہ تھے بلکہ انہوں نے اس علاقہ میں دارالعلوم کے طرز طریقہ پر درس دے کر ایک دنیا کو روشن اور منور کیا تھا، جن میں: حضرت مولانا خلیل الرحمن نلبنوی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب گدو سراوی، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب گدوسراوی قابل ذکر اور نا قابل فراموش ہیں۔

مولانا عبدالقدوس صاحب نے مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پا کر ۱۹۴۰ء میں اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے جا کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، دراں حالیکہ اس ادارہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب آسمان علم و عرفان، دعوت و تبلیغ کے ستارے بنے چمک رہے تھے، آپ نے ان حضرات کے علاوہ بھی دیگر اعلی مدرسین سے اکتساب فیض کیا ، اور ۱۹۴۲ء میں اسی ادارہ سے فراغت حاصل کی، دوران تعلیم کے حالات بیان کرتے ہوئے مولانا حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

> ”مولانا (مظاہر علوم سہارنپور میں) داخلہ لینے کے بعد علم کے رموز واسرار کی تلاش وجستجو میں اس طرح منہمک ہو گئے تھے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے، کہاں کیا ہو رہا تھا کچھ پتہ نہیں تھا، بلکہ عجیب بات یہ بھی سننے میں آئی کہ گھر سے جو خطوط آتے

> تھے انہیں پڑھنے اور جواب دینے کے بجائے سارے خطوط و مراسلے ایک ڈبہ میں رکھ لیا کرتے تھے، جب دوست واحباب پوچھتے کہ خط میں کیا لکھا ہے تو حضرت جواب دیتے کہ خط ابھی پڑھا نہیں، کیوں کہ پڑھنا بے کار ہے، یا تو اس میں مسرت اور خوشی کی بات ہوگی یا غم و پریشانی کی، جو بھی ہو عالم فاضل ہونے سے قبل گھر تو جانا نہیں، اس لئے خواہ مخواہ خط پڑھ کر ذہن کو متشوش کرنا بے سود ہے، اس سے پڑھائی میں خلل آئے گا۔
>
> جب سال ختم ہو جاتا، تعطیلات کے ایام شروع ہوتے اور اکثر طلباء چلے جاتے تو مولانا عشاء کی نماز پڑھ کر کسی خالی کمرہ میں تشریف لے جاتے اور ڈبے کھول کر ترتیب وار پورے سال کے آمدہ خطوط پڑھتے، کبھی ہنستے اور کبھی مسکراتے اور کبھی رو دیتے تھے، مطلب یہ ہے کہ ہنسنے والے خطوط پڑھ کر ہنستے اور رلانے والے مراسلات پڑھ کر روتے، پوری رات یونہی گزار دیتے تھے“۔(۱)

۱۹۴۲ء میں مولانا مظاہر العلوم سہارنپور سے فراغت کے بعد وطن واپس ہوئے، اور مدرسہ عالیہ شقدار فارہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، متوسطہ کی کتابیں پڑھاتے رہے، لیکن درس وتدریس میں جوں جوں وقت گزر رہا تھا، آپ کے دل سکون وطمانیت سے محروم ہو رہا تھا، آپ کے دل میں یہ آرہا تھا کہ صرف مدرسہ کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر درس وتدریس کے ذریعے معاشرہ کی اصلاح ممکن نہیں، چنانچہ ایسی فکر کی جائے کہ جس کے ذریعے اصلاح معاشرہ بھی ممکن ہو، اور اعلاء کلمۃ اللہ بھی ہو سکے، تو آپ نے اس کام کے لئے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی بنا کردہ تبلیغی جماعت کی راہ لی، جن کے روشن کارنامے آپ نے بذات خود مرکز تبلیغ کے علاوہ زمانہ طالب علمی میں مظاہر العلوم میں دیکھے تھے، ویسے مدرسہ سے مستعفی ہو کر تبلیغی کام کو اپنی حرز جان بنا لیا تھا، اور ہمیشہ کے لئے تبلیغی مشن کا ایک پرزہ ہو گئے تھے، چنانچہ وقت کے ساتھ آپ کی شہرت نہ صرف ارکان میں ہوئی، بلکہ پورے برما میں بھی آپ کا نام

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۷۲-۷۳۔

محتاج تعارف نہیں رہا تھا۔

مولانا بڑے دل دردمند عالم دین، دل جلے مبلغ اور صاحب دل وسوز داعی الی اللہ تھے، آپ کی صفات عالیہ شمار کی جائے تو ایک دفتر کی ضرورت ہوگی، طبیعت میں نرمی اور زبان میں حلاوت ولطافت اور چال چلن میں بندگی ٹپکتی ہوئی نظر آتی تھی، تقوی و پرہیزگاری آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، مشتبہ چیزوں سے پرہیز آپ کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا، آپ کی فکر رات ودن صرف یہی تھی کہ سرزمین ارکان اور برما سمیت پوری دنیا میں اسی دعوت کو کیسے پہنچادیا جائے، اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر کیسے لایا جائے ،اللہ تعالی نے آپ کے دل میں خوف خدا کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا مخلوق خداوندی کے ساتھ رحم کرنے کو آپ نے اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا، آپ کے سامنے سے کوئی بھی انسان پریشان ہوکر نہیں جاتا تھا، آپ کا کام تھا کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو کیسے جوڑ دیا جائے۔

۱۹۹۵ء میں جب برمی حکومت کے لالے پالے غنڈوں اور حکومت کے اسلام دشمن افراد نے مل کر آپ کا قائم کردہ تبلیغی مرکز جو شقدارفارہ کے جوار میں تھا کو متقفل کردیا تو مولانا ایسے بے چین اور مضطرب ہوگئے کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اب مولانا کی زندگی کا آخری دور ہے، مولانا ہو سکتے ہیں کہ چند دن کے مہمان ہیں، چنانچہ مارچ/ ۱۹۹۸ء میں جب اس مسجد کو شہید کردیا گیا تو آپ نیم پاگل ہوگئے تھے، تاہم لوگوں کی تشویش کے برعکس کچھ دنوں کے بعد آپ سنبھل گئے، اور مدرسہ شقدارفارہ کے احاطے میں موجود مسجد کو از سرنو تبلیغی مرکز قرار دے کر آپ وہیں کے ہوگئے تھے۔

مولانا کی پہلی شادی بڈ ڈیل منگڈو والی ایک خاتون سے ہوئی، اور دوسری شادی مولانا قاری ارشاد احمد صاحب کی ہمشیرہ سے ہوئی، آپ کی اولاد میں جناب مولوی حافظ قاری محمد اسحاق صاحب بڑے اچھے انسان ہیں، اور جید عالم دین بھی، آپ کی ایک صاحب زادی مولانا عبد الغفار صاحب کے نکاح میں ہیں تو دوسری صاحب زادی آپ کے بھتیجہ کے حرم میں ہیں۔

مولانا مرحوم کے معاصرین میں مولانا عبد المتین بن عبد الرحمن صاحب راجار بیلوی فاضل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور مقیم کراچی، سن فراغت ۱۹۴۷ء، اور رئیس المبلغین حضرت مولانا محمد صالح بن محمد یحیی صاحب رنگونی، سن فراغت ۱۹۴۰ء، اور مولانا مفتی محمد حسین صاحب تنگ بازاری سن

فراغت ۱۹۴۰ء اور مولانا ولی اللہ صاحب ارکانی سن فراغت ۱۹۴۰ء، مولانا عبد الحکیم صاحب رنگونی، مولانا عبد الودود ارکانی، مولانا سید احمد بن محمد یونس، مقیم کراچی قابل ذکر ہستیاں ہیں۔

مولانا عبد القدوس صاحب نے ۱۹۹۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد آپ ۳/ اپریل/ ۲۰۰۰ء، ۲۷/ ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ بروز پیر خالق حقیقی سے جاملے، آپ کا انتقال حقیقت میں ایک عالم کے انتقال کے برابر ہے، آپ کے انتقال کی وجہ سے سرزمین ارکان کے باشندے اپنے ایک عظیم دینی اور روحانی رہنما سے محروم ہو گئے ہیں، اللہ تعالی آپ کو بے شمار نعمتوں سے مسرور کرے۔ آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا عبدالمتین صاحب راجار بیلی منگڈوی

مشہور عالم باکمال مولانا عبدالمتین بن عبدالرحمن کی پیدایش ۱۹۲۰ء میں موضع راجار بیل منگڈو میں ہوئی، راجار بیل منگڈو ٹاون سے جانب مشرق تین میل کے فاصلے پر واقع ہے، جو کائندہ فارا کے قریب ہے، مولانا کے والد جناب عبدالرحمن صاحب مرحوم بڑے عالم دوست، نہایت دین دار، خدا ترس اور متقی انسان تھے، انہوں نے اپنے نونہال صاحب زادے کو دینی مدارسہ میں داخل کر کے امت مسلمۂ ارکان پر یک گونہ احسان کیا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم علاقے کے چند ہستیوں سے حاصل کی، ان میں درج ذیل حضرات ناقابل فراموش ہیں:

(۱) حضرت مولانا عبدالرشید شقدار فاروی صاحب۔

(۲) حضرت مولانا افلاطون صاحب قمرالڈیلوی۔

(۳) حضرت مولانا محمد نسیم صاحب دورہ بیلوی۔

(۴) حضرت مولانا تاج الملوک صاحب غنیّۃ فاروی۔

(۵) حضرت مولانا قاری عبدالرشید صاحب نوراللہ فاروی۔

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا عبدالمتین صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، کچھ بڑے ہوئے تو علم دین کے حصول کے لئے آپ کے دل میں آرزو موجزن ہوئی تو ہندوستان کی راہ لی اور ۱۹۳۵ء میں مدرسہ کھٹرا مسی خان سنبھل مراد آباد میں جا داخل ہوئے، یہاں ایک سال پڑھ کر ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی عظیم و نامور درسگاہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، داخلہ امتحان دیئے تو پاس ہوئے، امتحان تو آپ نے قافیہ اور قدوری وغیرہ کتاب کا دیا، لیکن جس استاد نے آپ سے امتحان لیا ان کی خواہش پر شرح مآۃ عامل وغیرہ دوبارہ آپ کو پڑھنا پڑا تھا۔

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں آپ نے دس سال یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کی، یہاں کے باکمالوں سے خوب خوب مستفید ہوئے، اساتذہ کرام کی نظریں بھی آپ پر بہت اچھی رہی تھیں، آخر کار آپ

نے ۱۹۴۷ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں جن اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام درج کر دیئے جائیں:

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ۔

(۲) حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ۔

(۳) حضرت مولانا منظور احمد صاحبؒ۔

(۴) حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوریؒ۔

(۵) حضرت مولانا اسعداللہ صاحبؒ۔

(۶) حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ۔

مولانا عبدالمتین صاحب نے مظاہر علوم سہارنپور سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بھی کچھ مہینے تعلیم حاصل کی، یہاں آپ نے دورۂ تفسیر کے درجہ میں داخلہ لیا تھا، اور روایت ہے کہ آپ نے یہاں تقریبا چھ مہینے تک تعلیم حاصل کی، یہاں کے بعض جلیل القدر عالموں سے استفادہ کیا، یہاں آپ کے اساتذہ میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (صاحب سیرۃ المصطفی)

(۲) حضرت مولانا نافع گل صاحب پشاوریؒ۔

(۳) حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ۔

نہ جانے آپ نے دارالعلوم دیوبند میں پورا سال کیوں نہیں پڑھا، شاید کوئی عذر معقول بھی تھا، البتہ روایت کے مطابق مدرسہ مظاہر علوم کے بعض اساتذہ نے آپ کو مظاہر العلوم میں پڑھانے کی فرمائش کی تھی، لیکن آپ نے اس فرمائش کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ''میں وطن واپس لوٹنے کی متمنی ہوں''، جبکہ فراغت کے بعد دیکھا گیا کہ نصف سال دارالعلوم دیوبند سے مستفید ہونے کے بعد آپ نے تھانہ بھون میں تدریسی خدمات انجام دی تھیں، چنانچہ اس حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کا شمار مظاہر علوم کے ذہین وفطین طلباء میں سے ہوتا تھا، مولانا جس طرح کتب بینی میں مشہور تھے، اسی طرح تحریر کے لحاظ سے بھی معروف تھے، اس کا

اندازہ ممتحن حضرات کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نے عبدالمتین کو تقریر اور تحریر کے دونوں نمبر دیئے ہیں، چونکہ مولانا کی غیر معمولی صلاحیت اور خدا داد قابلیت اپنے اساتذہ پر عیاں تھی، اس لئے فراغت کے بعد فوراً مولانا عبدالرحمن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو پیش کش کی کہ سہارنپور میں اگر تدریس کرنا چاہو تو جگہ خالی ہے، لیکن چونکہ مولانا برما آنے کے لئے بے چین تھے، اس لئے استاد کی اس عظیم پیش کش پر عمل نہ ہوسکا، لیکن تھانہ بھون میں کسی کی نیابت میں چھ ماہ تک تدریسی خدمات سرانجام دیں''۔(۱)

بہرحال غالباً مولانا عبدالمتین صاحب نے فراغت کے بعد جب دارالعلوم دیوبند گئے تھے، تب وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ہاتھ میں ۱۹۴۸ء میں بیعت کی تھی، مولانا کا حضرت سے روابط رہے تھے۔

۱۹۴۷ء کے اواخر میں مولانا وطن واپس آئے، ارکان پہنچتے ہی آپ نے اپنے استاد حضرت مولانا سید عظیم صاحب سنبنوی کی معیت میں راجاربیل کے مدرسہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کردیا، لیکن ایک عرصہ کے بعد آپ نے ۱۹۵۰ء میں ہٹالیہ میں ''درالعلوم نظامیہ ہتالیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، یہاں آپ نے وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام کو بحیثیت مدرس جمع کرلیا تھا، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فوئمالوی۔(۲)

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۷۳۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے حضرت مولانا سلطان احمد صاحب کو غیر مقلد قرار دیا ہے، لیکن انہوں نے خود مولانا کی حیات پر قلم اٹھانے کے دوران یہاں تک صراحت کردی ہے کہ مولانا تقلید شخصی کے قائل نہیں تھے، بلکہ بسا اوقات حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے مذاہب پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے، جس سے مشہور ہوگیا کہ مولانا ممدوح غیر مقلد ہیں، جب کہ مولانا مکمل طور پر غیر مقلد نہیں تھے، بلکہ دوسروں کو مات دینے کے لئے نقل مذہب کرتے تھے، اس پوری عبارت میں جہاں تضادات نظر آتے ہیں، وہاں آخری فقرہ نے مولانا ممدوح کے حوالے سے اور ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے، کہ آیا مولانا ممدوح جیسی شخصیت اور بلند پایہ کے عالم دین دوسروں کو مات دینے کے لئے اس طرح کی حرکت بھی کرسکتے ہیں؟

(۲) حضرت مولانا زاہد حسین صاحب مرنگلوی۔

(۳) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب گدوسراوی۔

(۴) حضرت مولانا محمد وجیہ اللہ صاحب۔

مدرسہ نظامیہ ہتالیہ میں مشکوۃ شریف تک پڑھائی ہوتی تھی، یہاں وقت کے بلند پایہ کے علماء کی جمعیت ہوگئی تو ارکان کے طول وعرض سے طلباء کا ہجوم ہوگیا تھا، لیکن نہ جانے کن مشکلات اور نامساعد حالات کی بنیاد پر کہ مولانا نے اس مدرسہ کو ۱۹۶۰ء میں خائندہ فارہ میں منتقل کردیا تھا۔

بہرحال مولانا عبدالمتین صاحب نے علوم دینیہ اسلامیہ کا یہاں ایک دریا بہادیا تھا، یہاں سے ایسی ایسی ہستیاں پڑھ کر نکلیں جن میں سے چند افراد اپنے زمانے کے اساتذۂ وقت کہلائے گئے تھے، ان میں سے درج ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:

(۱) مولانا حسن علی صاحب والد محترم مولانا حافظ محمد صدیق صاحب۔

(۲) مولانا اصغر حسین صاحب۔

(۳) مولانا حافظ احمد صاحب گدوسراوی۔

(۴) مولانا فیاض احمد صاحب نلبنوی۔

(۵) مولانا عبدالحکیم صاحب کواربیلی۔

(۶) مولانا قاری نورالحسن صاحب نلبنوی۔

مولانا عبدالمتین صاحب ایک جید عالم دین، ماہر دینی تعلیمات ہونے کے ساتھ ساتھ میدان سیاست و قیادت سے بھی اپنی حد تک دلچسپی لینے والے انسان تھے، آپ نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی کام نہیں کیا، جو ملت وقوم کے مفاد کے خلاف ہو، بلکہ اس کے برعکس آپ نے ایسی ایسی خدمات دینیہ انجام دیں، جو ارکان کی تاریخ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

مولانا نے ۱۹۶۲ء میں شادی کی، اس کے بعد بعض ناقابل بیان وجوہات کے پیش نظر وطن چھوڑ کر رنگون تشریف لے گئے، وہاں ایک سال گزارنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں کراچی پہنچے، جہاں آپ نے مختلف دینی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، دارالعلوم حسینیہ اور جامعہ اشرفیہ حقانیہ میں چندسال

پڑھاتے رہے، بالآخر ایک طویل عرصہ یہاں رہنے کے بعد ۱۶ / جون/ ۲۰۰۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اللہ تعالی آپ کے درجات کو بلند فرمائے ،آپ کے صاحب زادوں میں مولانا فرید صاحب ایک اکسیڈنٹ میں شہید ہوئے ،اور مولانا امداد اللہ ماشاء اللہ بقید حیات اور دینی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔

حضرت مولانا علی جوہر صاحب بانگونوی بوسیدنگی

مولانا علی جوہر بن مولانا مفتی مظہر الحق صاحب بانگونوی بوسیدنگی کی ولادت ۱۹۵۰ء میں علی چنگ بوسیدنگ کی مردم خیز بستی بانگونہ میں ہوئی ،آپ کے خاندان کا شمار سرزمین ارکان کے ان خاندانوں میں ہوتا ہے،جنہوں نے اس پوری سرزمین کو علم وعرفان اور اسلام کی حقانیت ونورایت سے دوراول ہی میں متعارف کردیا، یہ تو ایک واقعہ ہے کہ قصبۂ علی چنگ کا شمار ارکان کے ان قصبوں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے اسلامیان ارکان کو دوراول میں اپنی آغوش تربت میں بسالیا تھا، ویسے مولانا کے خاندان کے حوالے سے بات یہاں تک مشہور ہے کہ یہ خاندان صدیوں سے اس علاقے میں رہا اور اپنے زندہ اور لازوال روحانیت سے نہ صرف اس علاقے کو منور رکھا بلکہ ایک طور پر پوری سرزمین کو روشن وتاباں رکھا ہے۔

بعض تاریخی شہادت اور خاندانی روایات سے پتہ چلا کہ اس خاندان میں اتنی بڑی بڑی قدآور شخصیتیں گذریں،جنہوں نے اسلامیان ارکان کے ہر شعبہ ہائے زندگی کو اپنی جاوداں علمیت وروحانیت سے متاثر کیا تھا،اس خاندان سے ایسے بڑے بڑے دل زندہ دار عارفین، باکمال علمائے کرام، نامور مشائخ عظام، دردمند سیاست دان،شعلہ بیان خطباء وقائدین پیدا ہوئے،جن کی لازوال کوششوں نے سرزمین اسلام ارکان کو مسحور کررکھا تھا،جن کی زندگیوں کی کہانیاں اور داستانین بڑی لمبی اور طولانی ہیں۔

تاریخ کی پرانی خلفیات سے صرف نظر،صرف انیسویں صدی کے نصف اول میں چند ایسی شخصیات بھی اس خاندان میں گذریں ،جن کی لازوال کوششیں اور تابندہ جدوجہد نہ صرف تاریخ ارکان کے سنہرے دریچے کو واکرتی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی انتھک کوششیں وکاوشیں اسلامیان ارکان کے لئے سرمایۂ فخر وابتکار اور باعث رحمت بنی ہوئی ہیں ،جن میں ایک مولانا علی جوہر صاحب مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا مظہر الحق صاحب بھی تھے،جنہوں نے اپنی علمی وروحانی چھاپ سے نہ صرف اس علاقے کو منور رکھا، بلکہ دور دراز کے علاقے کو بھی روشن اور تاباں رکھا تھا،اسی طرح دوسرے مولانا علی جوہر صاحب کے قابل فخر چچا جن کا اسم گرامی اور ناقابل فراموش جدوجہد ہم اسلامیان ارکان کی

تاریخی زندگی میں ہمیشہ یار ہی اور صدا یاد رہے گی، وہ تھے جناب جرنیل میر احمد صاحب مرحوم، جنہوں نے ۱۹۴۲ء کے واقعۂ کرب وبلا میں بحیثیت ایک مردمجاہد تیر وتفنگ کے سائے تلے خون کے ایک ابر آلود سمندر کو کامیابی سے پار کیا تھا، اور صحیح معنی میں ان کی خدمات نے ایک طور پر سرزمین ارکان کو ایک دوسرا اندلس ہوتے ہوتے بچھا دیا تھا، دور آخر میں اس خاندان کے ان دونوں شخصیتوں کی قابل قدر بلکہ نا قابل فراموش خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی، ان دونوں بار آور شخصیتوں کی قدرے تفصیلات حقیر کی اس کاوش میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا علی جوہر صاحب کی تعلیم وتربیت اپنے گھر کے آنگن سے شروع ہوئی، لڑکپن میں اپنے مایۂ ناز والد حضرت مولانا مظہر الحق صاحب نے آپ کی بسم اللہ پڑھائی، پھر سرزمین ارکان کی عام روایات کے مطابق بستی کے مکتب میں بٹھا دیئے گئے، وہیں سے ناظرۂ قرآن کریم کے علاوہ عربی، اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، کچھ بڑے ہوئے تو سرکاری اسکول میں پہنچائے گئے، جہاں سے قدرے تعلیم انگریزی اور برمیز کی بھی حاصل کی، پھر عنفوان شباب میں والد ماجد کی تربیت میں چند دن رہے، بعد میں بوسیدنگ ٹاؤن کی معروف درسگاہ جامعہ اسلامیہ عالیہ میں بھرتی کر دیئے گئے، وہیں نصاب متداولہ کو سبقاً سبقاً طے کرتے ہوئے غالباً ۱۹۷۳ء میں سند فراغت حاصل کی تھی۔

مولانا کے قابل قدر اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب، حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب، حضرت مولانا ولی احمد صاحب کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب اور مولانا مفتی ابو الفضل صاحب قابل ذکر ہیں، جن کی تعلیم وتربیت نے مولانا کی خداداد صلاحیت کو نکھارا اور فطری استعداد میں مزید چار چاند لگا دیئے تھے۔

فراغت کے بعد آپ کے جوہر شناس اساتذۂ کرام نے ایک طرف مزید اپنی تربیت میں رکھنے کی خواہش دوسری طرف آپ کی موہوبی صلاحیت کو مزید ابھارنے کی نیت سے اس جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں مدرس ہونے پر اصرار بلکہ مجبور کیا، اساتذۂ کرام کا یہ اصرار دراصل اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ مولانا اس قابل ہو گئے تھے کہ آپ کی تعلیم وتربیت میں دیگر طلباء کو دیا جانا اب وقت کی اہم ضرورت ہے، ویسے اس مدرسے میں آپ نے اپنے اساتذہ کرام کی نگرانی میں برسوں بلکہ ایک

روایت کے مطابق آٹھ سالوں تک مسلسل تدریسی خدمات انجام دی تھیں، اس دوران کے آپ کی طرف منسوب بڑے بڑے قابل قدر علماء دیکھے جاتے ہیں، جن کی زندگی اور قد آور شخصیتوں کو بھی تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے کہا جاسکتا ہے۔

مولانا علی جوہر صاحب کی شادی خانہ آبادی غالباً ۱۹۷۵ء میں قصبۂ علی چنگ سے قدرے فاصلے پر جنوب میں واقع بستی کیا زنگہ فارہ کا ایک معروف زمیندار عبد الجلیل صاحب مرحوم کی صاحب زادی خورشیدہ سے ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس شادی کو اپنی برکت سے نوازا، ان کے بطن سے چند بڑے بڑے باکمال دانشوروں کے علاوہ چند مایۂ ناز علمائے کرام بھی پیدا ہوئے، جن میں مولوی حفظ الرحمن اور مولوی امین الحق صاحب قابل قدر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو اپنی بے پایاں رحمت سے نوازے، آمین۔

بعد ازاں غالباً ۱۹۸۲ء میں قصبۂ علی چنگ کی وہ درسگاہ بننے جارہی تھی، جس کا آج مدرسہ معارف العلوم کے نام سے علاقہ بھر میں ڈھونگ ہے، اب علاقہ والوں نے آپ کو اصرار کرنا شروع کر دیا کہ آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ سے منتقل ہو کر اس نو زائدہ ادارہ کے رکن تاسیسی میں شامل ہونے چلے آئیں، ساتھ ہی ساتھ خود اس مدرسہ کی خدمات میں لگ جائیں، اب مولانا نے اپنے اساتذۂ کرام سے اجازت لی اور مدرسہ معارف العلوم کی سنگ بنیاد بھی رکھی اور بنفس نفیس اول ناظم تعلیمات کے عہدے پر بھی معمور ہو گئے تھے، مولانا کی یہ للّٰہیت اور فرض شناسی تھی کہ مرتے دم تک اس عہدۂ جلیلہ پر مشرف رہے تھے۔

مولانا کے اس دور نظامت سے یہی ثابت ہوا کہ مولانا ایک فرض شناس مدرس ہونے کے تہ بتہ ایک بلند پایہ کے ماہر تعلیمات تھے، آپ کے اس طویل دور نظامت میں مدرسہ نے ایسی ایسی تعلیمی خدمات انجام دیں، جن کی تفصیلات پر کم سے کم ایک کتابچہ کی ضرورت پڑے گی۔

علاوہ ازیں مولانا ایک عالی مرتبت مفتی بھی رہ چکے تھے، دراصل فقہ وفتاویٰ کے حوالے سے یہ صلاحیت آپ نے اپنے نامور والد سے وراثت میں پائی تھی، البتہ یہ سچ ہے کہ مولانا کی فقہ شناسی اور افتاء کے اصولوں کی گہرائی اور گیرائی سے واقفیت موروثی اور خود اپنی خداداد قابلیت واستعداد پر مبنی ہونے کے علاوہ اپنے قابل قدر اساتذۂ کرام اور فنکار مربیوں کی تربیت پر مبنی تھی، مولانا نے اپنے طور پر یہ علمی

وقومی فریضہ آخری دم تک حسن اسلوبی سے ادا کیا تھا، آپ کی خدمات کے حوالے سے ایک چیز قابل ذکر یہ ہے کہ موضع بانگلونہ کی وہ جامع مسجد جسے آپ کے اجداد نے قدیمی زمانہ میں تعمیر کیا تھا، مولانا اس کے غالباً فراغت تعلیم کے بعد سے مقرر اور خطیب رہ چکے ہیں، مولانا سے پہلے اس مسجد کا یہ فریضہ آپ کے والد ماجد ہی انجام دیا کرتے تھے، یوں تو آپ کے والد ہی کی زندگی میں آپ وہیں خطبے پڑھا کرتے تھے، مگر والد مرحوم کے انتقال کے بعد اس عہدہ پر مولانا ہی مقرر ہوئے تھے، چنانچہ مرتے دم تک آپ نے اس خدمت دین کو بڑی حسن اسلوبی سے سرانجام دیا تھا، مولانا خاصے خطیب و مقرر تھے، وقت وقت پر ضروری موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے تقریریں کیا کرتے تھے، آپ کی ان تقریروں میں جادو بیانی سے زیادہ حقیقت اور واقعیت پر مبنی موضوعات ہوتے تھے، جن میں اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ کے موضوعات مواعظانہ انداز میں چھائے رہتے تھے، صاف اور ستھرے پیرائے میں دل نشین اور عام فہم زبان تقریروں میں استعمال فرمایا کرتے تھے، مولانا کی عادت شریفہ میں ایک یہ بھی تھی کہ امامت جمعہ سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کی طرح مصلے پر کچھ دیر تسبیح وتہلیل میں رہتے، پھر عام لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر لوگوں کے دردوں میں حصہ لیتے اور ضروری مسائل حل فرمایا کرتے تھے۔

مولانا کو غالباً اپنی اصلاح ذات کا خیال لڑکپن میں خاندانی ورثہ میں ملا ہو، مولانا مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا مظہر الحق صاحب کا شمار ارکان کے ایک بلند پایہ مشائخ میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے دوران حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی سے دامن وابستہ کر رکھا تھا، مولانا مظہر الحق صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پڑھتے تو تھے ہی لیکن اپنی اصلاح ذات کے لئے حضرت حامد صاحب کے دربار سے لو لگائے ہوئے تھے۔ غالباً حضرت حامد صاحب نے جب ارکان کا دورہ فرمایا، اس وقت اپنے لائق جانشین حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی (یاد رہے کہ مولانا ارکانی اور مولانا مظہر الحق صاحب دونوں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں زیر تعلیم تھے، شاید ارکانی صاحب کی رہنمائی میں مولانا مظہر الحق صاحب حضرت حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے دربار تک پہنچے تھے) کی فرمائش پر مولانا مظہر الحق صاحب کو مجاز بیعت و خلافت سے نوازا تھا، البتہ حق صاحب کی پیری

ومریدی کا جہاں تک تعلق ہے، مولانا نے زندگی بھر اپنے آپ کو عام نظروں سے چھپانے کی کوشش کی تھی، مجاز بیعت ہوتے ہوئے بھی ہر کس وناکس کو اپنے حلقہ مریدی میں داخل کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، البتہ اپنے خاندان کے علاوہ بھی چند ایسے حضرات تھے، جنہوں نے اپنی اپنی ذات کو حق صاحب کے دامن مریدی سے وابستہ کر رکھا تھا، ویسے مولانا علی جوہر صاحب غالباً عنفوان شباب ہی میں اپنے نامور والد کے پیر بھائی حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی سے روحانی تربیت پائی تھی، البتہ اصولی طور پر بیعت کا جہاں تک تعلق ہے کہ آپ نے مولانا ارکانی صاحب کے معروف خلیفہ حضرت مولانا نور محمد صاحب ختڈلی سے اپنے دامن کو وابستہ کر لیا تھا، میں نے اپنی زندگی میں چند مرتبہ مولانا علی جوہر صاحب کی زبان سے اپنے پیر ومرشد کی ثناخوانی کرتے اور ان کی بلند شخصیت ومقامات سے لوگوں کو متعارف کرتے ہوئے سنا تھا، اگر مولانا کی زندگی نے وفا کی ہوتی، یا یوں کہوں کہ خود آپ کے مرشد کی زندگی نے مزید طول پکڑا ہوتا، شاید مولانا مرحوم بھی مجاز بیعت کی خلعت سے سرفراز ہوئے ہوتے، اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت وفضل وکرم سے آپ کی روحانی مقامات کو مزید بلند کرے، اور عارفین باکمال میں آپ کا شمار ہوجائے، آمین یارب العالمین۔

مولانا علی جوہر صاحب ایک بلند پایہ کے مدرس ہونے کے علاوہ ہر دلعزیز استاد بھی تھے، آپ کے بڑے بڑے اہل کمال تلاندہ آج بھی سرزمین ارکان کی متعدد درسگاہوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، مولانا درس وتدریس میں جادو بیانی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ دل نشین اور عام فہم زبان میں تدریس آپ کی زندگی کا شیوہ تھا، مباحث کو ٹھنڈے دل ودماغ سے تلامذہ کے دماغ ودل میں اتارنے کی کوشش فرماتے تھے، ہر حال میں مدرسے کے تعلیمی احوال کا خیال آپ کے دماغ میں چھایا رہتا تھا، اس حوالے سے چلتے چلتے ایک بات یاد آگئی ہے کہ ۱۹۸۷ء کا واقعہ تھا کہ راقم الحروف بنگلا دیش سے سند فراغت (دورۂ حدیث نبوی کی تکمیل) کے بعد اپنے وطن واپس پہنچا تو مولانا کی نظر انتخاب راقم پر پڑی، آپ کی آرزو تھی کہ میں مدرسہ معارف العلوم میں مدرس مقرر ہو جاؤں، تاہم آپ کی یہ آرزو اس لئے پوری نہ ہوسکی کہ ایک طرف راقم الحروف کو دار العلوم ندوۃ العلماء جا کر اپنی تعلیمی زندگی کو مزید طول دینے کی خواہش تھی، تو دوسری طرف وہاں بعض ایسی سیاسی اور فکری حالت پیدا ہوگئی کہ جس نے مولانا

کی اس آرزو کی راہ روک لی تھی، غرض مولانا کی ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ آپ کا مدرسہ خاصے اہل کمال مدرسین سے بھر جائے، آپ کی یہ تمنا رہتے دم تک آپ کو ایک طور پر ستاتی رہی تھی۔

مولانا ایک طرف صاحب دل انسان تھے، ایک روشن خیال اور وقت کی سیاسیات کی گہرائیوں میں اترنے والے بھی، خاص طور پر سرزمین ارکان کے مسلمانوں پر بیتنے والے حالات نے آپ کو ترسا کر رکھا، تو دوسری طرف عام طور پر پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے مفلوک الحالی نے آپ کو تڑپا کرر کھ دیا تھا، اس سلسلے میں ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۷۸ء کے پریشان کن حالات میں میں نے آپ کو دیکھا کہ جب ارکانی مسلمانوں پر ناگامن آپریشن جیسی خون آشام مصیبت آن پڑی تو آپ نے اپنی بستی کی لاتعداد لوگوں کی شمولیت میں مسجد کا رخ کیا، اور نماز میں قنوت نازلہ کے ساتھ ایسی جاندار دعائیں کیں کہ پورا سماں داد وفریاد کے عالم میں ڈوب گیا تھا، آپ کی اس طرح کی تڑپیدہ حالتیں میں نے متعدد بار آپ کی زندگی میں دیکھیں۔

مولانا باوقار، حلیم الطبع، بردبار، اور فہم وفراست کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھے، آواز بیٹھی بیٹھی اور نگاہ نیچی نیچی رہتی تھی، تندی المزاج اور بادی الطبع نہیں تھے، ہر کس وناکس سے اپنائیت کے انداز میں ملتے تھے، ہر کسی کی فریاد سنتے اور غم وخوشی میں حصہ لیا کرتے تھے، اگر کوئی بھی آپ کو دعوت پر بلاتے تو خوش وخرم قبول فرمایا کرتے تھے، تکلف آپ کی زندگی کو شاید کبھی چھو کر بھی گزرا ہوگا، آپ کی زندگی بہر حال عالمانہ رہتی تھی۔

جس طرح عرض کی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے مولانا کی اولاد میں خاصی برکت دی، ماشاء اللہ آپ کے آٹھ فرزندار جمند رہے، اور پانچ لڑکیاں بھی رہیں، لڑکوں میں عزیزی مولوی حفظ الرحمن صاحب ماشاء اللہ بڑے قابل عالم دین کی حیثیت سے پورے خاندان کا چشم وچراغ بنا ہوا ہے، اس کے علاوہ مولوی امین الحق اور حافظ حمید الحق بھی ماشاء اللہ آپ کی قابل فخر اولاد میں سے ہیں، اللہ تعالی ان تمام افراد کی زندگی میں برکت دے، سچ تو یہ ہے کہ:

این خانہ تمام آفتاب است

مولانا نے اپنی پوری زندگی کو علم ومعارف اور درس وتدریس کی وسعت میں گزارا، آخری ایام میں آپ

پر ایک جان لیوا مرض نے حملہ کیا، آخر تک آپ کو اس سے رہائی نہ ملی، آخرکار ۳/ مارچ/ ۲۰۰۱ء میں آپ نے ایک طویل علالت کے بعد جان جان آفرین کا حوالہ کردیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادھر عزیز مولوی حفظ الرحمن کی معرفت سے حضرت مولانا مرحوم کا ایک وصیت نامہ بلکہ ایک ملفوظ نامہ دستیاب ہوا، اللہ تعالی نے اسے پڑھنے کی توفیق دی، جس سے پتہ چلا کہ مولانا ایک خدارسیدہ درویش صفت انسان ہونے کے علاوہ ایک بزرگ ترین عالم دین تھے، یہ ملفوظ نامہ آپ نے ایک اطلاع کے مطابق اپنی جانکنی کے عالم میں تحریر کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ یہ ملفوظ نامہ کسی بھی ایک انسان کی زندگی کو سنوارنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے، آپ کی حیات کے حوالے سے عام ناظرین کرام کی خدمت میں یہ ملفوظ نامہ پیش کیا جارہا ہے، جس میں شاید آپ کی علمی وسعت کی کچھ جھلکیاں نظر آئیں گی، سچ تو یہ ہے کہ یہ ملفوظ نامہ آپ کی زندگی کی روداد ہے، اور آپ کی پوری حیات کا ثمرہ بھی، جس پر خود بھی عمل پیرا تھے تو عام طور پر آپ دوسروں کو اور خاص طور پر اپنے تلامذہ اور متعلقین کے علاوہ اپنی اولاد کو بھی اس راہ پر گامزن ہونے کے خواہش مند تھے۔

وصیت نامہ گرامی مولانا علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد:

میری تمام اولاد واحفاد کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ:

(۱) اللہ تعالی کے ساتھ کسی بھی حالت میں کسی کو شریک نہ کرنا، اگرچہ تمہاری جان بھی جائے یا تمہیں آگ میں جلا کر بھسم کردیا جائے۔

(۲) پانچوں وقت کی نمازوں کو بڑی تاکید کے ساتھ وقت مقررہ پر ادا کرنا، اگر کسی شرعی اور معقول عذر کی بنیاد پر قضاء ہوجائیں، یا سفروں کے دوران وقت مقررہ پر ادا نہ ہوسکیں تو موقع پاتے ہیں بطور قضاء جلد ادا کردینا، اور یاد رہے کہ فرض بغیر ادا کے کبھی بھی معاف نہیں ہوتا۔

(۳) حقوق العباد سے ہمیشہ ڈرتے رہنا، کیوں کہ بندوں کا کوئی حق اللہ تعالی کبھی معاف نہیں کرتا، یاد رہے کہ غیبت بھی حقوق العباد میں شامل ہے، لہذا غیبت سے ہمیشہ بچتے رہنا، اور اپنی دعاؤں میں اللھم اغفر لمن حق لہ علینا، ہمیشہ پڑھتے رہنا۔

(۴) کسب معاش کے حوالے سے ہمیشہ حلال پیشہ اختیار کرنا، حرام اور ناجائز پیشوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہنا۔

(۶) ضرورت کے بغیر قرض کا لین دین نہ کرنا، یادرہے کہ قرض محبت کی قینچی ہوتا ہے، حرام اور ناجائز چیزوں کی نفع پر حرص نہ کرنا، اور ظاہر ہے کہ:

کاسۂ چشم حریصاں پر نہ شد
تا صدف قانع نہ شد پر در نہ شد

(۷) ہمیشہ اپنی زبان کی حفاظت کرنا، بیہودہ اور فضول گوئی سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے۔

(۸) چوں کہ یہ دنیا چند روزہ ہے، اس لئے آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرنا اور آخرت کی زندگی بڑی طویل ہے، سفر آخرت کے لئے توشۂ حیات چاہئے، اس طویل زندگی کے لئے زیادہ سامان کی ضرورت ہے ۔

(۹) خدا کی بندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ تہجد کی عادت ڈالنا، تہجد سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔

(۱۰) غنائے نفس کے لئے صلاۃ الضحی کی چار رکعت ضرور ادا کرنا۔

(۱۱) اپنے گھروں کو قبر نہ بنانا، قبروں پر کوئی عمل نہیں ہوسکتا، اور گھروں کو نماز، تلاوت اور ذکر الٰہی سے زندہ رکھنا۔

(۱۲) ترقی علم کے لئے اوروں سے زیادہ سننے کی کوشش کرنا، کم سے کم بولنے کی عادت ڈالنا، نیز حصول علم کے لئے ہر وقت جدوجہد کرنا، اس سلسلے میں ہمیشہ بارگاہِ ایزدی میں دعا کرتے رہنا۔

(۱۳) تمام بھائی بہن ہمیشہ اتحاد واتفاق اور الفت ومحبت سے رہنا، نیز بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر رحم لازمی امر ہے۔

(۱۴) اپنی پڑوسیوں کے ساتھ ہمیشہ مل جل کر رہنے کی کوشش کرنا، جھگڑوں سے پرہیز کرنا اور پڑوسیوں کا حق ضرور ادا کرنا۔

(۱۵) انسان کے لئے تین حقوق کی ادائگی لازی ہے (۱) اللہ تعالی کا حق (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق (۳) بندگان خدا کا حق، نیز اللہ تعالی کے حق ادا کرنے کے لئے قرآن کریم پر عمل کرنا، رسول

اللہ صلی اللہ علیہ کے حق کی ادائگی کے لئے تمام سنن پر عمل کرنا، مخلوقات کے حقوق کی ادائگی کے لئے لازمی ہے کہ بندہ اللہ کے تمام مخلوقات پر رحم کرے۔

(۱۶) نیز ماں باپ کے سامنے زبان سے اف تک نہ نکالنا، اپنی والدہ کو غنیمت جان کر اس کی خدمت و فرمان برداری کرنا، اسے نہ جھڑکانا، اور اس کے سامنے زبان سے اف تک نہ نکالنا۔

(۱۷) حفظ الرحمن کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے تمام چھوٹے بھائی اور بہنوں کو دین سکھانے کی کوشش کرے، تاکہ میری ساری اولاد حرام وحلال میں تمیز کرسکیں۔

(۱۸) رشید الحق وحید الحق کو اگلے رمضان المبارک کے بعد کسی مدرسہ میں کسی بہتر معلم کا حوالہ کیا جائے۔

(۱۹) اپنی نسبی رشتہ داروں سے مل جل کر رہنا، ان کے ساتھ جھگڑا اور فساد نہ کرنا اور پڑوسیوں کے حقوق ضرور ادا کرنا۔

(۲۰) میری کسی جائداد وغیرہ کو بحیثیت میراث تقسیم نہ کیا جائے، جو کچھ جائداد ہیں، وہ تمہاری ماں کے مہر کے عوض ہیں۔

(۲۱) اپنے سے بڑوں کو ہمیشہ سلام اور تعظیم کرنا، اور چھوٹوں سے محبت وشفقت سے پیش آنا۔

(۲۲) مذکورہ بالا تمام نصیحتوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا جائے۔

اللھم وفقنا لما تحبہ وترضی واجعل آخرتنا من الاولی۔

فقیر/علی جوہر عفی عنہ۔

حضرت مولانا غلام سبحان صاحب نارائن چنگی

مولانا غلام سبحان صاحب کی ولادت موضع نارائن چنگ شمالی بوسیدنگ میں ۱۹۱۵ء میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد ایک دین دار، علماء وصلحاء پسند زمیندار اور نہایت سخی آدمی کی حیثیت سے علاقے بھر میں معروف ومشہور تھے، ساتھ ساتھ منصف مزاج عادل سردار بھی، اور آپ کی والدہ ماجدہ بھی نہایت عابدہ اور خداترس خاتون اسلام تھی۔

مولانا کی بتدائی تعلیم علاقے میں ہوئی، بڑے ہوئے تو اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان پہنچے، کچھ دن مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھے، اس کے بعد میرٹھ کی ایک دینی درسگاہ میں پڑھ کر وہاں سے سند فراغت حاصل کی تھی۔

مولانا تعلیم سے فراغت کے بعد وطن آئے تو لوگوں نے آپ کا بھرپور استقبال کیا، آپ کے والد ماجد کے انتقال پر ملال کے چند دن بعد آپ کو اپنے گاؤں کا منصف مقرر گیا تھا۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین تھے، شنید ہے کہ آپ فقہ وفتاوی کے ماہر تھے، والد بزرگوار کی طرح منصف مزاج بھی تھے، بعد میں آپ علاقے کے قاضی بنے، کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے آپ کے مزاج عالی کو عدل وانصاف کے لئے بڑا موزون بنایا تھا۔

۱۹۴۸ء کے دوران آپ کے پاس جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت پہنچی تو آپ قافلۂ جہاد میں شریک ہوگئے، ویسے مدتوں تک جہادی قافلہ میں شریک رہے، جہاں آپ نے اپنی علمی استعداد وصلاحیت کا بھرپور ثبوت پیش کیا، آپ ایک عالم دین ہونے کا ساتھ ساتھ ایک دل جلے قائد اور پرجوش مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے، علاوہ ازیں خطیب بھی تھے، بعد میں جہاد کونسل میں آپ کونسلر بنے، اور مدتوں تک جہاد اسلامی کا فریضہ بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔

حضرت محمد جعفر حسین قوال کی شہادتِ حسرت آیات کہ بعد آپ محمد عباس کے قافلہ میں شریک رہے تھے، محمد عباس صاحب کی سبکدوشی ہوئی تو مرحوم صالح احمد صاحب کے ساتھ بھی رہے، جہاد کونسل کی تباہی ہوئی تو ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گئے، وہاں ۱۹۸۵ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا اڈووکیٹ غلام قادر صاحب شقدار فاروی

مولانا غلام قادر صاحب ۱۸۹۳ء میں ایک اطلاع کے مطابق شقدار فارہ منگڈو اور دوسری اطلاع کے مطابق شقدار فارہ نہیں بلکہ منگڈو ٹاؤن شپ کی کسی ایک بستی میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ آپ کا والد ایک دیندار اور قوم کے خیرخواہ سیاست دان تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم علاقے میں ہوئی، بعد میں اعلی تعلیم کے لے ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جا داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے امتیازی شان سے عالمیت کا امتحان پاس کرلیا، بعد میں کلکتہ یونیورسیٹی سے وکالت کی ڈگری لی تھی۔

آپ نے وطن آتے ہیں ارکانی مسلمانوں کے مسائل ومشکلات پر غور وفکر کرنا شروع کردیا، یہاں کے مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی فکر نے انہی چین سے نہ رہنے دیا، چنانچہ آپ نے اپنی زندگی کے لئے میدان سیاست کو انتخاب کیا تھا، پھر آپ نے اپنے چند ہم آہنگ حضرات علماء اور دانشوران سے مل کر جمعیت علمائے ارکان برما کے نام پر ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔(۱)

جمعیت علمائے اسلام ارکان راقم الحروف کے علم کے مطابق ارکانی مسلمانوں کی پہلی منظم جماعت تھی، جس سے پہلے قومی سطح پر ارکانی مسلمانوں کی کوئی اور تنظیم وجود میں نہیں آئی تھی، بہر حال اس تنظیم نے یہاں کے مسلمانوں کی بڑی بڑی خدمات انجادیں، جن کی کچھ جھلکیاں راقم کی تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' دیکھی جاسکتی ہیں، مولانا اور آپ کے ساتھیوں نے جمعیت علماء کے سائے تلے ارکانی مسلمانوں کو اکٹھا اور ہم آہنگ کیا، اور انہیں اپنے حال پر تفکر اور مستقبل کو

---

(۱) یاد رہے کہ راقم الحروف کی اس بات سے ہمارے اہل علم ودانش میں چند حضرات کو شدید اختلاف ہے کہ جمعیت علماء کے بانی مولانا غلام قادر تھے، ظاہر ہے کہ راقم الحروف کا یہ دعوی ہرگز نہیں ہے کہ اس نے اپنے گہرے علم ومعلومات اور ٹھوس مطالعہ کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ مولانا جمعیت علماء کے بانی تھے، ممکن ہے کہ اس کے بیان میں نقص بھی ہو، اس بیان کے خلاف ٹھوس ثبوت مل جائے تو راقم کو ٹھوس ثبوت کے سامنے سرتسلیم خم کرنے میں کوئی تامل اور جھجک نہیں ہوگی۔

سدھارنے کے لئے کوشاں بنایا تھا، مولانا نے اپنے آخری دم تک جمعیت کے سائے تلے مسلمانوں کی خدمات نبھائیں اور تنظیم کے پروگرام کو آگے بڑھانے کی پیہم کوشش اور مسلسل جانفشانی کی، آپ ایک دل جلے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب بصیرت سیاست دان تھے، سیاست وقیادت کی زیر وبم پر خاصی نظر رکھتے تھے، خاص طور پر علمائے اسلام اور دانشوران قوم کی جگانے کے حوالے سے آپ کی بڑی بڑی خدمات تھیں۔

مولانا حکومت برطانیہ کے شدید معارض اور مخالف سیاست دان تھے، روایت ملی ہے کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے بعض محصولات (جس طرح نمک) پر ناجائز ٹیکس لگا دیا گیا تو آپ تڑپ اٹھے، اور حکومت سے شدید تعارض کرتے ہوئے اس ٹیکس والے قانون کو کالعدم قرار دلوایا تھا۔

غرض آپ نے زندگی بھر مسلمانان ارکان کی خدمت کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا اور خاک منگڈو میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب مظاہری تمنگ چنگی

مولانا محمد ادریس بن حاجی بدیع الرحمن بن عبدالغنی بن امین شریف بن مسٹر فتح علی تاجر(۱) کی ولادت ۱۹۳۴ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معرف بستی تمنگ چنگ میں ہوئی، آپ کے والد صاحب بڑے زمیندار اور سخی انسان کی حیثیت سے علاقے میں معروف تھے، اور آپ کی والدہ مرحومہ کاملہ بانو بھی بڑی نیک صفات خاتون تھی۔

ابھی مولانا کی عمر چھ سال ہوئی تھی کہ آپ نے اپنے نامور چچا مولانا ابوبکر شہید رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم کی ابتدا کی، آپ کے چچا آپ کو بہت پسند کرتے تھے، انہوں نے بڑی محبت سے آپ کو درس دینا شروع کردیا تھا، وہ آپ سے بڑی توقع رکھتے اور فرماتے تھے کہ انشاء اللہ محمد ادریس ایک دن بڑا عالم بنے گا، اور خاندان کا نام روشن کرے گا، چنانچہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی ہے کہ آگے چل کر نہ صرف آپ ایک بڑے عالم بنے، بلکہ خاندان سمیت ملک، ملت اور قوم کا نام بھی روشن کیا۔

۱۹۴۲ء کے واقعہ کرب وبلا میں مولانا پر ایک مصیبت آن پڑی کہ اس قومی فسادات کے دوران آپ کی والدہ ماجدہ کاملہ بانو بنت علی حسین کا انتقال ہوگیا، گھر میں سوتیلی ماں آئی تو مولانا پر گھر کے کام کاج کا بار ڈال دیا گیا، یوں آپ نے ایک طرف اپنی ابتدائی تعلیم بھی جاری رکھی تو دوسری طرف گھر کے کام کاج بھی بخوبی انجام دیتے رہے تھے۔

۱۹۴۹ء میں آپ نے اپنے علاقے کی معروف ومشہور دینی درسگاہ مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں داخلہ لیا، آپ یہاں بڑے انہماک کے ساتھ ۱۹۵۴ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے، بعض روایت کے مطابق آپ نے اس مدرسہ میں قدوری، کافیہ وغیرہ کتابیں پڑھیں، یاد رہے کہ یہاں مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں آپ جس وقت تعلیم حاصل کررہے تھے، اس وقت اس علاقے کے معروف اساتذہ میں حضرت مولانا حمید اللہ صاحب، مولانا افاض الدین صاحب، مولانا مشتاق احمد صاحب، مولانا مفتی ابوا

(۱) مسٹر فتح علی تاجر کا تذکرہ مرحوم خلیل الرحمن کی تصنیف ''تاریخ ارکان برما'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لفضل لمبا بیلوی صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب موجود تھے ، آپ نے یہاں ان مذکورہ ونامور اساتذہ سے خوب خوب فیض حاصل کیا تھا۔

۱۹۵۴ء کی ابتدا میں آپ مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں داخل ہوئے ، یہاں آپ نے کنز الدقائق ، اصول الشاشی اور شرح تہذیب سے لے کر موقوف علیہ تک تعلیم حاصل کی ، اس درسگاہ میں آپ نے حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی ، مولانا عبد الواسع ، مولانا مشتاق احمد اور مفتی ابو الفضل صاحب وغیرہ سے خوب خوب استفادہ کیا ، موقوف علیہ کے سال مولانا کی شادی خانہ آبادی ہوئی ، شادی کے بعد اسی سال آپ مدرسہ عالیہ سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان تشریف لے جانے کی نیت سے رنگون پہنچے ، (یاد رہے کہ یہ ۱۹۵۹ء کا واقعہ تھا) اس حوالے سے صدیق مکرم مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو کہ:

> ”موقوف علیہ کے سال مولانا کی شادی ہوئی ، مولانا شادی کے بعد ہندوستان جانے کے لئے رنگون چلے گئے ، تاکہ رنگون سے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات بنوائیں ، رنگون جانے کے بعد پاسپورٹ کے سلسلے میں کاروائی شروع کر دی گئی ، چنانچہ پاسپورٹ تیار ہونے میں وقت زیادہ لگ رہا تھا ، اس لئے مولانا نے شان اسٹیٹ کے شہر ”مائی شو“ کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینا شروع کر دیا ، جب مولانا کو احساس ہوا کہ پاسپورٹ اور دیگر سفری دستاویزات تیار کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ سکتا ہے ، اس لئے ہندوستان کے بجائے کسی معروف مدرسہ میں دورۂ حدیث کے لئے داخلہ لینا چاہئے ، چنانچہ چھ ماہ تک شان اسٹیٹ میں امامت کے فرائض انجام دے کر ۱۹۶۰ء میں مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں دورۂ حدیث کے لئے داخلہ لیا“۔(۱)

اس مدرسہ میں آپ نے داخلہ تو لیا ، اور سالانہ امتحان تک تعلیم بھی حاصل کی ، لیکن ابھی سالانہ امتحان

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق ، مشاہیر ارکان برما ، ص: ۲۸۴۔

قریب تھا کہ مولانا کو پاسپورٹ بننے کی اطلاع مل گئی ، چنانچہ حصول پاسپورٹ اور ہندوستان کا ویزہ ملنے کے بعد آپ ہندوستان تشریف لے گئے اور سیدھے جا کر ۱۹۶۱ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا ، وہاں آپ نے پھر سے دورۂ حدیث کی تعلیم دہرائی ، چنانچہ بخاری شریف حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی سے ، مسلم شریف حضرت مولانا منظور احمد صاحب سے ، ابوداؤ اور طحاوی شریف حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سے ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ اور موطین حضرت مولانا امیر احمد صاحب سے پڑھ کر ۱۹۶۲ء میں باضابطہ سند فراغت حاصل کر لی تھی۔

علاوہ ازیں آپ سند حدیث مسلسلات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سے حاصل کی ، اسی طرح جزری ، ضیاء القرآت ، فوائد مکیہ اور مقدمۂ جزری وغیرہ کتابیں بروایت حفص مولانا قاری محمد سلیمان صاحب سے پڑھیں اور سند بھی حاصل کی تھی۔

مولانا نے مظاہر علوم میں دورۂ حدیث کے دوران اپنی اصلاح باطن کی طرف بھی توجہ دی ، چنانچہ اس سلسلے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے علاوہ حضرت تھانوی کے خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کی طرف رجوع کیا ، مگر باضابطہ بیعت اس دوران نہیں ہو پایا تھا ، باضابطہ بیعت اور خلافت اس وقت ملی ، جب آپ ہندوستان سے وطن پھر وطن سے پاکستان تشریف لے گئے تھے ، پاکستان پہنچنے کے بعد آپ نے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی ، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد مفتی صاحب نے آپ کو خلافت کے ساتھ بیعت کی اجازت بھی دی ، یوں آپ کو علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کی سند بھی مل گئی تھی۔

مظاہر علوم سہارنپور سے فراغت کے بعد آپ وطن واپس پہنچے ، اور جون ۱۹۶۲ء میں اپنے علاقے تمنگ چنگ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی ، جس کا نام مدرسہ امداد العلوم رکھا گیا تھا ، اس مدرسہ سے ملحق ایک جامع مسجد بھی بنوائی ، نہ جانے آج کل اس مدرسے کا کیا حال ہے ، آیا اس کا وجود ہے یا ظالموں نے اسے بھی مسمار کر دیا ہے ، غرض آپ نے اس درسگاہ میں دو سال تک مفت تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اس جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض بھی انجام دیئے تھے ، اس کے بعد آپ نے

اپریل/ ۱۹۶۴ء میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر پاکستان کی راہ لی اور جون/ ۱۹۶۴ء میں کراچی پہنچ گئے تھے۔مولانا کراچی پہنچے تو تین مہینے تک بے روزگار رہے، بعد میں لیاقت آباد کی ایک جامع مسجد میں امامت وخطابت کی ملازمت اختیار پائی، بعدازاں ۱۹۶۷ء میں کراچی میں ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی، جس کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا کی دیگر یادگاروں میں ایک اہم یادگار مدرسہ خلیلیہ ہے، جو موسی کالونی کراچی میں واقع ہے، مدرسہ ہذا کی بنیاد مولانا نے ۱۹۶۷ء میں رکھی، مدرسہ خلیلیہ کا نام مولانا کے شیخ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (شارح ابوداؤ) کی نسبت سے تجویز فرمایا تھا، یہاں عروج کے زمانے میں موقوف علیہ تک کے درجات تھے، اب رابعہ تک ہے، چونکہ یہاں کی تعلیم عمدہ اور نظام قابل تقلید تھا، اس لئے وقت کے برگزیدہ حضرات کی تائید وسرپرستی اس ادارہ کو حاصل ہے''۔(۱)

جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بڑے دور اندیش اور انسانیت کی فلاح چاہنے والے عالم دین تھے، رفاہی اور سماجی کاموں کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی پیش پیش تھے، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا پاکستان تشریف لاکر رفاہی اور سماجی امور بھی سرانجام دیئے، اور مختلف تنظیموں کے جھنڈے تلے سیاسی کام بھی کئے، مہاجرین ارکان برما کے نام سے ایک رجسٹرڈ شدہ جماعت تھی، جس کی تاسیس ۱۹۶۵ء کو عمل میں آئی تھی، اس کے صدر.... ناظم اعلی مولانا مشتاق احمد اور سرگرم کارکن مولانا سمیع الدین پتھری قلعہ والے تھے، جب کہ مولانا ناظم نشرواشاعت اور خازن تھے، اس تنظیم نے ارکانی اور برمی مسلمانوں کے سلسلے میں بہت سے امور سرانجام دیئے، جو تاریخ میں محفوظ ہیں

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۵۰۔

، مولانا نے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان پاکستانی علمائے حق کی معروف تنظیم ''سواد اعظم'' میں شامل ہوکر بھی رفاہی اور ملی کام کئے، دومرتبہ جمعیت علمائے اسلام کراچی ڈویژن کے نائب امیر رہے، جمعیت علمائے اسلام ضلع وسطی کراچی کے دومرتبہ امیر تھے اور فی الحال جمعیت علمائے اسلام گلبرگ ٹاون کراچی کے سرپرست ہیں، اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سی ارکانی اور پاکستانی تنظیموں کے کارکن اور سرپرست رہے''۔(۱)

مولانا محمد ادریس صاحب ایک صاحب بصیرت وفراست عالم دین اور مؤلف تھے، مولانا کی ایک تصنیف ''اجزاء الایمان'' میری نظر سے گزری ہے، یہ تصنیف اب بھی میری چھوٹی سی لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہے، ماشاہو اللہ ۶۵۷ /صفحات پر مشتمل یہ تالیف ایمانیات کے موضوع پر بڑی جاندار ہے، یہ تالیف ۱۹۹۷ء میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی ہے، جب کہ اس تالیف کے علاوہ بھی مولانا حافظ محمد صدیق نے مولانا کی دیگر چند مولفات کا تذکرہ کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(۱) فلاح زوجین: صفحات ۱۲۵ ہیں، سن طباعت ۱۹۹۸ء۔

(۲) تحفۃ المولود: صفحات ۱۵۰ ہے۔

(۳) تحفۃ الصلاۃ: حافظ صاحب کے مطابق یہ تالیف زیر طبع تھی، شاید اب تک منظر عام پر آگئی ہوگی۔

(۴) تحفۃ الوالدین: یہ بھی زیر طبع تھی، شاید منظر عام پر آچکی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ مولانا ایک قابل مدرس تھے، اس لئے آپ کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، ارکان میں بھی اس وقت آپ نے درس وتدریس کے ذریعے ہزاروں طالبان علوم نبوت کو سیراب کیا اور پاکستان میں پہنچنے کے بعد اس سلسلے میں مزید برگ وبار آئے، آپ کے ہزاروں تلامذہ سے بس چند نامور حضرات کے اسمائے گرامی حافظ صاحب نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) مولانا مفتی محمد رفیق صاحب، مفتی واستاد مدرسہ دارالسنہ نہلا کوس بازار۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۸۴۔

(۲) مولانا حافظ عطاء اللہ صاحب پیش امام وخطیب جامع مسجد ناظم آباد کراچی۔

(۳) مولانا انیس المصطفی صاحب ہاتھی ماروی، ساکن حال برمی کالونی کراچی۔

(۴) مولانا نورالقاسم صاحب مہتمم مدرسہ اورنگی ٹاون کراچی۔

(۵) مولانا شبیر احمد صاحب استاد مدرسہ عثمانیہ، رصیفہ، مکہ المکرمۃ۔

(۶) مولانا محمد قاسم کیوکتوی۔

(۷) مولانا عبدالقدوس مجاہد ہاتھی ماروی (مرحوم)۔

اس طرح آپ کے چند معاصرین واحباب کا تذکرہ بھی حافظ صاحب نے مذکورہ کتاب میں کیا ہے، ان میں سے چند تو برصغیر پاک وہند سے تعلق رکھتے تھے، جب کہ چند حضرات ارکان سے منسوب ہیں، اب میں ارکان سے منسوب حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کر رہا ہوں، تاکہ ناظرین کرام آپ کے ارکانی احباب اور معاصرین سے واقف ہوسکیں:

(۱) مولانا جلال احمد صاحب، جنوبی منگڈو، مولانا کے واضح پتہ کی ضرورت تھی، لیکن افسوس ہے کہ نہیں ملا۔

(۲) مولانا شبیر احمد صاحب بوسیدنگی، شاید یہ وہی مولانا شبیر احمد صاحب ہو، جو مدرسہ عالیہ بوسیدنگ کے نامور مدرس تھے، جو راقم سطور کے بھی استاد ہیں۔

(۳) مولانا حافظ حامد حسین بن نور احمد گودام فاروی، مولف طلوع اسلام واکیاب کا جغرافیہ، ظاہر ہے کہ حافظ صاحب بڑے ذہین وفطین سیاسی لیڈر اور ارکانی زعیم تھے۔

(۴) حافظ ناظر حسین صاحب سندی فرانگی، سابق استاد مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ، راقم کے استاد۔

(۵) مولانا ابوالقاسم صاحب سندی فرانگی، سابق استاد وصدر الدرسین مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ، مولانا ابوالقاسم صاحب راقم کے رشتے داروں میں اس کے شفیق استاد تھے۔

مولانا کے پانچ صاحب زادے اور پانچ صاحب زادیاں ہیں، صاحب زادے سب کے سب عالم یا حافظ القرآن ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا حافظ عبدالرحمن، ولادت ۲۸ / جون/ ۱۹۶۴ء۔

(۲) حافظ مولانا حفظ الرحمن صاحب۔

(۳) مولانا لطف الرحمن صاحب۔

(۴) مولانا مفتی ضل الرحمن صاحب۔

(۵) حافظ سیف الرحمن صاحب۔

این خانہ تمام افتاب است

پلاٹون کمانڈر مولوی محمد ایوب شہید گدوسراوی

محمد ایوب بن مولانا اشرف علی بن مولانا محمود الرحمن بن مولانا محمد یعقوب جنوبی منگڈو کی بستی گدوسرا میں ۱۹۷۱ء میں پیدا ہوئے، ہوش سنبھالتے ہی مکتب کا راستہ دیکھا، آٹھ سال کی عمر میں ناظرۂ قرآن کریم ختم کر کے مدرسہ عالیہ شقدار فارہ میں چار سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ قاسم العلوم چارکمبو میں جاکر متوسطہ میں داخلہ لیا، دوران تعلیم اتحاد الطلاب المسلمین ارکان (ITM) کی دعوت ملی تو اس میں شامل ہو گئے، اتحاد الطلاب کے پیغام کی اشاعت اور اطراف و جوانب کے تمام مدارس میں اس کے نظم کا قیام اور طلبہ سے رابطہ و تعلق کو اپنا مشن بنالیا تھا۔

محمد ایوب ایک روایت کے مطابق شیریں سخن اور جادو بیان مشہور تھے، مجمع اکٹھا کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، جہاں پہنچے طلبہ تو طلبہ عوام الناس بھی ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور ان کی تقریر دلپذیر سے محظوظ ہوتے تھے۔

تنظیم سے تعلق کی بنا پر بعض حاسدین اور منافقین ان کے پیچھے پڑ گئے تھے، محمد ایوب کو مختلف حربوں، لالچ، ڈراؤ دھکاؤ سے تنظیم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی، بعد میں ناکام ہو کر حکومت کو خبر کر دی گئی تھی، اب ان کی تلاش شروع ہو گئی، گھر میں اور مدرسے میں چھاپے پڑنے لگے، جس کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑی، اور وہ معسکر میں آ گئے تھے۔

پڑوسی ملک میں انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور ایک مدرسے میں موقوف علیہ میں داخلہ لیا، اگلے سال معسکر کے مدرسہ ابن عباس الاسلامیہ میں داخلہ لیا، یہیں سے دورۂ حدیث کا امتحان پاس کیا، اور باقاعدہ سند فراغت کا حاصل کر لی، اس کے بعد وہ تھے اور معسکر تھا اور تربیت تھی، ذہنی، اخلاقی، تحریکی، علمی، جسمانی، روحانی، عسکری ہر قسم کی تربیت لی بھی اور دی بھی، معسکر میں قائم مارشل آرٹ سینٹر سے جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ حاصل کیا، یہ سلسلہ 1991ء تک مسلسل جاری رہا، اس دوران دشمن کے خلاف اکادکا کاروائیاں ہوئیں، جس میں محمد ایوب نے بھرپور حصہ لیا، اپنی مہارت اور شجاعت دکھائے، مگر ان میں تسلسل نہیں تھا، سب اتفاقی تھا، اب تک تنظیم نے باقاعدہ جہاد اور قتال

کا فیصلہ اور اعلان نہیں کیا تھا، اس سال ارکان میں برمی حکومت اور فوج نے آپریشن ''مہا بنڈولہ'' جو دراصل سابقہ آپریشن کا ایک خطرناک سلسلہ تھا، فوج نے ایک خوفناک آپریشن کی مہم شروع کی، جس سے لاکھوں مسلمانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر پڑوسی ملک کی سرحدوں کے اندر پناہ لینی پڑی، یہ بے یار و مددگار مسلمان کسی بین الاقوامی تعاون اور امداد کے بغیر جنگلوں اور بیابانوں میں پڑے رہے، کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا تو آر ایس او کو یہ محاذ بھی سنبھالنا پڑا، آر ایس او اور آئی ٹی ایم کے وابستگان، کارکنان، اور چیدہ چنیدہ مجاہدین کی یہ ڈیوٹی لگادی گئی کہ اپنے مہاجر بھائیوں کی ہر ممکنہ مدد کریں اور ان کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں، محمد ایوب بھی ان مجاہدین میں شامل تھے، جنہوں نے مہاجرین کی خدمت انجام دی تھی۔

کہتے ہیں کہ محمد ایوب کا اس کام میں اس قدر انہماک تھا کہ مہاجرین کے لئے نئے خیمے اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کرتے، انہیں دوائیاں پہنچاتے اور غذائی اشیاء تقسیم کرتے تو اپنا ہوش اور خیال تک نہ آتا تھا، اکثر رات کو بھوکے ہی ٹھکانے پر لوٹتے، روکھا سوکھا کچھ ملتا تو کھا لیتے ورنہ یونہی رات گزار کر صبح پھر روانہ ہو جاتے تھے، ۱۹۹۳ء میں جب یو این ایچ سی آر نے مہاجرین کیمپوں کا کنٹرول سنبھالا تو محمد ایوب اور دیگر مجاہدین معسکر میں واپس آ گئے تھے۔

اب تنظیم نے باقاعدہ جہاد کا فیصلہ کر لیا، اس کے لئے تیاری زور شور سے جاری تھی، ۱۹۹۴ء میں مجاہدین کے قافلے روانہ ہوئے تو محمد ایوب پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے اپنی جمعیت کی قیادت کرتے ہوئے سپہ سالارِ مجاہدین ماسٹر شبیر احمد کے ہمرکاب تھے، اور جنوبی منگڈو کا علاقہ ان کی تگ و تاز کا میدان تھا۔

محمد ایوب صحیح معنوں میں اپنے سالار کا دایاں بازو تھے، ان کو تدابیر بتاتے، مشورے دیتے اور مل کر دشمن پر چھاپے مارتے اور گھات میں بیٹھنے کی تخطیط اور منصوبہ بندی کرتے، دشمن کے ٹھکانوں پر شب خون مارتے تھے، مہینوں تک انہوں نے ایک جنگل میں ٹھکانہ بنا کر وہاں سے اقدامات کیے، مارو اور بھاگو ان کا شعار اور عمل تھا، دسیوں مقابلوں میں دشمن کے درجنوں فوجی جہنم رسید کر دیا تھا، مسلسل ہزیمتوں اور نقصانات کی وجہ سے دشمن کا ہوش اڑ گیا تھا، منافقین کی مدد سے فوج نے مجاہدین کا خفیہ

ٹھکانہ دریافت کر کے سینکڑوں فوجیوں کے ساتھ ان کا محاصرہ کرلیا تو کئی روز محمد ایوب اور ان کے ساتھی محاصرہ میں رہے، کھانے کو کوئی چیز باقی نہ رہی، دشمن میگا فون پر وقفے وقفے سے ہتھیار ڈال دینے کے لئے پکار رہا تھا، جس کے جواب میں مجاہدین نعرۂ تکبیر بلند کرتے رہے تھے۔

بالآخر ایک روز مجاہدین نے آخری نماز فجر ادا کی، اللہ تعالی کے حضور گڑ گڑا کر دعائیں کیں، زندگی بھر کی خطاؤں سے معافی مانگی، آپس میں بھی ایک دوسرے کو معاف کر دیا، دو مجاہدین کو رخصت دی کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر جس طرح بھی ممکن ہو معسکر میں پہنچ جائیں، ان میں سے ایک مجاہد بخیریت معسکر آ پہنچا، جب کہ دوسرا راستے میں دشمن کا نشانہ بن گیا تھا۔

محمد ایوب اور ان کے باقی ماندہ مجاہد ساتھیوں نے اپنی اپنی کلاشنکوفیں لوڈ کیں، فاضل میگزین سب جیبوں میں بھرے، دستی بم جسموں سے باندھے اور اپنے مورچوں سے نکل آئے، محاصرہ کرنے والی فوج کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مجاہدین آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے اس کے قریب پہنچیں گے، اس کے بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں مجاہدین نے کلاشنکوف اور دستی بموں سے دشمن پر زوردار حملہ کر دیا، کل انتیس مجاہدین نے شہادت حاصل کی، اور دشمن نے پچاس سے زیادہ لاشیں اٹھائیں اور سو کے قریب زخمی ہوئے، کوئی مجاہد زندہ دشمن کا ہاتھ نہ آیا، سارے مجاہدین آخری سانس اور آخری گولی تک ڈٹے رہے، اور مقابلہ کرتے رہے، یوں ایک ایک کر کے سب اللہ کے حضور پہنچ گئے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب کیوکتوی

مولانا مفتی محمد حسین کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ارکان کے مردم خیز شہر کیوکتو میں ایک دیندار گھرانے میں ہوئی، سنا ہے کہ آپ کے والدین بڑے نیک اور خادم علماء وصلحاء تھے، اور آپ کا خاندان بھی بڑا معزز خاندان ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں پائی، کچھ بڑے ہوئے تو علم وفن کا شوق دامنگیر ہوا اور سیدھے ہندوستان کی مایۂ ناز دانش گاہ دارالعلوم دیوبند جا داخل ہوئے، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے مولانا اعزاز علی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا انور شاہ کشمیری کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں رہے، خاص طور پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے قریب رہے تھے، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اپنے ایک تصدیق نامہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''احقر تصدیق کرتا ہے کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحب برمی دارالعلوم دیوبند کے تلامذہ میں سے ہیں، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ اور احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تقسیم ہند سے قبل گہرا تعلق رہا ہے، آپ اکیاب برما میں ایک دینی مدرسہ چلا رہے ہیں، اور برما کے حالات کے پیش نظر آپ اس مدرسہ کو رنگون میں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں''۔

جہاں تک پتہ چلا کہ مفتی محمد حسین صاحب حضرت تھانوی کے مرید خاص میں سے تھے، حضرت کے انتقال کے بعد آپ ہر حال میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالی کے ساتھ منسوب رہے، اور حضرت کے مشوروں کو اپنے ارادوں پر ترجیح دیا کرتے تھے، چنانچہ اپ نے حضرت قاری صاحب کی ایماء پر املہ فارہ اکیاب میں ایک دینی مدرسہ بنام ''مدرسہ تکمیل العلوم'' کی تاسیس کی، اور اپنی بقیہ پوری زندگی اس درسگاہ کی ترقی کے لئے وقف کردی، البتہ یہ اور بات ہے کہ آپ نے بنگال کے عظیم رہنما حضرت حافظ جی حضور کے ساتھ ایک طویل مدت گزاری تھی۔

آپ بڑے معاملہ فہم مفتی ہونے کے ساتھ ایک درویش صفت عالم دین تھے، اور دور اندیش سیاست دان بھی، بنگال میں بھی آپ کے سینکڑوں تلامذہ پائے جاتے ہیں، آپ کے مدرسہ ''تکمیل العلوم'' ارکان کے مایۂ ناز درسگاہوں میں شمار ہوتا ہے، آپ نے تقریبا ۹۸ سال تک عمر پا کر ۲۲/مئی/۲۰۰۳ء میں انتقال فرمایا، اور اکیاب میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب فتح علی فاروی

مولانا مفتی محمد حسین صاحب بن انو میاں کی ولادت ۱۹۱۶ء میں شمالی بوسیدنگ کی معروف بستی فتح علی فارہ میں ہوئی، مولانا کے والد محترم ایک کاشکار بڑے علماء دوست اور سخت بزرگ تھے، اور آپ کی والدہ حلیمہ بی بی بڑی پاک باز اور نیک سیرت خاتون تھی۔

حضرت مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں پائی، بعد میں علاقے کے اردو اسکول میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے مولانا الہی بخش صاحب اور ماسٹر ضمیر الدین صاحب سے استفادہ کیا تھا، اس کے بعد علوم دینیہ کے حصول کی نیت سے دارالعلوم فندوفرانگ میں جا داخل ہوئے، جہاں آپ نے حضرت مولانا محمد صدیق صاحب بانی مدرسہ مذکورہ سے خوب خوب استفادہ کیا، چونکہ مولانا محمد صدیق صاحب بڑے مناظر اور ماحی البدعات والحرافات ہونے کے اعتبار سے بڑے معروف تھے، شاید ان ہی کے فیض یافتہ ہونے کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب بھی اپنے وقت کے مفتی، مناظر اور ماحی البدعات والخرافات ہو گئے تھے، کیوں کہ:

وصف ہے شاگرد میں استاد کے

مولانا محمد حسین صاحب بعد میں بنگلا دیش کا حالیہ علاقہ چاٹگام گئے، وہیں کسی ایک دینی درسگاہ میں ایک سال تک تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹ آئے تھے۔

مفتی صاحب ابھی ارکان پہنچے ہی تھے کہ خبر ملی کہ ارکان سے چند طلبہ ہندوستان کو حصول علم کے لئے جارہے ہیں، چنانچہ آپ ان میں سے چند طلباء سے ملے، اور ان کے ساتھ ہندوستان جانے کا فیصلہ کرلیا، ویسے آپ ۱۹۳۳ء میں ہندوستان پہنچے، اطلاع یہ ہے کہ آپ نے امروہہ کے مدرسے میں ایک سال پڑھ کر اگلے سال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے ۱۹۴۰ء تک تعلیم حاصل کی اور وہاں کے بڑے بڑے باکمال اساتذہ سے خوب خوب استفادہ کر کے اسی سال ہی سند فراغت حاصل کرلی تھی۔

مولانا محمد حسین صاحب ۱۹۴۱ء میں وطن واپس آئے، اور اس سال کپڑے کی تجارت شروع کی، اور اسی سال یعنی ۱۹۴۱ء میں آپ نے شادی کی سنت بھی ادا کی، چونکہ یہ زمانہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا، ہر کجا فتنہ وفسادات برپا تھے، اس لئے مولانا کسی مدرسہ میں بیٹھ کر درس وتدریس کا سلسلہ جاری نہ کر سکے تھے، مگر دو سال گزرتے نہ گزرتے آپ نے ایک مستقل علمی وتعلیمی ادارہ کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کرلیا،

چنانچہ آپ کے فیصلہ میں اللہ تعالی نے برکت دی اور آپ کے ہاتھ سے ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد پڑی، جو آگے چل کر یہاں کے مسلمانوں کے لئے بڑی سودمند ثابت ہوئی تھی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''۱۹۴۳ء میں مولانا محمد شریف فتح علی پاروی، حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب پندوپر انگی، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ، علاقے کے ایک بزرگ حضرت مولانا عبدالصمد صاحب اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب سر جوڑ کر بیٹھے، اور صلاح ومشورہ کے بعد تنگ بازار میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں مدارسہ دارالعلوم کے نام سے شہرت پائی، مذکورہ کمیٹی نے متفقہ طور پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اول مدرس اور مفتی قرار دیا، یوں مدرسہ چل پڑا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے درس وتدریس کے ساتھ باقاعدہ دارالافتاء بھی قائم فرمایا، جو بوسیدنگ میں پہلا دارالافتاء ہے، چونکہ اس زمانے میں علمائے سو پیسوں سے من مانی فتوی جاری کرتے تھے، اس لئے کسی مفتی صاحب کے فتوی پر لوگوں کا اعتماد نہیں تھا (۱) حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دارالافتاء منظر عام پر آتے ہی لوگ جوق در جوق اس طرف آنے لگے، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فتوی حاصل کرنے لگے، یوں علمائے سوء کا قلع قمع ہو گیا، اور بوسیدنگ میں باقاعدہ دارالافتاء کا اجراء عمل میں آ گیا''۔(۱)

اس درسگاہ میں حضرت مفتی صاحب نے تقریبا پینتیس سال تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیں اور ساتھ ساتھ دارالافتاء کے امور بھی انجام دیئے تھے، ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی خدمات بار آور ثابت ہوئیں، یہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تشنگان علوم نبوت نے سیرابی حاصل کی، اور آپ کی کوشش اور جان فشانی سے یہاں سے بدعت وخرافات کا قلع قمع ہو گیا تھا، اس مدرسہ کے ساختہ

---

(۱) میرے علم کے مطابق اسی زمانے میں بھی یہاں کے ہر علماء علمائے سوء نہ تھے اور نہ ہر مفتی علمائے سوء میں داخل تھے، اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ یہاں بعض علماء علمائے سوء میں سے تھے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس زمانے میں یہ علاقہ علمائے خیر سے بھی بھرا پڑا تھا، جن کے فتاوے پر لوگوں کا بھرپور اعتماد تھا۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص:۲۵۸۔

پرداختہ رجال کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''صرف ایک سال کی قلیل مدت میں مدرسہ دارالعلوم تنگ بازار نے بہت ترقی کی اور مزید آٹھ اساتذہ کرام کا تقرر عمل میں آیا، جن میں حضرت مولانا نجم الدین صاحب بوسیدنگی رحمۃ اللہ علیہ(۱) قابل ذکر ہیں، اسی مدارسہ دارالعلوم تنگ بازار میں ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ حضرت مولانا فیض الاسلام صاحب بوسیدنگی تنگ بازاری فاضل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سن فراغت ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء (۲) اور پیر مظفر احمد مینگزوی والے فاضل دارالعلوم دیوبند سن فراغت ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء بانی مدرسہ ریاض العلوم مینگزی نے تعلیم حاصل کی، اور حضرت مفتی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا''۔(۳)

حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب نے ۱۹۷۸ء میں سرزمین ارکان کو خیر باد کہہ کراچی کی راہ لی، نہ جانے یہ کس وجہ سے کہ آپ جیسے انسان نے اپنی قوم اور اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر پاکستان کی راہ لی تھی، خیر جو کچھ بھی ہو کہ آپ کراچی پہنچے تو مدرسہ خلیلیہ کے ارباب بست و کشاد نے دعوت دی کہ آپ تشریف لائیں اور اس مدرسے کو رونق بخشیں، آپ نے دعوت قبول کی اور ۱۹۷۹ء میں مدرسہ مذکورہ کے سینئر مدرس مقرر ہوئے اور اس کے بعد یہاں چھ سال مسلسل خدمات انجام دیں۔

۱۹۸۵ء میں آپ برمی کالونی منتقل ہو گئے، اور یہاں کے مدرسہ حقانیہ اشرفیہ میں سالوں تک درس دیتے رہے، آخرکار ارکان کی یہ عظیم المرتبت علمی اور فنی شخصیت اپریل/ ۲۰۰۳ء میں اپنے خالق حقیقی سے جاملی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے چار صاحب زادے ہیں:

(۱) مولانا عبدالاول صاحب ایک عالم دین ہیں، ولادت ۱۹۷۴ء ہے۔

(۲) مولانا محمد یحیی صاحب بھی ایک عالم دین ہیں۔

---

(۱) مولانا نجم الدین صاحب رحمہ اللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور جلیل القدر عالم دین تھے۔

(۲) مولانا فیض الاسلام صاحب ارکان کے عظیم المرتبت داعی الی اللہ تھے۔

(۳) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۲۵۸-۲۵۹۔

(۳) ماسٹر محمد وارث صاحب دانشور ہیں۔

(۴) ڈاکٹر محمد حارث دانشور ہیں۔

اللہ تعالی ان تمام کی حیات میں برکت دے اور ملک وقوم کی خدمات کے لئے قبول فرمائے، آمین۔

مولانا محمد حسن شہید سانگو دائنگی

محمد حسن بن محمد انور بن حسن علی یکم/شوال المکرم بروز عید الفطر ۱۳۸۷ھ میں سانگو دائنگ تھانہ راسیدنگ میں پیدا ہوئے، ان کے آباؤ واجداد بھی اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد مرحوم ایک متوسط طبقہ کے تاجر تھے، جب محمد حسن کی عمر سات سال کی ہوئی تو والد نے پرائمری اسکول میں داخل کروایا، ہر سال اچھے نمبروں میں پاس ہوتے رہے، اس دوران دینی تعلیم کا شوق پیدا ہوا، پرائمری پاس کرنے بعد والد صاحب نے دینی تعلیم کی خواہش ظاہر کردی، والد نے قریبی بستی سامله کے ابتدائی مدرسہ میں داخل کروادیا، دو سال میں ابتدائیہ ختم کرکے یونگ چنگ کا معروف مدرسہ محی العلوم جا کر درجہ اولی میں داخل ہوگئے، جب کہ درجہ ثانیہ اور ثالثہ کی تعلیم مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ سے حاصل کی۔

اسی دوران انہوں نے مارشل آرٹ بھی سیکھی، اور کنفو کے فن میں براؤن بیلٹ تک پہنچے، خنجر زنی اور لاٹھی چلانے کے ماہر تھے، ان کا رہائشی محلہ کفار کی بستیوں کے بیچ واقع ہونے کے سبب سے ہر وقت موضع خطرہ بنا رہتا تھا، بالخصوص مسلمانوں کو ضرورت پر کہیں آنے جانے کے وقت مگھ آبادی کے بیچ سے گزرنے کی مجبوری کے سبب آئے دن ان کے ظلم وتعدی کا نشانہ بننا پڑتا تھا، ایسے میں اہل محلہ کے لئے محمد حسن کا دم اور وجود غنیمت تھا۔

درجہ متوسطہ کی تکمیل کے بعد ان کو ار ایس او کی دعوت مل گئی، دعوت کے لئے وہ پہلے سے تڑپ رہے تھے، تنظیم کی دعوت ملی تو وہ گھر میں بیٹھے نہ رہ سکے، انہوں نے اپنے ہم عمر چچا مولانا نور حسین کو اپنے ساتھ لیا، چارکمبو میں مولانا حافظ حبیب اللہ کے مدرسہ میں داخل ہوگئے، اور ساتھ ہی تحریک سے باقاعدہ منسلک ہوگئے، ایک سال وہیں تعلیم حاصل کی اور ساتھ ساتھ دعوتی کام بھی بڑی حکمت عملی سے جاری رکھا، دیگر طالب علموں کو تحریک سے روشناس کرایا، مطالعہ کی عادت ڈلوائی، ذہنی وجسمانی تربیت کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں شکلوں میں ار ایس او کے معسکر میں بھیجوایا۔

بعد میں بوسیدنگ اور راسیدنگ کے علاقے میں تنظیم کی دعوتی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لئے خود محمد حسن کو ان علاقہ جات میں بھیجا گیا، ہدایت کے مطابق اگلے سال وہ ان کا پرانہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں جا داخل ہوئے، تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے ساتھیوں سے مل کر پورے علاقے

میں دعوتی کام کا جال بچھا دیا، سینکڑوں طلبہ کو تربیت کے لئے بھیجا، ہزاروں کے ہاں دعوت کا پیغام پہنچایا، جگہ جگہ تنظیمی حلقے قائم کئے، بعدازاں ان دونوں چچا بھتیجا نے ایک منافق کے کام تمام کرتے ہوئے ہجرت کی راہ لی۔

۱۵ /شوال المکرم/ ۱۴۰۸ھ کو دعوتی اور تنظیمی ذمہ داری ساتھیوں کو سونپ کر ہجرت کے شدید مراحل طے کرتے ہوئے ار ایس او کے معسکر میں آپہنچے، جہاں ان کی اچانک تشریف آوری پر حیرت ہوئی وہیں خوشی کی لہر بھی ڈور گئی تھی، قائدین نے تمام روداد سننے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ بقیہ تعلیم مکمل کریں، ایک سال دورۂ حدیث کا باقی تھا، تو ان کو دارالعلوم چکمارکول بھیج دیا گیا، یہاں بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ دعوتی پروگرام کو جاری رکھا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۴۱۰ھ میں باقاعدہ مجاہد کی حیثیت سے معسکر میں شامل ہوگئے، عسکری تربیت حاصل کی، ان کے اخلاص، صبر، حلم اور مستقل مزاجی پر قائدین اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے تھے، احباب میں بھی وہ مقبول اور ہر دلعزیز تھے، کیوں کہ وہ نہایت معتدل مزاج اور سنجیدہ تھے، رحم دل اور ہنس مکھ ہونے کے علاوہ وعدے کے پکے تھے، چنانچہ یہاں ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے سیکشن کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کے درجہ تک پہنچے تھے۔

اسی اثناء میں شادی کی سنت بھی ادا کی، ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے، جب تنظیم نے باقاعدہ جہاد کا فیصلہ کیا تو ۲۵ /اپریل/ ۱۹۹۴ء کو وہ معسکر سے بحیثیت سب ایریا کمانڈر برائے جنوبی منگڈو اپنے گروپ کو لے کر روانہ ہوئے، ہدف پر پہنچنے کے بعد دشمن پر حملے کی تیاریاں شروع کیں، اور طے شدہ تاریخ ۱۲ / اپریل سے گوریلا کاردائیاں شروع کردیں، وہ دشمن پر شب خون مارتے، گھات لگا کر بیٹھ جاتے، دشمن کی گزرگاہوں پر بارودی سرنگیں بچھا دیتے، یوں دشمن کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچاتے تھے، بالآخر دشمن نے تنگ ہوکر بھاری نفری اس علاقے میں بھیجوا دی، چھاتہ بردار فوج اور اسپیشل کمانڈوز ہیلی کاپٹر کے ذریعے جنگلوں اور وادیوں میں اتار دی، مگر ان سب کے باوجود مجاہدین کو قابو نہ کیا جا سکا، ان کی کاردائیاں مسلسل جاری رہیں اور دشمن کی چالیں ناکام ہوتی رہیں۔

بالآخر دشمن نے اپنی حکمت عملی بدلی، ان سے براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مسلم آبادیوں کے اندر چاروں طرف چوکیاں قائم کرلیں، فوجیوں نے مخبروں، اور منافقین کا جال بچھا دیا، مجاہدین سے ہمدردی رکھنے والے افراد کی کھوج لگانے لگی، ان تک پہنچنے والے رسد کی کڑی نگرانی کی جاتی رہی،

مسلمانوں کوڈرانا دھمکانا شروع کر دیا گیا،غرض ظلم و بربریت کا بازار گرم کر دیا گیا، عام نوجوان گرفتار اور تشدد کے بعد قتل کا نشانہ بننے لگا، علماء اور بزرگوں کی بے عزتی اور خواتین کی عصمت دری ہونے لگی، مجاہدین کے ساتھ تعلق کے شبہ پر قتل کیا جانے لگا، مجاہدین کے ساتھ تعاون کرنے والے بالکل عاجز آ گئے ،مگر مجاہدین کے جذبات میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی، انہوں نے اپنا پروگرام جاری رکھا، تھوڑا بہت ذخیرہ جو محفوظ تھا اسے طویل مدت تک کام میں لانے کے لئے منصفانہ تقسیم کا نظام وضع کیا، ایک وقت کھاتے اور دوسرے وقت بھوکے رہتے تھے، درختوں کے پتے اور گھاس پھوس اور جنگلی پھل بھی کھائے مگر بزدلی کا خیال تک کبھی نہ آیا تھا۔

پورے علاقے میں برمی فوج حشرات الارض کی طرح پھیلی ہوئی تھی ،خوراک کا کوئی انتظام مجاہدین کے پاس نہ تھا، ایک طرف بارش کا موم تو دوسری طرف جنگل کی بھیانک صورت حال، اب مجاہدین کی صحت اور جسانی طاقت شدید متاثر ہونے لگی تھی ،تو محمد حسن اور چند ساتھی مجاہدین بھیس بدل کر قریبی گاؤں میں اترے، تا کہ حالات کا جائزہ لیں، اور مجاہدین کے لئے کچھ کھانے کا انتظام بھی کریں، ایک منافق کی نظر ان پر پڑ گئی، وہ چلانے لگا، شور کی آواز سن کر مسلح برمی فوج آ گئی، ان مجاہدین نے خود کو بچانے کی مقدور بھر کوشش کی، مگر ناکام ہوئے۔

وہ پکڑے جانے کے بعد آنکھوں میں پٹی باندھ کر انہیں ٹارچر سیل لے جایا گیا، فاقوں کے سبب پہلے سے لاغر تھے، مزید تشدد سے جاں بلب ہو گئے ، بعد ازاں ملٹری ہڈ کواٹر لے جایا گیا، برمی فوجی افسر کے سانے پیش کیا گیا، اس نے محمد حسن کو واقعی افغان یا غیر ملکی سمجھ کر پہلے انگریزی میں بیٹھنے کا حکم دیا، وہ خاموش رہے تو ٹوٹی پھوٹی روہنگیا زبان میں حکم کو دہرایا تو اس نے فصیح برمی زبان میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> ”تم کس دھوکے میں پڑ گئے ہو، میں اس سرزمین کا فرزند ہوں، اور تم غاصب اور ظالم ہو، یہاں کوئی غیر ملکی اور افغان نہیں ہے، ہم روہنگیا ہزار سالوں سے اس سرزمین کے باشندہ ہیں، صرف اللہ پر بھروسہ کر کے اور اس کی مدد سے تم سے لڑ رہے ہیں، تمہارے کہنے پر نہیں بیٹھوں گا، اگر تمہارا حکم ماننا تھا تو ہمارے تمہارے درمیان کیا جھگڑا تھا؟“۔

اس کے جواب سن کر افسر نے ان کے ٹانگوں پر پستول کی گولی چلائی، تو انہی مجبورا بیٹھنا پڑا، ان سے

مجاہدین کے خفیہ اڈوں، فوجی ساز و سامان وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی، مگر انہوں نے اپنی زبان سختی سے بند رکھی، بالآخر ان کو سفر آخرت کا راہی بنا دیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب تک نہ چلے دیپ شہیدوں کے لہو گے
کہتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

حضرت مولانا محمد سعید صاحب قاسمی تمبر وی

حضرت مولانا محمد سعید بن خلیل الرحمن چوہدری شمالی منگڈو کی معروف بستی تمبر و میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مرحوم ایک زمیندار آدمی تھے، ساتھ ساتھ سخاوت اور نیک خوئی وخیرخواہی ان کی طبیعت ثانیہ تھی، کسی کے دل میں دکھ پہنچانا گویا وہ اپنے دل میں دکھ پہنچانے کا مترادف سمجھتے تھے، ۱۹۴۷ء والے جہاد میں انہوں نے دامے درمے قدمے سخنے مجاہدین اسلام کی خوب مدد کی تھی، کہتے ہیں کہ مولانا کی والدہ بھی ایک پارسا اور عابدہ خاتون تھی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں پائی، اور اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، ہندوستان میں آپ دارالعلوم دیوبند میں پڑھے، یہاں سے دورۂ حدیث پاس کرکے دینی تعلیم مکمل کی، آپ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے تلامذہ میں سے تھے۔

مولانا محمد سعید صاحب ہندوستان سے واپسی کے بعد بہت جگہوں میں درس وتدریس کے کام میں مشغول رہے، ساتھ ساتھ جہاد کونسل سے بھی رابطہ میں تھے، ۱۹۷۳ء کے بعد روہنگیا فدائین محاذ (RPF) میں آپ خفیہ طریقہ سے کام کرتے ہے، ۱۹۸۶ء کے بعد ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) میں رکن ہونے کے علاوہ شریعہ کونسل کے چیرمن منتخب ہوئے، ان مذکورہ تنظیموں کے زیر سائے آپ نے بڑی بڑی دینی، ملی، قومی اور وطنی خدمات انجام دیں۔

مولانا محمد سعید صاحب بڑے پائے کے عالم دین ہونے کے ساتھ نہایت صاف گو اور خوش طبع حلیم اور بردبار اور منصف مزاج انسان تھے، بڑھاپے کے عالم میں مولانا نائکان سری سے بڑی تکلیف برداشت کرتے ہوئے آئے دن مجاہدین کے مرکزی معسکر ''زارائلہ سری'' میں آتے جاتے تھے، حضرت سے ایک دن موقع پاکر پوچھا گیا کہ آپ اس بڑھاپے کے عالم میں آئے دن کیوں معسکر آتے جاتے ہیں؟ تو جواب میں فرمانے لگے کہ:

> ''ظاہر ہے کہ میں ایک سن رسیدہ آدمی ہوں، یہاں آنے جانے میں بڑی تکلیف بھی ہوتی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ میرا یہاں روزانہ کی بنیاد پر کوئی لازمی کام بھی نہیں ہے، لیکن میں نے مجاہدین میں نام لکھوادیا ہے، آرزو بس یہی ہے کہ روز محشر

> میں مجاہدین کی قطار میں شامل ہوکر خدائے ذوالجلال والجبروت کے سامنے حاضر ہوجاؤں، میرا یقین ہے کہ اس صورت میں میری بخشش ہوجائے گی''۔

مولانا کے نزدیک مجاہدین شامل ہوجانا بھی ایک انسان کی نجات کے لئے کافی ہے، مولانا ہر وقت قرآن وسنت کی روشنی میں مجاہدین میں وعظ ونصیحت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب کے ساتھ اس کی فضیلت بیان کرتے تھے، اور جو بھی بیان کرتے، بڑے واضح طور پر بیان کرتے تھے۔

مولانا بڑے ہنس مکھ اور دل دردمند انسان تھے، مجاہدین کو اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتے تھے، کسی کے دل میں دکھ پہنچانا آپ کے نزدیک ایک لاتلافی اور ناقابل معافی گناہ تھا، ہرکس وناکس سے خیر خواہی کی بنیاد پر ملتے اور ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوا کرتے تھے، اس لئے ہر آدمی آپ کے مداح تھے، محترم جناب اڈووکٹ نور الاسلام صاحب (حالیہ صدر ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن ARNO) کو مولانا بہت ہی پسند کرتے تھے، اور نورالاسلام صاحب کے نزدیک مولانا ایک عظیم اور زندہ دل عالم دین ہونے کے ساتھ ایک فکر ارجمند کے مالک مفکر اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، آئے دن اڈووکٹ صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں، میں نے بھی مولانا کو بہت قریب سے دیکھا، میرے خیال میں مولانا ایک بڑے عالم دین ہونے کے ساتھ ایک زاہد قسم کے عابد انسان تھے، علاوہ ازیں ایک دردمند مجاہد فی سبیل اللہ بھی۔

زندگی کے آخری ایام میں مولانا مدتوں تک موضع نائکان سری میں علالت میں مبتلا تھے، فربہ جسم کے مالک اس انسان کو ضعف اور کمزوری نے بہت ہی ستایا تھا، بالآخر آپ نے ۱۹۹۹ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، نائکان سری کی جامع مسجد کے بغل میں مدفون ہیں۔ آرزو کے مطابق اللہ تعالی مرحوم کو مجاہدین کی قطار میں شامل کرے، آمین۔

مولانا محمد سلیم شہید خواندنگی، بوسیدنگی

مولانا محمد سلیم خواندنگی بوسیدنگی ۱۹۶۱ء میں بستی خواندنگ میں پیدا ہوئے، گھر والے آپ کو حمید حسین کے نام سے پکارتے تھے، آپ کے والد ماجد جناب عبد الہادی صاحب ایک متمول آدمی تھے، اور اچھے خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے علاقے میں بڑی شہرت رکھتے تھے، اور آپ کا چچا جناب ماسٹر غلام شریف صاحب کیاندنگ اسکول کے استاد اور علاقے کی معروف شخصیت میں شمار تھے۔

مولانا محمد سلیم مرحوم اپنی چار بہنوں اور تین بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں، مولانا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے فرقانیہ اور سرکاری اسکول میں حاصل کی، کچھ بڑے ہوئے تو دینی تعلیم کے لئے مدرسہ مظاہر علوم خواندنگ میں داخلہ لیا، یہاں درجۂ ثانیہ تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ انوار العلوم فوئما لی اور مدرسہ امداد العلوم سیندنگ میں تعلیم حاصل کی، پھر جنوبی منگڈو کی معروف درسگاہ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ جا داخل ہوئے، جہاں سے آپ نے مشکوۃ المصابیح تک تعلیم پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان کا رخ کیا اور شوال/ ۱۴۰۲ھ کو دار العلوم کراچی میں درجۂ رابعہ میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے ۱۴۰۵ھ تک مسلسل تعلیم حاصل کی تھی۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں دار العلوم کراچی میں مولانا شہید کے ہم سبق اور ہم جھولی تھے، یوں طالب علمی کے دور میں مولانا شہید کے اوصاف حمیدہ کی تفصیلات حافظ صاحب کے قلم سے ملاحظہ کیجئے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:

> ’’مختصر یہ ہے کہ شوال/ ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں میں نے جامعہ دار العلوم کراچی میں درجۂ سادسہ (مساوی بی اے) میں داخلہ لیا، مولانا سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی اس درجہ کے طالب علم تھے اور جامعہ کی طرف سے مجھے جو کمرہ ملا اس کمرہ میں مولانا سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش تھی، حسن اتفاق سے مولانا سلیم رحمۃ اللہ علیہ کی برابر والی چارپائی مجھے ملی، کمرہ کے ہر طالب علم کو الگ الگ الماری ملی تھی، مگر الماریاں کم پڑنے کی وجہ سے مجھے نہیں ملی، چونکہ میرا داخلہ نیا تھا، اس لئے کسی ساتھی سے زیادہ شناسائی بھی نہیں تھی، مگر مولانا سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ایثار کو دیکھئے کہ انہوں نے از خود پیش کش کی اور اپنی الماری کی طرف اشارہ کرتے

> ہوئے کہا ’’کوئی بات نہیں یہ الماری ہم دونوں میں مشترک رہے گی‘‘ چنانچہ تالا اور چابیاں مشترک رہتی تھیں۔
>
> ہم جماعت ہونے کی وجہ سے کمرہ کے علاوہ درسگاہ اور مطالعہ گاہ میں ہم ساتھ ساتھ ہوتے تھے، اور آپس میں بعض کتابوں کی تکرار اور باہمی مذاکرہ بھی رہتا تھا، یوں سلیم بھائی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اللہ تعالی نے موصوف کی طبیعت میں بہت نفاست رکھی تھی، کبھی کبھار پر مزاح اور بذلہ سنج باتوں سے ساتھیوں کو محظوظ بھی کرتے تھے، لیکن فضول گوئی سے دور رہتے تھے، منکسر المزاج اور متواضع تھے، لیکن حق کا اظہار برملا کرتے تھے، آپ کے اندر علم کے لئے سچی طلب پائی جاتی تھی، اور درس گاہ سے کبھی غیر حاضر نہیں رہتے تھے، جن پر جامعہ کی طرف سے متعدد دفعہ انعامی وظیفہ بھی ملا، سبق سے فارغ ہو کر آموختہ سبق دیکھنے کا معمول تھا، تکرار و مطالعہ کا بہت اہتمام تھا، اوقات کو ضائع نہیں کرتے تھے، اور کبھی جامعہ کے مطبخ کی لائن میں کھڑے ہو کر کھانا نہیں لیتے تھے بلکہ ہجوم ختم ہونے تک مطالعہ میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ باورچی کی زبان زد یہ بات تھی کہ مولوی سلیم کھانا لینے والا آخری طالب علم ہوتا ہے، اس لئے اس کے بعد کسی کے انتظار کی ضرورت نہیں رہتی، سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ اتباع سنت کا بہت اہتمام کرتے تھے، ہمیشہ تکبیر اولی کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
>
> مولانا شہید موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی میرے ساتھ اکثر جہاد، شہادت اور موت کے بعد والی زندگی پر گفتگو ہوتی تھی، بلکہ یہی باتیں ان کا موضوع سخن تھیں، میں نے ایک وفعہ باتوں باتوں میں پوچھا کہ سلیم بھائی! آپ گذشتہ سال افغانستان گئے تھے، آپ کو وہاں کا ماحول کیسا لگا؟ تو کہنے لگا کہ: مجھے تو بہت پسند آیا، بلکہ وہاں کے مناظر ارکان (برما) جیسے ہیں، کہ فلک بوس پہاڑوں کے بیچوں بیچ کہیں ندیاں اور کہیں سبزہ زار اور کہیں ہرا بھرا میدانی علاقہ‘‘۔(۱)

اللہ تعالی نے مولانا کے پسندیدہ ملک کو ان کا آخری خواب گاہ بنایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ شعبان/ ۱۴۰۵ھ

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۳۹۔۲۴۰۔

میں وہ مجاہدین اسلام کے قافلہ جو دارالعلوم کراچی سے افغانستان گیا تھا میں شامل ہوئے، جس میں دار العلوم کراچی کے دیگر طلباء بھی تھے، اور ٦/شوال/ ١٤٠٥ھ کو پکتیکا اور غزنی کے مابین واقع علاقہ شرنہ میں حرکتہ الجہاد الاسلامی کے بانی اور امیر اول حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب سمیت ٢٢/مجاہدین کو جام شہادت نصیب ہوا، ان میں دارالعلوم کے دیگر چھ طلباء کے ساتھ مولانا سلیم بھی شامل تھے، معرکۂ عظمی میں شدید زخمی ہو گئے تو اونٹ پر لاد کر بقیہ زخمیوں کے ساتھ پاکستان لاتے ہوئے راستے میں شہید ہو گئے تھے، اور شرنہ کے قریب ایک گاؤں ''موش خیل'' میں سپرد خاک کیا گیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم ان مذکورہ طلبائے دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ سب دارالعلوم کے بڑے ہونہار طالب علم تھے اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبۂ بے تاب انہیں اپنی چھٹیوں کے دوران جنگ تک لے گیا، وہاں انہوں نے جس عزیمت و استقامت کے ساتھ خالص اللہ کے لئے جان دی، وہ ہم سب کے لئے لائق رشک بھی ہے اور قابل فخر بھی، انہوں نے لوگوں کو شدید بارش میں بھی نہ صرف یہ کہ دشمن کو پشت نہیں دکھائی، بلکہ آخر وقت تک شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے، اور شہادت کی موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، ان میں سے بعض طلبہ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ جاتے وقت اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہمارے لئے دعا کرنا کہ ہمیں شہادت نصیب ہو، ان خدا مست نوجوانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے جہاد افغانستان کی آبیاری کی ہے اور اللہ تعالی کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ خونِ معصوم رنگ لائے گا، آج ہمارے دل ان ہونہار جوانانِ رعناء کی جدائی سے مغموم بھی ہیں اور ہمارے سر فخر سے بلند بھی کہ بحمد اللہ ابھی ہم میں ایسے جان نثار موجود ہیں جو نام و نمود سے بے پرواہ ہو کر صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے جان دے سکتے ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را (١)

(١) مولانا حافظ محمد صدیق، بحوالۂ ماہِ نامہ البلاغ، ذی الحجہ/ ١٤٠٥ھ۔

اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی رقم طراز ہیں کہ:

''یہ مجاہدین طلبہ جب ٦/شوال کو دشمن پر حملہ کے لئے روانگی کی تیاری کر رہے تھے، تو انہوں نے اس امید پر غسل کیا تھا کہ شہید ہوں گے، جن کو میسر ہوئی خوشبو بھی لگائی، عجیب بات یہ ہے کہ غسل کرنے والے تمام طلبہ کو شہادت نصیب ہوئی۔

یہ سب گمنامی میں اپنا سفر حیات پورا کرنے والے وہ پاکباز شہداء ہیں، جنہوں نے اسلام کی عظمت و حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا کر آخرت کی حیات جاوداں پالی۔

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اس کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

مگر دنیا کو ان کی حالت تو کجا نام بھی معلوم نہیں، کاش! میں ہر ایک کے حالات لکھ کر ان کی عظمتوں کو کچھ خراج عقیدت پیش کر سکتا۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند

تاہم اپنے ان چھ جگر گوشوں کا مختصر تذکرہ تو کر سکتا ہوں، جو دارالعلوم کراچی کے ہونہار طلبہ تھے، اور ہمارے پدرانہ آغوش سے سالانہ تعطیلات میں جدا ہوئے تھے.... مولوی سلیم شہید رحمتہ اللہ علیہ عبد الہادی صاحب کے یہ سعادت مند صاحب زادے ١٩٦١ء میں ملک برما میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی، اور مسلمانوں پر وہاں سوشلسٹ حکومت کے مظالم ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے، جن کے باعث لاکھوں مسلمان اپنے دین اور عزت کو بچانے کے لئے ہجرت پر مجبور ہو گئے، یہ اس نیت سے پاکستان آئے کہ اسلامی علوم حاصل کر کے اپنے بے کس ہم وطن مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کریں، اور دارالعلوم کراچی میں ٣/سال زیر تعلیم رہے، ١٩٨٥ء تک مرحلۂ عالیہ کی تکمیل کر چکے تھے، درس نظامی کے صرف دو سال باقی تھے، جہاد میں جاتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہا ''دعا کرنا مجھے شہادت نصیب ہو جائے''۔(١)

(١) مولانا حافظ محمد صدیق، بحوالۂ ماہِ نامہ البلاغ کراچی، جمادی الاولی/ ١٤٠٩ھ۔

محترم مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے شہید محترم کی بڑی توصیف کی ہے، اور جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حافظ صاحب کا یہ توصیف کرنا حق بجانب تھا، ان کی تحریر سے مجھے جتنا یقین ہوا کہ شہید مرحوم بڑے زندہ دل، پاک باز اور اسلام کے لئے بڑے مخلص طالب علم تھے، اس حوالے سے حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''چونکہ مولانا محمد سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نیت صاف تھی، رضائے الٰہی پیش نظر تھی اور گمنامی پسند تھی، اس لئے شہادت کے بعد مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جو شہرت ہوئی، زمانۂ جدید میں کسی اور برمی کی نہیں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمری متعدد رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکی ہے''۔(۱)

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص:۲۴۶۔

حضرت مولانا محمد شاکر کونسلر صاحب پتھری قلعوی

طبیب حاذق کونسلر مولانا محمد شاکر صاحب ۱۹۱۴ء میں پتھری قلعہ کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک زمیندار ہونے کے ساتھ ایک تاجر اور سخی انسان تھے، اور آپ کی والدہ ماجدہ بھی ایک دین دار اور پارسا و عابدہ خاتون تھی۔

مولانا محمد شاکر کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو اکیاب گئے، اور وہاں متوسطہ کی تعلیم پا کر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے، اس درس گاہ میں آپ نے چند سال تعلیم حاصل کی، کہتے ہیں کہ آپ بڑے محنتی طالب علم تھے، بالآخر آپ نے عالمیت کا امتحان پاس کرتے ہوئے اس مدرسہ سے سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس آئے تھے۔

وطن میں آپ کے ساتھ بارہا مگھ وحشیوں نے بے ادبی کی تو ایک معرکہ میں آپ نے دو کافروں کو جہنم رسید کر دیا، اس کے بعد آپ کے لئے وطن کی زمین تنگ ہوگئی تو آپ جہادی قافلہ ''جہاد کونسل'' میں شامل ہو گئے، آپ نہایت مدبر، معاملہ فہم اور خوش طبع انسان تھے، چنانچہ آپ نے اس جہادی قافلے میں نمایاں خدمات انجام دیں تو آپ کو ۱۹۴۸ء میں کونسلر منتخب کیا گیا تھا۔

مولانا محمد شاکر نے جہاد کونسل میں مدتوں تک بڑی قابل قدر خدمات نبھائیں اور اپنی جسمانی اور فکری توانائی کو قافلۂ جہاد کے لئے صرف کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھی، آپ ایک قابل قدر عالم دین ہونے کے ساتھ ایک حاذق طبیب بھی تھے، تو آپ نے اپنے اس فن سے مجاہدین اسلام کی بہت اہم اور ضروری خدمت کی، ہر جگہ اور ہر موقع پر آپ کی خدمات مجاہدین کے کام میں آئی تھیں۔

مجاہد اعظم حضرت محمد جعفر حسین قوال کی شہادت حسرت آیات کے بعد مولانا محمد شاکر صاحب محمد عباس کے ساتھ کام کرتے رہے تھے، اگر چہ بعد میں محمد عباس صاحب کی سبکدوشی کی وجہ سے آپ کو نہایت رنج و افسوس ہوا، لیکن اس کے بعد بھی میجر جنرل جناب صالح احمد صاحب کے ساتھ مسلسل کام کرتے رہے تھے، ۱۹۶۱ء میں میجر جنرل صالح احمد صاحب بشمول چند ساتھیوں کے برمی حکومت کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد شاکر صاحب تمبرو کے مقام پر رہائش پذیر ہو گئے تھے، جہاں آپ نے ۱۹۸۰ء میں انتقال کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد صاحب پنکھاوی

سرزمین ارکان کے نامور عالم دین و مدبر حضرت مولانا محمد صاحب موضع پنکھا میں ایک کاشتکار خاندان میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک کاشتکار اور علماء پسند بزرگ تھے، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ بھی نہایت عابدہ اور خداترس خاتون اسلام تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں ہوئی، جہاں ابتدائی دینیات کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی زبان میں خاصی مہارت حاصل کرلی، کہتے ہیں کہ مولانا محمد صاحب اسی زمانے سے مثنوی مولانا روم سے خاصی دل چسپی رکھتے تھے، بہرحال کچھ بڑے ہوئے تو ارکان کے دیگر چند مدارس میں پڑھے اور بطور خاص تفسیر، حدیث اور فقہ اسلامی میں مطالعہ کرتے ہوئے سند فراغت حاصل کی۔

طالب علمی کے دوران ۱۹۴۲ء کا واقعۂ کرب و بلا رونما ہوا تو آپ نے ایک طالب علم مجاہد کی حیثیت سے آپ نے مسلمانانِ ارکان کی خاصی خدمت اور رہنمائی کی، بعد میں آپ کے لئے ارکان کی زمین تنگ ہوگئی تو آپ اپنے خاندان سمیت ایک بڑی جماعت کی رہنمائی کرتے ہوئے ارکان سے ہجرت کرکے بنگال پہنچے، اور رنگپور کے کیمپ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔

رنگپور میں مولانا محمد صاحب "پنچائت العلماء" نامی تنظیم کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھے، اس تنظیم میں رہتے ہوئے آپ نے اپنے مہاجر مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں، ساتھ ساتھ وہاں قائم کیا گیا ایک مدرسے میں مہاجرین کے طلبہ کو پڑھاتے بھی رہے، اور مسلم مہاجر طلباء کی تعلیم کی خاطر آپ نے بڑی بڑی قربانیاں دیں، اور تبلیغ وتلقین کے ذریعے مہاجرین کے مابین اشاعت دین کا فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

ادھر وائسرائے ہند کی جانب سے رنگپور کے چیف ریفوجی اڈمنسٹریٹر کے پاس تار آیا تھا کہ ہفتہ کے اندر مسٹر بنرجی نامی ایک آدمی مہاجرین کی انکوائری کے سلسلے میں طیارے کے ذریعے شو برنگر (رنگپور) پہنچنے والا ہے، جو مہاجرین کے سرکردہ لوگوں سے گفتگو کرے گا، اور ہدایت یہ دی گئی تھی کہ وہاں عام لوگوں کا کوئی ہجوم نہ ہونے پائے۔

چنانچہ ۲۵ /جنوری/ ۱۹۴۵ء میں مسٹر بنرجی مہاجرین کے کیمپ میں آیا، وہاں بنرجی صاحب نے مہاجرین کے جن چند سرکردہ لوگوں سے گفتگو کی ان میں مولانا محمد صاحب پنکھاوی بھی تھے، یاد رہے

کہ مہاجرین کے ایک وفد نے جس میں مولانا میں شامل تھے، مسٹر بنرجی سے گفتگو کی، وفد سے حالات دریافت کئے گئے تو کہا گیا کہ ہم قسما محفوظ حالات میں تو ہیں، لیکن پنجرے میں ہیں، مسٹر بنرجی نے اس وفد سے تفصیلات پوچھیں تو مولانا نے تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا کہ:

> "ادھر جن لوگوں نے ۱۹۴۲ء کے قومی فساد کے دوران ارکان کے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا، ہمیں ہجرت کرنے پر مجبور کیا، ان کا ایک سرکردہ آدمی مسٹر اوٹن کو آج کل ہماری انکوائری کے لئے یہاں پہنچایا گیا ہے، بھلا وہ ہمارے مفاد میں رپورٹ کیوں پیش کرے گا؟ واقعہ یہ ہے کہ اس نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس پر ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہے، اگر اس کی رپورٹ صحیح ہے تو فرمایئے کہ ساڑھے چوبیس ہزار لوگوں کے ہندوستان میں مکانات کہاں ہیں؟ ساڑھے چوبیس ہزار کے نہیں بلکہ صرف ہمارے پانچ سو افراد کے مکانات ہندوستان کے اندر دکھانے کو کہا جائے تو سہی"۔

بعد ازاں مسٹر بنرجی کیمپ کے اندر آکر حالات کا مفصل جائزہ لیا، چنانچہ واپسی کے وقت انہوں نے بتایا کہ آپ حضرات مطمئن رہیں، آپ لوگوں کی باتیں رائگاں نہیں جائیں گی۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین اور واعظ انسان تھے، آپ نے اپنی پوری زندگی علم دین کی اشاعت اور لوگوں کی ہدایت وخدمات کے لئے وقف کررکھی تھی، ہجرت کی زندگی سے واپسی کے بعد مولانا محمد پنکھاوی صاحب اپنے علاقے میں جانے کے بجائے بوسیدنگ کے علاقے میں رہائش پذیر ہو گئے، یہاں بھی آپ نے اپنے سابقہ مشغلہ کو مسلسل جاری رکھا، آخر کار جنوبی بوسیدنگ کی معروف درس گاہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں عرصۂ دراز تک علم دین کی خدمات سرانجام دیتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ع:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

حضرت مولانا محمد صالح صاحب فرینڈنگی/ یونگ چنگی

حضرت مولانا محمد صالح صاحب کی جائے پیدائش فرندنگ/فرینڈنگ علاقۂ راسیدنگ ہے، آپ کے جد ثانی الحاج سردار فتح علی صاحب کو قصبۂ فرندنگ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، انہوں نے سترہویں صدی کے اواخر میں منگڈو ٹاؤن کے جنوبی علاقے میں واقع اودنگ سے جا کر اس فرندنگ بستی کی بنیاد ڈالی تھی، یہ قصبہ بڑے مردم خیز ہے، چنانچہ مولانا کا ایک شعر اس قصبہ کے متعلق ملاحظہ فرمائیے کہ:

فرینڈنگ ہمارا علم کا چمن ہے	مجھے اس کا بدلہ گوارہ نہ ہوگا
فرینڈنگ پر میرا دل و جان فدا ہیں	یہ صالح فرینڈنگ سے کھو یا نہ ہوگا
نجوم الہدی اس قدر تو جنی ہے	کسی نے کسی کو سنایا نہ ہو گا
اگر چہ ابھی صالح تجھ میں نہیں ہے	مگر دل سے تجھ کو وہ چھوڑا نہ ہوگا

آپ کے والد ماجد جناب شونا علی صاحب اگر چہ باضابطہ عالم دین نہیں تھے، مگر علمائے کرام سے گہرا تعلق رکھتے تھے، نہایت حق شناس، خدا ترس، عابد اور متقی انسان تھے، شونا علی صاحب مولانا عبید اللہ صاحب سندی فرانگی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے تھے، حضرت مولانا مفتی عبد اللہ صاحب فاضل دار العلوم کراچی فرماتے ہیں کہ:

> ”میں نے حضرت مولانا صالح صاحب مرحوم کے والد صاحب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، بہت نیک سیرت اور قدرے دراز قد بزرگ تھے، ان کا وضع وقطع بالکل شریعت کے مطابق تھا، اور خاندان میں بڑے باوقار اور قابل رشک صفات کے حامل بزرگ تھے“۔(۱)

حضرت مولانا کے دادا کا نام تراب علی تھا، اور بڑے دادا فتح علی صاحب باثروت آدمی تھے، روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے سخی اور مہمان نواز انسان تھے، فرندنگ میں آپ نے ایک مسجد اور ایک تالاب بنوایا تھا۔

مولانا کی والدہ شمع رخ بی بی بنت میاں جی انور میاں کیتاربیلی بڑی نیک سیرت سیدھی سادی خاتون تھی،

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص: ۴۲۔

خاندان کے چھوٹے بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتی تھی، بڑی عابدہ اور ذاکرہ خاتون تھی۔

حضرت مولانا محمد صالح صاحب کی ولادت ۱۵ / جولائی/ ۱۹۲۰ء میں مذکورہ قصبہ فرندنگ میں ہوئی تھی، آپ کا بچپن والدین کی کڑی نگرانی میں گزرا، ماحول چونکہ دیندار گھرانے کا تھا، ویسے دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود اور فضول باتوں اور کاموں میں آپ کا بچپن نہیں گزرا۔

مولانا کو تقریبا پانچ سال کی عمر میں محلہ کے مدرسہ فرقانیہ میں ناظرۂ قرآن کریم کے لئے مولوی علی احمد کے سپرد کر دیا گیا، چند دن جاتے نہ جاتے آپ اپنے ہم سبق طلباء پر فوقیت لے گئے، مولوی علی احمد صاحب نے آپ پر خصوصی توجہ دی، یوں مولوی صاحب کے بابرکت ہاتھ میں آپ کو دینیات کی ابتدائی چیزیں حاصل ہوگئی تھیں۔

مولانا نے اسی فرقانیہ میں ناظرۂ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی چند کتابیں پڑھیں، پھر فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ قاسم العلوم فرندنگ میں داخل ہوئے، داخلہ امتحان مولانا عزیز الرحمن صاحب تنگ بازاری جو اس مدرسہ کے مدرس تھے نے لیا، مولانا داخل ہو گئے، مولانا موصوف آپ کی ذہانت پر بڑے خوش ہوئے اور مطلوبہ نمبرات سے کچھ زیادہ نمبر دے کر مدرسہ میں داخل کر لیا، اس مدرسہ میں آپ نے جن اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سعید احمد صاحب راموی۔

(۲) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب فرندنگی۔

(۳) حضرت مولانا محمود صاحب چنگانوی۔

(۴) حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب تنگ بازاری۔

مولانا اس مدرسہ قاسم العلوم میں مسلسل تین سال پڑھے، تمام اساتذۂ کرام کے منظور نظر رہے، بعد میں قاسم العلوم کے سارے اساتذہ سے اجازت لے کر مدرسہ شرف المدارس راجار بیل چلے گئے، یہاں آپ نے نحو وصرف، منطق وفلسفہ، فقہ واصول اور ادب عربی کی کتابیں باکمال اساتذۂ کرام سے نہایت جد وجہد اور انہماک سے پڑھیں، یہاں آپ نے خاص طور پر حضرت مولانا محمد سکندر صاحب فوئما لوی سے استفادہ کیا، ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت مولانا نور احمد صاحب سے بھی بہت خوب استفادہ کیا تھا، پھر آپ کے بعض اساتذۂ کرام کے اصرار پر آپ مدرسہ قاسم العلوم فرندنگ چلے آئے، اور یہاں کے پہلے والے اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا تھا،

یہاں آپ کے شرکائے اسباق درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا محمد صدیق صاحب فرنگی۔

(۲) مولانا عبدالحق صاحب فرنگی۔

(۳) مولانا اسماعیل صاحب جوئی فرانگی۔

(۴) مولانا نورالحسن صاحب چنگانوی۔

ابھی آپ کی عمر پندرہ سال تھی، آپ نے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان جانے کا عزم کیا، یوں آپ اپنے دیرینہ ساتھی مولانا محمد صدیق فرنگی اور مولانا عبدالحق فرنگی کے ہم راہ ہندوستان چلے گئے، اور ۱۸/مئی/ ۱۹۳۶ء کو دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے تھے، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور انتہائی شوق و ذوق کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہو گئے، دارالعلوم میں آپ کے اساتذۂ کرام کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ۔

(۲) حضرت مولانا بدرالعالم صاحبؒ۔

(۳) حضرت مولانا ریاض الدین صاحبؒ۔

(۴) حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ۔

ابھی دارالعلوم میں آپ کے چھ مہینے ہوئے کہ اچانک آپ کی طبیعت خراب ہوگئی، یہاں کے آب وہوا آپ کے لئے ناموافق ثابت ہوئے تو آپ نے اپنے محسن اساتذہ سے مشورہ کیا، چنانچہ ان کے مشورے اور اجازت سے مدرسہ اسلامیہ عربیہ امروہہ چلے گئے، چنانچہ مدرسہ امروہہ میں آپ کا داخلہ ہوگیا، یہاں آپ کی پڑھائی کے حوالے سے مولانا محمد طیب صاحب (صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد صالح صاحب) رقم طراز ہیں کہ:

> ''چنانچہ آپ کا داخلہ حسب قوانین دارالعلوم ..... بحسن وخوبی ہو گیا، ساتھ ساتھ خورد ونوش کا بھی پورا انتظام بآسانی پورا ہو گیا، اور نہایت ذوق وشوق سے یکسوئی کے ساتھ حصول علم میں مشغول ہو گئے، آپ نے اپنے روزمرہ کے کاموں کے لئے ایک نظام الاوقات یعنی ٹائم ٹیبل بنایا، اس کے مطابق خواندہ اسباق کے مطالعہ و تکرار اور اگلے اسباق کی تیاری میں ایسے منہمک ہوئے کہ کبھی کبھی خورد ونوش کے

> اوقات بھی بھول جاتے، اور ہر سال اپنے شرکائے اسباق پر تفوق حاصل کرتے رہے، اس طرح تھوڑی ہی مدت میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ کے تمام اساتذۂ کرام کے منظور نظر بن گئے''۔(۱)

یہاں آپ نے خاص طور پر حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب امروہی سے استفادہ کیا تھا، حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب کی روایت کے مطابق یہاں آپ نے صدرا، شمس بازغہ، بحرالعلوم، ملاحسن، قاضی مبارک، میبذی، شرح چغمنی، تصریح الافلاک، اقلیدس، میرزاہد، توضیح تلویح، حمداللہ اور شرح نخبۃ الفکر وغیرہ کی پڑھائی سے فارغ ہوکر ہدایہ آخرین، جلالین شریف، بیضاوی شریف کی تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں وہاں کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ رضا حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن سے آپ نے صحیح بخاری شریف پڑھی، ان کے علاوہ حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب امروہی سے صحیح مسلم شریف پڑھی تھی، غرض آپ نے یہاں آٹھ سال تک تعلیم حاصل کی اور علوم وفنون میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، امروہہ میں مذکورہ دونوں اساتذۂ کرام کے علاوہ بھی درج ذیل حضرات سے آپ نے پورا پورا استفادہ کیا تھا:

(۱) شیخ التفسیر حضرت مولانا انوارالحق صاحبؒ۔

(۲) شیخ الادب حضرت مولانا اعجاز حسن صاحبؒ۔

(۳) حضرت مولانا فضل احمد صاحبؒ۔

مدرسہ امروہہ میں ارکان کے دو طالب علم اور بعد میں جلیل القدر دو عالم آپ کے ہم جھولی تھے، ان میں سے ایک حضرت مولانا جلال الدین بن مولانا عبدالجبار شہید اور دوسرے حضرت مولانا عبد المعبود نافیتارڈیلوی ثم مہاجر مکی، چنانچہ مولانا عبدالمعبود صاحب فرمایا کرتے تھے کہ:

> ''ہم جتنے ارکانی بری طلباء مولانا محمد صالح فرنگی کے ساتھ مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں زیر تعلیم تھے، اکثر وبیشتر نے مولانا موصوف سے کم وبیش علمی استفادہ کیا، وہ بری طلباء تنظیم کے صدر اور نگران اعلی تھے، دنیز ۱۹۴۰ء و ۱۹۴۱ء کے لگ بھگ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور و مدرسہ اسلامیہ امروہہ وغیرہ میں کوئی بھی

---

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص: ۲۷۔

برمی طالب علم مولانا صالح صاحب جیسا جید الطبع، ذکی الفہم اور ذہین وفطین نہیں گزرے، اور وہ ہر فن میں ماہر تھے، ان کی علمی استعداد وافہام وتفہیم کی صلاحیت مثالی تھی، جس کو قدرت کا خاص عطیہ بھی کہا جاسکتا ہے''۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ نے ۱۹۴۲ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کرلی تھی، ظاہر ہے کہ اسی زمانے میں ارکان میں قومی فسادات جاری تھے، چوں کہ اس نازک حالات میں آپ کے لئے ارکان سے اخراجات بھیجنا ناممکن تھا، اس لئے اس دوران آپ بڑے پریشان تھے، لہذا فراغت تعلیم کے بعد بھی آپ کو زادسفر کے لئے ایک پریشانی کے عالم میں انتظار کرنا پڑا تھا، حتی کہ اس مسلسل پریشانی اور تہی دستی کے مارے بیمار پڑ گئے تھے، بیماری کے معالجہ کے لئے آپ کو امروہہ سے دہلی جانا پڑا تھا، جہاں مدرسہ امینیہ کے ایک طالب علم اور مولانا کے دوست مولانا تمیز اللہ صاحب سینڈنگی (سابق مہتمم مدرسہ ممتاز العلوم سینڈنگ) نے آپ کی بہت خدمت کی، جن کا شکریہ حضرت مولانا ہمیشہ کرتے رہے تھے۔

۱۹۴۳ء کے اوائل میں اخراجات کا بندوبست ہوا تو آپ ارکان کے لئے روانہ ہوگئے، اور حضرت مولانا علیم اللہ والد محترم جناب امان اللہ الصائغ کے ہم راہ اودنگ آپہنچے، یاد رہے کہ ۱۹۴۲ء کے واقعہ کربلا میں آپ کے افراد خاندان فرندنگ سے اودنگ آکے پناہ لئے ہوئے تھے، یہاں پہنچے تو والدین سمیت خاندان کے دیگر افراد سے آپ کی ملاقات ہوگئی تھی۔

اودنگ میں آپ نے چند مہینے قیام فرمایا، اور حالات قدرے پرسکون ہوا تو آپ نے افراد خاندان سمیت یونگ چنگ (بوسیدنگ) چلے آئے، یہاں آپ کے نانہال کے لوگ تھے، یہاں حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب کی کوشش سے آپ کا نکاح الحاج عبدالعزیز صاحب یونگ چنگی کی صاحبزادی جنابہ مریم خاتون سے ہوگیا، دراں حالیکہ عبدالعزیز صاحب اپنے افراد خاندان سمیت موئی دنگ سے منتقل ہوکے یونگ چنگ ٹھہرے ہوئے تھے۔

اسی سال آپ نے ایک جہادی قافلہ کی قیادت اور رہنمائی بھی کی، چنانچہ اس حوالے سے مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضرت ناظم صاحب (مولانا ممدوح) فرماتے ہیں کہ ایک دن اس نفسا نفسی کے عالم میں حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب نے مجھے اور اپنے صاحب زادہ مولوی محمد صدیق یونگ چنگی کو بلاکر جنوبی راسیدنگ کے علاقے میں مسلمانوں پر ہونے

والے ظلم وستم کے متعلق کچھ واقعات سنائے، اور وہاں جاکر کافروں سے دفاعی جنگ لڑنے کی تشجیع اور ترغیب دلائی، کہنے لگے کہ آپ دونوں بھی بستی کے دیگر نوجوانوں کے ساتھ جہاد کے لئے جائیں، ہوسکے تو تیاری کریں، کیوں کہ راسیدنگ کی جنوبی سمت میں جہاں بدھسٹوں کی اکثریت ہے، مسلمانوں پر (وہاں) بہت ظلم وستم ہورہا ہے، لہذا کفار سے جہاد ضروری ہوگیا ہے، اور جہاد سے روگردانی کرنے پر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا، چنانچہ ہم دونوں بھی دیگر نوجوانوں کی طرح تیار ہوکر کاروانِ جہاد کے ساتھ روانہ ہوئے، ہم میں سے کسی مجاہد کے پاس تلواریں، کسی کے پاس خنجریں، اور کسی کے ساتھ چھرے وغیرے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین کی تعداد ہزار سے زیادہ ہوگئی، ہم نماز فجر کے بعد نعرۂ تکبیر کے ساتھ جہاد کا جذبہ لے کر یونگ چنگ سے جنوب کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں جو بھی مسلمان نوجوان مل جاتا، ہمارے ساتھ ضم ہوجاتا، اس طرح جذبۂ جہاد لے کر کدیک چنگ پہنچنے پر رات ہوگئی۔

ہم اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل مگر
لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ادھر جب مسلمان مجاہدین کی آمد کی خبر کافروں نے سنی، تو بستیاں چھوڑ کر سب بھاگ نکلے، اور اطراف کی بڈھسٹ بستیوں میں جاکر پناہ لئے، دوسرے دن صبح سورج نکلنے پر ہمارے دلیر مسلمان مجاہدین جہاد کے جذبہ لے کر نعرۂ تکبیر کے ساتھ کافروں کی بستیوں میں داخل ہوگئے، مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا، یک دم سناٹا چھایا ہوا تھا، ہمارے لاکھ منع کرنے پر بھی بعض نوجوانوں نے کافروں کے گھروں سے مختلف سامان خاص کر کے روز مرہ کے استعمال کی چیزیں لینے لگیں، کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم بغیر جہاد کے واپس ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نام لیواؤں اور توحید کے پرستاروں کی لاج رکھی''۔(۱)

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۸۹-۱۹۱۔

اس کے بعد آپ نے عارضی طور پر کپڑے کی تجارت شروع کر دی، ٹیکناف وغیرہ سے آپ کپڑے لا کر فروخت کرنے لگے تھے، جب کچھ عرصے کے بعد ملک کے حالات معمول پر آ گئے تو آپ نے یونگ چنگ سے چا کمو افارہ (موئی دنگ) جا کر مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا، یوں آپ کے ساتھ آپ کے خاندان کے دیگر افراد نے بھی اپنے آبائی گاؤں فرندنگ کے بجائے اب کی بار چا کموا فارہ موئی دنگ میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی، انہوں نے اس نو آباد بستی کے بیچ میں ایک مسجد تعمیر کی، جس میں آپ امام اور خطیب کی حیثیت سے مقرر ہو گئے، پھر آپ کے کہنے پر بستی والوں نے مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس میں آپ نے تعلیم دینا شروع کر دیا، چنانچہ قلیل مدت میں اس مدرسہ کی شہرت ہو گئی تو اطراف سے طلبہ جمع ہونے لگے تھے، اور دیکھتے ہی دیکھتے طالب علموں کا ایک جم غفیر یہاں جمع ہو گیا تھا، آپ سے اس مدرسہ میں مستفید ہونے والے طلباء میں:

مولانا محمد طیب ولد عبدالحکیم عرف ابوطالب۔

مولانا محمد حسین کیتار بیلوی۔

مولانا مقبول احمد صاحب موئی دنگی۔

مولانا رشید احمد صاحب موئی دنگی۔

قابل ذکر ہیں۔ بعد میں یہ مدرسہ موئی دنگ میں منتقل کیا گیا، یاد رہے کہ اس مدرسہ میں آپ کے ساتھ میانجی فقیر چاند صاحب المتوفی ۱۹۶۸ء پڑھایا کرتے تھے، اور اس مدرسہ کا نام محی العلوم رکھا گیا تھا۔

ایک ہنگامی حالت میں یہ مدرسہ تو موئی دنگ میں تعمیر کیا گیا تھا، مگر حضرت مولانا کے دل کو ایک وسیع اور پرسکون جگہ کی تلاش تھی، جہاں یہ دینی درس گاہ مستقل طور پر قائم کی جاسکے، بعد میں آپ نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر یہ نکلی کہ یونگ چنگ میں اس مدرسہ کو منتقل کیا جائے، چنانچہ آپ یونگ چنگ گئے، وہاں کی جامع مسجد میں خطبہ دیا، اور دو گھنٹے تک تقریر بھی کی، جس کے بعد یہ تجویز رکھی گئی کہ مدرسہ محی العلوم کو یونگ چنگ میں منتقل کر لیا جائے، تب سارے حاضرین نے تعاون کی امید دلائی، یوں بستی والوں اور اس بستی کے نامور زمیندار ہڈمن جناب عبدالحمید میاں کی مخلصانہ کوشش سے یونگ چنگ کے بالکل درمیانی حصے میں ایک دینی درسگاہ قائم کرنا طے پا گیا، ہڈمن صاحب نے مدرسہ کے لئے ایک قطعۂ زمین وقف کر دیا تھا، یوں مدرسہ کی بنیاد پڑ گئی تھی، قصبۂ یونگ چنگ ایک دینی ادارہ کے لئے نہایت موزون اور برمحل جگہ ہے، اللہ تعالی کی رحمت سے دیکھتے ہی دیکھتے اس مدرسہ نے ایک

خاص دینی درسگاہ کی شکل اختیار کر لی۔

مولانا ممدوح تین سال تک یہاں بڑے انہاک کے ساتھ مدرسہ کی صدارت، نظامت اور افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے، مگر ۱۹۵۱ء کے تعلیمی سال کے دوران جب آپ کو یہ پتہ چلا کہ بعض مدرسین مدرسہ انتظامیہ کے بعض افراد سے مل کر آپ کو مدرسہ سے نکال باہر کرنے کی سازش کر رہے ہیں، اب آپ کا دل اچاٹ ہو گیا، اور مدرسہ سے نکل جانے کا ارادہ فرمایا لیا، چنانچہ ۱۹۵۱ء کے تعلیمی سال کو اختتام تک پہنچا کر آپ نے اپنی نظامت کے عہدہ سے مستعفی ہو کے کوئی گلاہ شکوہ کئے بغیر مدرسہ سے علیحدگی اختیار کر لی، پھر شمالی موئی دنگ والی جامع مسجد کے قریب جا کر اقامت پذیر ہو گئے، لیکن آپ کے ساتھ مدرسہ کے طلبہ کی ایک بھاری اکثریت وہاں جمع ہو گئی تھی۔

یوں تو موئی دنگ والی اس مسجد سے متصل آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا، مگر دل ہی دل میں ایک اور مناسب جگہ کی تلاش بھی شروع کر دی تھی، بالآخر آپ کی نظر زنخامہ پر پڑی، یہاں عامتہ الناس کے ساتھ ساتھ الحاج عبداللطیف صاحب اور الحاج ولی بخش صاحب نے ایک مدرسہ کی تاسیس کی تجویز رکھی تو سب نے خوشی خوشی سے منظور کر لی، یوں مدرسہ کی بنیاد پڑی تو آپ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں اپنے تمام تلامذہ سمیت زنخامہ منتقل ہو گئے، اب کی بار اس مدرسہ کا نام روح العلوم رکھا گیا تھا۔

مولانا کی حسن تدبیر سے مدرسہ روح العلوم میں تعلیمی اعتبار سے جان آ گئی تھی، طلباء دور دراز سے حصول علم کی تمنا لئے جوق در جوق آنے لگے تھے، یوں حضرت مولانا کی شخصیت ابھرنے لگی، ہر کجا آپ کی پذیرائی شروع ہو گئی تھی، ۱۹۵۴ء کے وسط میں روح العلوم کا سالانہ اجلاس بڑی دھوم سے منعقد ہوا تھا، جس میں علاقے کے دینی اور عصری دانشوران حاضر ہوئے تھے، اس جلسہ کے اختتام پر یونگ چنگ اور کیتاربیل کے حاضرین نے آپ سے گزارش کی کہ ہم آپ کو دوبارہ لے جانے آئے ہیں، جو درسگاہ آپ نے یونگ چنگ میں تاسیس کی، یہ آپ کے جانے کے بعد ویران ہو گئی ہے، ہم آپ کی امانت آپ کو دوبارہ سپرد کرنا چاہتے ہیں، جواب میں آپ نے فرمایا کہ ہم علاقے کے ارباب بست و کشاد سے مشورہ کر کے فیصلہ کریں گے کہ آیا ہمیں یہاں رہنا اچھا ہے یا یونگ چنگ دوبارہ لوٹ کر جانا سزاوار۔

بعد میں تمام حضرات نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا یونگ چنگ تشریف لے جائیں، سب حضرات کے متفقہ فیصلہ کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اگر آپ حضرات کا یہی فیصلہ ہے تو مجھے کوئی

اعتراض نہیں، شاید اسی میں ملک وقوم کی بھلائی ہے، اس حوالے سے محترم مولانا محمد طیب صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''بالآخر اللہ تعالی نے آپ کے دل میں یہی بات ڈال دی کہ مقصد تو دین وملت کی خدمت ہے، خواہ انسان جہاں کہیں بھی ہو، اور بستی زنخامہ یونگ چنگ کے مقابلے میں چھوٹی سی بستی ہے، جب کہ یونگ چنگ ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے، یہاں دین کی خدمت جتنی آسانی اور زیادہ مقدار میں ہوسکتی ہے، دوسری بستی میں نہیں ہوسکتی ،اور دوسرے قصبات اور بستیوں کے طلباء یہاں آرام سے پڑھ سکتے ہیں، اور رہ بھی سکتے، اس طرح کے دیگر مصالح دینیہ ودنیویہ کی وجہ سے حضرت والا نے یونگ چنگ دوبارہ آنے کو ترجیح دی''۔(۱)

مذکورہ جلسہ کے اختتام پر آپ نے تمام مدرسین اور مدرسہ روح العلوم کے ممبران مجلس شوری کو بلایا، اور نصیحت آموز تقریر کی، اس کے بعد یونگ چنگ چلے گئے۔

۱۹۵۴ء کے آغاز میں قصبۂ یونگ چنگ کے سرکردہ حضرات نے آپ کے استقبالیہ کے لئے شاندار اجلاس کیا، اور مدرسہ محی العلوم کے نگران اعلی جناب ہڈمن عبدالحمید میاں رواسوگری نے حضرت مولانا کو مدرسے کے دائمی سرپرست اور مشرف اعلی ہونے کا اعلان کیا، عبدالحمید صاحب نے مزید کہا کہ:

''اس دینی اور مذہبی ادارہ کے موسس اور بانی مولانا محمد صالح صاحب ہیں، اور ہم اس کے رکھوالے ہیں، آپ اپنی امانت کو بحسن وخوبی سنبھالیں، آج سے مدرسہ کے بیرونی اور اندرونی مسائل میں دخل اندازی کی اجازت کسی کو نہیں ہوگی، آپ اپنے کام کو اطمینان سے اپنی صوابدید کے مطابق جاری رکھیں، اور ہم ہمہ وقت دامے درمے، قدمے سخنے آپ کے ساتھ ہیں''۔(۲)

مدرسہ محی العلوم کی ذمے داری دوبارہ سنبھالنے کے بعد آپ نے یہاں کی اصلاح کی، آپ کے اس اصلاحی اقدام کی وجہ سے بعض مدرسین خودبخود مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے، اور جانے والے مدرسین کی خالی

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۲۰۔

(۲) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۲۵۔

جگہوں کو پورے کرنے لئے آپ نے چند مستعد و باصلاحیت اساتذہ مقرر کئے، جن میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب بوسیدنگی، حضرت مولانا قاری ابوالفضل صاحب زنخاموی اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب فوئماںوی قابل ذکر ہیں، جوں جوں دن گزرتے گئے مدرسہ میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ترقیاں بھی ہوتی گئیں، آئے دن مستعد اور باصلاحیت اساتذہ مزید تعین ہوتے رہے تو حضرت مولانا اور مستعد اساتذہ کی کوششوں اور رحمت ایزدی کے نتیجے میں مدرسہ محی العلوم کی شہرت ملک کے طول وعرض میں پھیلتی گئی، اور چند سال گزرتے نہ گزرتے مدرسۂ یونگ چنگ نے ایک خاص دینی درسگاہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

۱۹۶۳ء میں برمی حکومت نے قصبۂ کیاندنگ (زادی فرانگ) کو ٹاؤن شپ کا درجہ دیا، پھر ۱۹۶۵ء میں زادی فرانگ کے مجسٹریٹ نے علاقے کے علمائے کرام کو یہ عندیہ دیا تھا کہ اس علاقے میں ایک جمعیۃ کی تشکیل ہو، علمائے اسلام پر مشتمل وہ جمعیۃ اسلامی امور کے فیصلے کرے گی، تا کہ علاقے کے مسلمانوں پر تمام دینی مسائل اس جمعیۃ کے تحت حل ہوسکیں، چنانچہ اپریل/ ۱۹۶۵ء میں شوافرانگ میں علماء کا ایک شاندار اجلاس ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا محمد صالح صاحب نے کی، اس اجلاس میں علمائے کرام نے چند گھنٹے تک مشورہ کیا، اور آخر میں ایک کمیٹی ''جمعیت علماء'' کے نام سے تشکیل ہوئی تھی، جس کے صدر حضرت ممدوح اور نگران اعلی حضرت مولانا فیض احمد صاحب بربیلوی صاحب مقرر ہوئے، اس اجلاس میں شرکت کرنے والے دیگر قابل ذکر علماء کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب فرندنگی۔

حضرت مولانا عبدالودود صاحب راجاربیلوی۔

حضرت مولانا نور احمد صاحب سامیلوی۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب جوئی فرانگی۔

حضرت مولانا اظہار میاں صاحب چنگانوی۔

حضرت مولانا علی احمد صاحب نیلمبر کاٹوی۔

حضرت مولانا قاضی محمد عمر صاحب موئی دنگی۔

حضرت مولانا احمد صاحب فرندنگی۔

حضرت مولانا محمد ہارن صاحب کواچنگی۔

حضرت مولانا علی احمد صاحب سوفرانگی۔

حضرت مولانا نورالحسن صاحب چنگانوی۔

اس کمیٹی کے حوالے سے بعد میں ہونے والی سرگرمیوں کے متعلق مولانا محمد طیب صاحب کی تحریر میں ملاحظہ کیا جائے، آپ لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت ناظم صاحب نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور انتہائی جدوجہد سے اس کمیٹی کو مختصر مدت میں بہت کامیابی دلائی، چنانچہ آپ نے اس مہم کو اپنی تمام تر دلچسپیوں کا محور بنالیا، اور دیگر علمائے کرام کی معیت میں جوش وخروش کے ساتھ اس عظیم کارنامہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن کچھ شر پسند اور اقتدار کے لالچی عناصر کی کرتوت سے آپ کی حوصلہ شکنی ہوئی، اور آپ عہدۂ صدارت سے مستعفی ہوگئے‘‘۔(۱)

۱۹۵۲ء میں مجاہد پارٹی (جس کی قیادت محمد قاسم بن عطاء الدین راجا کررہے تھے) کی طرف سے یونگ چنگ والوں سے مجاہدین کے لئے چندے کی فرمائش کردی گئی، اور مطلوبہ چندے کی رقوم بھی بھاری تھی، اب اہل یونگ چنگ نے حضرت کے پاس آکے کہا کہ آپ قاسم صاحب کے پاس تشریف لے جائیں اور ہمارے چندے کی رقوم میں خفیف کرادیں، تب حضرت مولانا قاسم کے پاس گئے، اس حوالے سے بعد کے واقعہ حضرت کی زبانی ملاحظہ کیجئے کہ:

’’میں باغی قاسم صاحب کے پاس جانے کے لئے بمشکل راضی ہوا، میں نے وہاں جانے کی تیاری میں ایک شاندار تعریفی نظم ان کی شان میں ترتیب دی، جس میں قاسم صاحب اور ان کے حواریین کی کارکردگی کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا، مکمل تیاری کرنے کے بعد عزیزم مولوی محمد طیب عرف ابو طالب اور عزیزم مولوی ولایت حسین سلمہما اللہ دونوں اس وقت زیر تعلیم تھے کو ہم راہ لے کر پہاڑی راستہ درہ کو طے کرتے ہوئے قاسم صاحب کے ہڈکواٹر تک جا پہنچا، قاسم صاحب نے خوب خاطر تواضع کی، اور تشریف لانے کا مقصد پوچھا، میں نے ایک ظالم حکمران

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۹۰۔

کے سامنے جس طرح آمد کا مقصد بیان کرنا تھا، بیان کیا، اور مرتب شدہ نظم پیش کی، مسلسل دوڈھائی گھنٹے تبادلۂ خیالات کے بعد کہنے لگا کہ آج سے آپ ہمارے ساتھ جہاد کے لئے رہ جائیں، ہمیں آپ جیسی شخصیت کی اشد ضرورت ہے، میں نے ان سے کہا کہ جناب میرے دو بوڑھے والدین ہیں اور ایک دینی ادارہ بھی، جس میں حدیث و تفسیر کی تعلیم چند باصلاحیت علمائے کرام کے اشراف میں ہوتی ہے، ان کی خدمت میرے بغیر نہیں ہوسکتی، لیکن وہ ظالم کسی طرح سے بھی ماننے کو تیار نہیں، وہ اپنی خواہش پر مصر تھا اور کہنے لگا کہ آج سے ان تمام چیزوں کی ذمے داری میری ہے، اب میں ان کے سامنے مجبور ہوگیا، تخفیف چندے کی بات تو کجا مجھے ان کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا، القصہ مختصر آخر حکمت عملی کے ساتھ کچھ دن فرصت لے کر واپس آگیا، اور حسب معمول تعلیم وتدریس میں مشغول رہنے لگا، لیکن اچانک ایک مہینے کے بعد ان کی ان طرف سے نوٹس آیا، اور فوراً حاضری کا حکم دیا گیا تھا۔

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

نوٹس ملنے پر میں خوف زدہ ہوگیا تھا، لیکن ہم دردوں اور خیر خواہوں کی حوصلہ افزائی سے اطمینان ہوکر کچھ دن کے لئے یونگ چنگ سے سامیلہ روپوش ہوگیا، مگر کرنا کیا تھا، آخر ایک دن اس ظالم کے پاس ضرور جانا ہے، لہذا غالبا دس دن کے بعد بطور ہدیہ ایک آہو کے گلے میں مدحیہ اشعار کا ایک مجموعہ تعلیق کرکے اس ظالم کے دربار میں کچھ معتبر لوگوں کے ساتھ حاضر ہوا، قاسم میاں آہو دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور ہنس کر بولنے لگا کہ میں تو حضرت مولانا صالح صاحب کو امتحان کررہا تھا، آخر علمائے کرام جہاد سے کیوں ڈرتے ہیں، خیر آپ جائیں، اپنے وظائف ادا کرتے رہیں، اور ہمارے لئے دعا کریں، چنانچہ اس سال نام نہاد قاسم صاحب اور ان کے حواریوں نے اہالیان یونگ چنگ کے خلاف احتجاج کرکے پوری بستی کو جلاکر راکھ کردیا‘‘۔(۱)

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۹۵۔۱۹۷۔

۱۹۵۷ء میں آپ پر دماغی مرض کا حملہ ہوا، اور مشرقی پاکستان جا کے ہومیوپیتک کا علاج کروایا تو شفا یاب ہو گئے تھے، لیکن ۱۹۷۳ء میں آپ پر دوبارہ حملہ ہوا تو پھر آپ چاٹگام پہنچے، اور علاج کیا تو شفایاب ہو گئے تھے۔

۱۹۷۳ء میں آپ کا بھتیجا معروف عالم دین حضرت مولانا دین محمد شہید فرنگی کو شہید کر دیا گیا تو آپ کا دل اچاٹ ہو گیا، اور وطن عزیز کو خیر باد کہہ دینے کا عزم مصمم کر لیا، یوں نومبر/ ۱۹۷۷ء میں وطن چھوڑے پاکستان کی راہ لی اور بنگلا دیش کی راہ پاکستان پہنچنے کے لئے ڈھاکہ پہنچے، اور ۱۵/ جنوری/ ۱۹۷۸ء میں ہوئی جہاز کے ذریعے کراچی پہنچ گئے تھے۔

کراچی میں آپ کا قیام موسی کالونی میں ہوا، آپ پہنچے ابھی دو تین مہینے بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ مدرسہ والوں نے آپ کو پھر سے مدرسی میں اتار لانے کی پیش کش پر پیش کش کرنا شروع کر دیا تھا، بالآخر جون/ ۱۹۷۸ء میں مدرسہ انصاریہ برمی کالونی میں بحیثیت مدرس اور امام وخطیب مقرر ہو گئے، یہاں کی مسجد میں جمعہ کے روز آپ خطاب فرمایا کرتے تھے، اور یہاں کا کونسلر حضرت مولانا عبد القدوس صاحب نے آپ کو اس علاقہ کا مفتی مقرر کر دیا تھا۔

۱۹۸۰ء میں آپ نے حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے جہاز کا سفر فرمایا، اور ادائے حج و زیارت کے بعد پھر پاکستان پہنچے، اور مذکورہ مدرسہ کی مدرسی پر لگ گئے تھے۔

پھر ۱۹۸۵ء میں آپ نے کراچی کو خیر باد کہہ دیا، اور سعودی عرب میں مستقل قیام کے لئے حجاز مقدس پہنچ گئے، آپ نے ۱۴۰۵ھ کے حج میں شرکت کی، اور یہاں پہنچنے کے بعد آپ نے دس سال مکہ مکرمہ میں گزارے، یہاں آپ مختلف قومی وملی کاموں میں سرگرم عمل رہے، آپ نے سرزمین مقدس میں اپنی تاسیس کردہ مدرسہ محی العلوم یونگ چنگ کے لئے بہت کچھ کیا، اس مدرسہ کے لئے جلسے کروائے، اور چندے جمع کروا کر مدرسہ کی تعمیر وترقی کی راہ ہموار کی تھی۔

آپ نے اپنی زندگی میں آٹھ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، ہر ایک مرتبہ آپ کی معیت میں علمائے کرام اور معتقدین ومتعلقین کا ایک جم غفیر رہتا تھا، آپ نے یہاں روہنگیا برادری کو اتفاق ویک جہتی کی طرف توجہ دلائی، اس سلسلے میں متعدد اجتماع بھی کروایا تھا، چنانچہ ایک اجتماع کے حوالے سے مولانا محمد طیب صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''الغرض حضرت والا نے اس اجتماع میں علمائے کرام کے اتفاق واتحاد پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم سعودی عرب میں غیر ملکی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم یک جہتی کے ساتھ دینی تعلیم وتربیت اور تبلیغ دین کے کام کرتے رہیں، یہ ایک سنہرا موقع ہے، ہماری برادری پر آل سعود اور اس عظیم حکومت کی بڑی مہربانیاں ہیں، جن علمائے کرام اور مشائخ عظام نے اس اجتماع میں شرکت کی ان میں حضرت مولانا احمد اللہ صاحب رامیور بیلی، مولانا بدیع الزمان صاحب سابق مدرس مدرسہ میانجانپور، مولانا ابوالبشر صاحب خوار بیلی، مولانا قاری سراج الاسلام صاحب کولار بیلی، مولانا وصی الرحمن صاحب کومیر خالوی، مولانا رشید احمد صاحب کو میر خالوی، اور مولانا حسن علی صاحب سالی فرانگی کے علاوہ دوسرے علاقوں کے علمائے کرام بکثرت شریک ہوئے''۔(۱)

اسی طرح آپ نے بعض علمائے کرام کی گزارش پر حارۃ المورکہ مکہ مکرمہ کی مسجد ''مسجد ذکیر'' میں قرآن کریم کے درس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، آپ ہفتے میں پانچ روز قرآن کریم کا درس دیتے تھے، آپ اپنی زندگی میں مسجد نبوی اور حرم مکی میں متعدد بار اعتکاف کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، اللہ کے اس برگزیدہ بندہ نے اپنی پوری زندگی کو ملت وقوم کی خدمات میں وقف رکھ کر بالآخر ۱۹/ آگست/ ۱۹۹۳ء میں بروز جمعرات صبح سات بجے مستشفی نور مکہ المکرمہ میں انتقال فرمایا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ جنت المعلی میں مدفون ہیں۔

آپ کی اولاد میں مولانا قاضی محمد طاہر صاحب بڑے پائے کے عالم دین اور بلند پائے کے شاعر تھے، آپ حضرت مولانا کے انتقال سے پہلے مدینۃ الرسول سے مکے کی طرف آتے ہوئے کار اکسیڈنٹ میں شہید ہو گئے، ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب بھی بڑے عالم اور قابل قدر مصنف ہیں، مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد بزرگوار پر قلم اٹھا کر ہم مسکینوں پر بھاری احسان فرمایا ہے، آپ کی تصنیف بنام ''حیات صالح'' ماشاء اللہ ہماری سوانحی تاریخ میں ایک گرانمایہ اضافہ ہے، اللہ تعالی مولانا محمد طیب صاحب کو مزید توفیق سے نوازے۔

حضرت مولانا صالح صاحب رحمۃ اللہ علیہ جس طرح ایک مفسر قرآن، محدث، ادیب اور خطیب تھے

---

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص: ۲۳۳۔ ۲۳۴۔

،اسی طرح بلند پایہ کے شاعر بھی تھے، حیات صالح میں آپ کی شاعری کی کچھ جھلکیاں دیکھنے میں آئیں،عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں آپ کے کلام دیکھنے میں آئے، ان کلاموں میں سے ایک اردو کا شعر ملاحظہ ہو:

مبارک ہو تمہیں اے اہل خانہ دار دنیا میں		خدا کی خیر و برکت ہو تمہارے کسب دنیا میں
نہ آنے دے مصیبت کو خدا نے باب میں تیرے		نہ دے رنج والم کو بھی تمہارے کار دنیا میں
کرا دے زندگانی کو تمہارے خوش وخرم سے		آرام وعیش دے تم کو ہمیشہ حال دنیا میں
یہاں مضبوط کر کے وہاں میں جب چلو گے تم		نہ ڈالے رحمن نے تم کو وہاں کے نار کبری میں
کرو صدقہ مدارس میں تمہاری اپنی رغبت سے		یہ صدقہ شافع بھی ہوگا تمہارے دار عقبی میں
بہت اچھے مصارف ہیں مدارس اے مسلمانو!		کر و صدقہ مدارس میں تمہاری عمر دنیا میں
یہ صالح کی نظم کو تم پڑھو کے جب تدبر سے		نہ پڑ جاؤ گے خدا کے سامنے تم نار حطمی میں

یاد رہے کہ مولانا پر مرض موت کا حملہ ۱۸ / جولائی/ ۱۹۹۳ء کو ہوا، اس حالت میں اپ کو پہلے مستشفی نور مکہ مکرمہ پھر بعد میں اجیاد نامی ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا، پھر ڈاکٹروں کے مشورے پر مستشفی نور لے جائے گئے، جہاں آپ کا اپریشن ہوا، ڈاکٹروں نے یوں تو بتایا تھا کہ آپریشن کامیاب رہا، مگر اللہ تعالی کو منظور کچھ اور تھا کہ ۱۴ /آگست/ ۱۹۹۳ء بروز جمعرات کو آپ انتقال فرما گئے۔

آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ذیل میں آپ کی تصنیفات کی فہرست درج کر رہا ہوں:

شربت عام قصۂ نذیر وگلفام: فارسی اشعار کا مجموعہ ہے۔

صدائے آخرت: اردو، فارسی اور عربی اشعار کا مجموعہ ہے۔

صفاء السوید علی ابیات کریما۔

درس عبرت: عربی مراثی پر مشتمل یہ تالیف اپنے صاحبزادے حضرت مولانا محمد طاہر کی شہادت پر تحریر کی تھی۔

بکاء العصاۃ: یہ تصنیف مسجد حرم کے پڑوسی بنے تحریر فرمائی تھی۔

نعت النبی: فارسی زبان میں اشعار وابیات پر مشتمل ہے۔

حمد اللہ: عربی زبان میں دعائیہ اشعار کا مجموعہ ہے۔

مولانا کے متعلق حضرت مولانا عبدالمتین ہتالوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت مولانا اجلہ علماء ابوطاہر محمد صالح فرنگی ثم مہاجر مکی ارکان برما کے ان مشاہیر علمائے کرام میں سے ہیں، جنہوں نے ارکان برما کی سرزمین کو قرآن وسنت کے علوم سے سینچا ہے، ان کی علمی دسترس عربی، فارسی اور اردو کے نظم ونثر اور تحریر و تقریر میں شہرہ آفاق ہے‘‘۔(۱)

مولانا مرحوم کے متعلق حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی، خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ رقمطراز ہیں کہ:

’’حضرت مولانا محمد صالح صاحب فرنگی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم وفضل کے لحاظ سے ارکان برما کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے، انہوں نے ارکان برما میں اسلامی تعلیم وتربیت کی نشر واشاعت میں پوری زندگی ختم کردی، مولانا بڑے حوصلے والے، روشن خیال اور بلند اخلاق انسان تھے، انہوں نے دین وملت کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ ہمیشہ زندہ رہے گی‘‘۔(۲)

حضرت مولانا ولایت حسین صاحب آپ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت ناظم صاحب مرحوم میرے نہایت ہی شفیق استاد، خیر خواہ اور مہربان تھے، اور میرے نزدیک علم وعمل کے جامع شخصیت تھے، ایسی شخصیتیں خال خال پیدا ہوا کرتی ہیں، آپ جیسے عالم دین کی موت کو عالم کی موت سے تعبیر کی گئی ہے، جو خلا ایسی ہستیوں سے پیدا ہوتا ہے وہ بہت کم پر ہوتا ہے‘‘۔(۳)

حضرت مولانا حافظ مقبول احمد صاحب سندی فرانگی لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت اپنی تبحر علمی وجودت ذکاوت فطری ونیز قوت حافظہ ودیگر کمالات میں

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۲۸۹۔۲۹۰۔

(۲) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۲۹۵۔

(۳) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۲۹۶۔

یگانہ زمانہ تھے، بہت سارے ہم عصر علمائے کرام ان کے ان کمالات پر رشک میں آ کر غبطہ کرتے تھے، اور بہتیرے معلمین مدرسہ عربیہ عویصات ومغلقات مالا ینحل کوحضرت والا سے حل فرمالیتے تھے، حضرت ممدوح جامع الفنون العقلیہ والنقلیہ تھے، ونیز مادۂ تفہیم وتفہم میں ممتاز وفائق الاقران تھے''۔(۱)

آپ کے متعلق حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب ارکانی مفتی دارالعلوم کورنگی کراچی رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزمان، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے، وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی صفات، بے شمار محاسن اعمال اور بے انتہاء بلند اخلاق وکردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔

دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد (۲)

حضرت مولانا احمد اللہ بن مولانا سراج الحق صاحب رامپور بیلی رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا محمد صالح صاحب کے وجود مسعود تمام اہلیان ارکان کے لئے عموماً اور دیار برما کے لئے خصوصاً شفیق مخلص مربی ومفتی تھے، اور استادکل بھی تھے، ادنی سے اعلی تک ہر بات میں مسائل پر بالیقین عمل کرتے تھے، درس وتدریس میں ماہر اور ہر بات کو نہایت ہی وضاحت کے ساتھ مبرہن ومدلل بیان فرماتے تھے، اور شعروشاعری کے فن سے بھی واقفیت رکھتے تھے، وعظ وپند کو موثرانہ انداز میں بیان فرماتے تھے، اور بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، علم التفسیر میں بھی مہارت رکھتے تھے''۔(۳)

حضرت مولانا عبداللطیف صاحب مہتمم مدرسہ اشاعت اسلام سندی فرانگ رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد صالح صاحب مرحوم ارکان برما کا شماران

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۲۹۰۔
(۲) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۲۹۷۔
(۳) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۳۰۶۔

برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی علم دین کی اشاعت میں گزاری، مولانا موصوف ایک جیدالاستعداد اور شریف الاخلاق عالم تھے، ان کا ظاہر سنت نبویہ سے معمور اور باطن اللہ تعالٰی کی یاد محبت سے سرشار تھا، آپ ہی وہ شیخ کامل ہیں کہ جنہوں نے ہندوستان سے صحیح علم حدیث وعلم التفسیر لاکر خطۂ جنوب بوسیدنگ اور علاقۂ راسیدنگ کو مالا مال کیا، ان کی خدمت کو مسلمانان ارکان قیامت تک فراموش نہیں کرسکتے''۔(۱)

مولانا ڈاکٹر محمد عارف صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''کلام پاک کی تفسیر اور حدیث شریف کی توضیح ان کے ہاں صرف بحث کی حد تک محدود نہ تھی، اور تعلیم برائے اکتساب معلومات نہیں تھی، بلکہ قرآن وحدیث کی حلاوت ومحبت کا رنگ نمایاں اور علم نبوت کے ساتھ نور نبوت اجاگر کرنے کا پہلو غالب تھا ....حضرت ناظم صاحب تدریس ونظامت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ علاقائی مسلمانوں کے آئے دن پیش آنے والے قضایا اجتماعیہ اور دیگر امور میں حسب فرمائش وضروریات فتاوی صادر کرنے اور فصل خصومات کی خدمات انجام دینے میں بھی مصروف تھے، حضرت ناظم صاحب کو اللہ تعالی نے اپنے علاقہ بوسیدنگ کے گردونواح میں خواص وعوام کے درمیان وہ قبولیت اور اثر ورسوخ عطا فرمایا تھا، جو وہاں پر اس وقت اور کسی عالم کو نصیب نہ ہوا تھا، جہاں جاتے میر مجلس، صدر جلسہ اور صاحب الکلمۃ النافذہ مانے جاتے تھے، بنا بریں بندگان خدا کو آپ سے کافی فائدہ پہنچا، کیوں کہ عقیدت ومحبت کا استفادہ کی راہ میں بڑا دخل ہے''۔(۲)

حضرت مولانا سید الامین، شیخ الحدیث جامعہ توحیدیہ منگنماوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

حضرت جامع المناقب شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد صالح نوراللہ مرقدہ علمائے ار کان برما کے مشہور مستند اور مقبول علماء میں سے تھے، جنہوں نے اپنی پوری حیات مبارکہ علوم نبویہ اور دین محمدی کی اشاعت میں صرف کردیں، جن کی دینی خدمات

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۳۰۷۔۳۰۸۔
(۲) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۳۱۰۔۳۱۱۔

ناقابل فراموش ہیں، موت العالم موت العالم ایسے عالم کے بارے میں کہا گیا ہے، مولانا موصوف کی ہجرت سے دیار ارکان برما اب تک ماتم کر رہا ہے، اس کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا پر ہونا گو امکان عقلی ہے مگر امکان عادی سے باہر ہے"۔(۱)

مولانا محمد حنیف راغب ارکانی نے مولانا مرحوم کے متعلق کچھ تفصیلی بیان دیا ہے، آپ کہتے ہیں کہ:

"مولانا مرحوم اپنے ہم عصر علمائے دین اور مشاہیر ملت کے مابین ممتاز اور منفرد حیثیت کے مالک سمجھے جاتے تھے، فیاض ازل نے مولانا مرحوم کو بے شمار خوبیاں عطا کی ہیں، ظاہری حسن و جمال اور شان و شوکت کے ساتھ انہیں معنوی خوبیوں سے بھی نوازا ہے، قدرت نے جس طرح ان کی قد و قامت اور اعضاء و جوارح کو موزون و متناسب اور دل فریب بنایا ہے، اسی طرح ان کی طبیعت، مزاج اور باطنی قوتوں میں بھی اعتدال اور موزونی بخشی ہے، تو صورت و سیرت کی یکسانی اور ہم آہنگی نے ان کی خوبیوں میں چار چاند لگائے، اور سونے پر سہاگہ کا کام دیا، میں نے اپنی زندگی میں ارکان کے اندر بے گنج زر اور بے خیل و حشم ان کے برابر شان و شوکت اور رعب داب کا مالک اور کوئی عالم نہیں دیکھا، مجھے ان کے حالات دیکھ کر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ قصے یاد آئے ہیں جو ان کے سوانح نگاروں نے لکھے ہیں، چنانچہ جنوبی بوسیدنگ اور شمالی راسیدنگ کے اس وسیع علاقے میں تنہا یہی ایک شخص نظر آتے تھے، علاقے میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر گھر ان کا مسکن اور ہر دل ان کا موطن دکھائی دیتا تھا، اور ان کا ہر کام محمود اور ہر قول مسلم اور ہر رائے مقبول مانی جاتی تھی، ہمیں ان کے ساتھ کسی کی عداوت کا علم نہیں، نہ وہ کسی دینی و دنیاوی معاملہ میں متہم تھے، اس لئے امیر و غریب، عالم و جاہل اور مرد و زن سب انہیں عزت و منزلت اور عظمت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے"۔(۲)

(۱) مولانا محمد طیب، حیات صالح، غیر مطبوعہ، ص:۱۹۰۔

(۲) ملاحظہ ہو: مولانا محمد طیب، حیات صالح۔

حضرت مولانا محمد صدیق صاحب فندوفرانگی

حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کی ولادت ۱۹۰۴ء میں شمالی بوسیدنگ کی معروف بستی فندوفرانگ میں ہوئی، آپ کے والد صاحب ایک کاشتکار آدمی تھے، بڑے عالم دوست اور وعظ و نصیحت سے دل لگانے والے انسان تھے، اور آپ کی والدہ بھی لوگوں کے کہنے کے مطابق ایک نیک صفات خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مکتب اور مدارس میں ہوئی، اور ایک روایت کے مطابق ابتدائی تعلیم کسی مکتب یا مدرسہ کے بجائے گاؤں کے مولوی صاحب (میر جی/مزی) کے ہاتھ میں ہوئی، بعد میں آپ نے اعلی تعلیم کے سلسلے میں بنگال کا سفر کیا، اور حالیہ بنگلہ دیش کے معروف علاقہ چاٹگام میں چند سال پڑھے، اس کے بعد مزید حصول تعلیم کے لئے ہندوستان جا پہنچے تھے۔

ہندوستان میں آپ نے ۱۹۲۷ء میں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد قصبۂ امروہہ ضلع مراد آباد میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے دو سال تعلیم حاصل کی، یہاں کے نامور اساتذہ اور بزرگان دین سے فیوضات حاصل کرتے رہے، آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امروہیؒ یہاں اس لئے قابل ذکر ہیں کہ ایک تو آپ نے حضرت شیخ سے بہت ہی استفادہ کیا، جب کہ حضرت شیخ بھی آپ کا بڑا خیال رکھتے تھے، اب جب فارغ ہو کر ارکان پہنچے تو ارکان سے مراد آباد پہنچنے والے طلباء سے حضرت مولانا آپ کے احوال پوچھتے رہتے تھے، غرض آپ نے مذکورہ اس مدرسہ سے ۱۹۲۹ء میں فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ سیدھے وطن واپس پہنچے، اور اپنے علاقہ یعنی فندوفرانگ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جہاں آپ خود پڑھایا کرتے تھے، بعد میں اس مدرسہ نے بڑی شہرت حاصل کی، اور حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس زمانے میں علاقے بھر کے معروف عالم دین میں سے تھے نے اس مدرسہ میں تعلیم دی تھی، جن کی وجہ سے اس درس گاہ نے بڑی شہرت پائی تھی۔

مولانا محمد صدیق صاحب بڑے مستعد اور تیز و طرار عالم دین تھے، مناظرہ کی صلاحیت آپ کے اندر بھری ہوئی تھی، آپ نے اپنے علاقے میں مناظرہ و مباحثہ کے ذریعے بدعتیوں اور مفسدوں کی نیند حرام کر دی تھی، ساتھ ہی ساتھ آپ قول و عمل کے بڑے پکے تھے، اور احیائے سنت کے حوالے سے آپ کا کردار بہت ہی واضح اور روشن تھا، اس حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

"مولانا موصوف علمی صلاحیت، خدا داد قابلیت، موروثی شرافت میں اپنی مثال

آپ تھے، موصوف رحمۃ اللہ علیہ کا کام ضلالت و بدعت کو مٹانا، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا احیاء کرنا، اور طالبان علوم نبوت کو سیراب کرنا تھا، چونکہ اس زمانہ میں علمائے سوء اور بدعتی حضرات کی کثرت تھی اور مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ احیائے سنت کی خاطر بر وقت ان سے مناظرہ فرماتے تھے، اس لئے انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو وہابی (وہابی کا جملہ اس زمانے میں بطور گالی استعمال ہوتا تھا"۔(۱)

جہاں تک معلوم ہوا کہ بدعتی لوگوں میں چند حضرات بڑے شریر اور قوی تھے، چنانچہ یہ لوگ مولانا کے پیچھے پڑ گئے، چنانچہ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر مولانا اپنے کردار و اعمال، حرکات و سرگرمیوں سے باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے گا، چونکہ مولانا کے لئے اب اپنے علاقے کی زمین تنگ ہوگئی تھی، اس لئے مناسب سمجھا کہ اپنے علاقے کو خیر باد کہہ کر کسی دوسرے علاقے میں سکونت پذیر ہو جائیں، ویسے حضرت مولانا یہاں سے منتقل ہو کے تمنگ چنگ میں سکونت پذیر ہو گئے، چنانچہ تمنگ چنگ کے مدرسہ والوں نے آپ کو مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں پڑھانے کے لئے دعوت دی تو آپ نے اس درس گاہ میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء تک ایک سال تعلیم دی، لیکن مذکورہ بدعتی شر پسندوں نے یہاں بھی آپ کا پیچھا کیا تو آپ نے اپنے وطن مالوف سے ہجرت کی اور شمالی چاٹگام کے علاقہ فتح پور جا کے تھوڑا آرام کیا تھا۔

فتح پور میں ایک دینی درسگاہ تھی جو اب بھی بحمد اللہ موجود ہے، یہاں آپ نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک تعلیم دی، مگر بدعتیوں اور شرپسندوں نے یہاں بھی آپ کو چین سکون سے رہنے نہ دیا، بالآخر یہاں سے پھر وطن واپس ہوئے، لیکن اب اپنے علاقے میں نہیں بلکہ اپنے علاقے سے دور اور بہت دور ممبرا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ممبرا کے ایک دینی مدرسہ میں آپ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک مسلسل تدریسی خدمات انجام دیتے رہے تھے، اس درمیان ۱۹۴۲ء کا واقعہ سامنے آیا تو آپ پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، مگر اللہ کے اس مجاہد بندے نے بڑے صبر و سکون سے کام لیا، آپ نے عزم کر لیا کہ مصیبتیں جتنی بھی تپاں کیوں نہ ہوں اب کی بار آپ وطن چھوڑنے والوں میں نہیں ہوں گے، غرض یہاں ایک طویل مدت تک دینی و علمی خدمات انجام دیتے ہوئے آپ ۱۹۴۷ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۵۴۔

حضرت مولانا محمد حنیف صاحب خونیہ فاروی

سرزمین اسلام ارکان ایک ایسی سرزمین ہے جہاں اسلامیوں نے صرف طاقت وسطوت کے بل بوتے پر اسلام کا پرچم نہیں لہرایا بلکہ شمشیر وسنان اور تیغ وتفنگ کے تہ بتہ اللہ تعالی کے بعض برگزیدہ بندوں نے اپنی عرفانی اور روحانی قوت وشوکت کے سہارے بھی یہاں دین متین کا بول بالا کیا تھا، تو وجہ یہی تھی کہ آج ہم اس حقیقت کو سورج کی طرح عیاں دیکھ رہے ہیں کہ اگر چہ یہاں عرصۂ دراز سے مسلمانوں کی قوت و بالادستی ختم ہوگئی، ان کی جاہ وجلال کے آثار مٹ گئے، ان کی سربلندی اور سرخروئی کی داستان قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی، لیکن اللہ کے ان نیک بندوں کی دی ہوئی روحانی چھاپ ہمیشہ کی طرح ان یہاں کے مسلمانوں کی اس خستہ حالی میں بھی باقی ہے، اگر چہ ظاہری طاقت وسطوت تو ختم ہو گئی ہے، مگر باطنی روشنی وتابانی ان کی روحانی اور دینی زندگی میں جوں کا توں باقی رہ گئی ہے، ورنہ اس سرزمین اور یہاں کے مسلمانوں کا جو حال ہے، اس کی پیش نظر دنیا کی تاریخ یہاں کے حوالے سے کب کے اور ایک اسپین کی داستان دھرائی ہوئی ہوتی۔

تاریخ گواہ ہے کہ مجاہدین اسلام نے اپنی انوکھی فتوحات کے ذریعے اللہ کی اس زمین کو فتح کیا اور یہاں کے طول وعرض پر اسلام کا پرچم لہرادیا تو یہاں آئینِ اسلام کی بنیاد پڑی، یوں ایک طویل مدت تک یہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، عسکری اور مذہبی زندگی میں اسلامی دستور وقوانین کی روح چلی تھی، راہِ خدا کے ان جواں مردوں اور سرفروشوں کے ساتھ ساتھ درویش، عارفین، عابدین وقلندروں کا ایک طویل سلسلہ بھی اس سرزمین میں نظر آتا ہے، جس نے یہاں پائے جانے والے مسلمانوں کے علی الرغم آئے دن اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں کے بنجر دلوں کو نہ صرف آباد کیا، بلکہ ان میں زندگی کی وہ توانائی اور حرارت بخشی، جس کے بغیر ایک انسان کی زندگی مضمحل، سہمی ہوئی، اداس اور تاریکی کی شکار ہو جاتی ہے، ان برگزیدہ بندوں نے اپنے سوزِ دروں کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں کے دلوں میں وہ تپش بخشی، جس پر انسان تو کیا فرشتے بھی ناز کیا کرتے ہیں، ان روشن ضمیروں نے یہاں کی تنگ وتاریک فضاء کو اپنے تابناک دل ووجدان سے وہ روشنی اور توانائی عطا کی، جس کے بعد اگر چہ حوادث روزگار اور لطمۂ موجِ مصیبت کتنا ہی تند وتیز کیوں نہ ہو، مگر ان توانائیوں کو ضعف اور ان روشنیوں کو اندھیاری میں بدلا نہ جاسکا۔

وطن عزیز ارکان کے ان صاحب دل اور برگزیدہ ہستیوں کی صف میں مولانا محمد حنیف خونیہ فاروی کا نام گرامی بھی آتا ہے، جو اپنے زمانے میں اس محفل نورانی کے شمع فروزاں بنے ہوئے تھے، جس کی روشنی، تابانی اور توانائی پر ہزاروں پروانوں نے اپنے دل کی آرزوئیں مٹائیں، جو ایک ایسا لالہ چمن تھا جس پر ہزاروں دل جلے بلبلوں نے اپنی تمناؤں اور امنگوں کا جہاں آباد کیا تھا، جن کی ذات ایک ایسا چشمۂ حیوان تھی، جس سے انگنت پیاسوں نے اپنی روح و جان کو نہ ختم ہونے والی مدت تک کے لئے سیراب کیا تھا، آپ ہمارے معاشرہ میں جب تک رہے روشنی کا منارہ بنے رہے، جس کی ضیا پاشی سے ہمارا معاشرہ اور ہمارے سماج کے علی الرغم ہماری دینی انجمنیں، روحانی محفلیں اور پند ونصائح کی مجالس ہمیشہ منور، روشن اور تاباں رہی تھیں۔

آج آپ نہیں ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہماری توانائی ختم ہوگئی ہے، آپ نہیں رہے تو لگتا ہے کہ ہم اسلامیان ارکان کی زندگی کی ایک روحانی طاقت ختم ہوگئی ہے، چنانچہ آپ ایک تابناک ستارہ تھے، چھپ گیا تو یہاں والوں نے محسوس کیا کہ بحر بیکراں پر رواں دواں کشتیاں ہچکولے پر ہچکولے کھا رہی ہیں، اور ہمارے ملاح تند و تیز اور اندھیرے بھنور میں پھنس کر رہ گئے ہیں، نہ جانے مستقبل میں ان کا متبادل ملاح اور کون سامنے آئے گا، جو ہماری روحانی دنیا کا پتوار سنبھالے ہمیں ساحل کے پار لگائے گا؟ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا محمد حنیف بن علی حسین بن عبدالحمید بن عبدالرحمن کی ولادت باسعادت ۱۹۴۰ء میں جنوبی منگڈو کی معروف بستی خونیہ فارہ میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم علی حسین صاحب انتہائی سادہ دل، علماء دوست اور پند و نصیحت کے رسیا انسان تھے، باثروت تھے، یوں سخاوت کے اعتبار سے بھی علاقے کے دیگر سخیوں کی طرح معروف سخی تھے، اور آپ کی والدہ خدیجہ بنت حاجی امیر حسین بڑی نیک سیرت اور پارسا خاتون تھی۔

مولانا محمد حنیف صاحب نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنے گاؤں سے کیا، بعد میں اس علاقے کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں چند سال پڑھے، یہاں آپ نے مولانا مستفیض الرحمن مرحوم (سابق ناظم مدرسہ مذکورہ) سے مخصوص طور پر استفادہ کیا، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی خاطر ہندوستان جانے کا عزم کیا، اس سلسلے میں آپ نے ہندوستان تک کے سفر کو عام ڈگر سے ہٹ کر بنگال کی راہ کے بجائے

برما کے دارالحکومت رنگون ہو کے جانے کا فیصلہ کیا، یوں آپ ہندوستان کی امید لئے رنگون پہنچے، وہیں سے پاسپورٹ بنوائے اور قانونی طور پر اپنی منزل مقصود کو ۱۹۶۵ء میں پہنچ گئے تھے۔

ہندوستان پہنچتے ہیں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور اس مادر علمی سے خوب خوب سیراب ہوئے، چنانچہ مسلسل چند سال پڑھ کر براہِ رنگون وطن واپس آگئے تھے۔(۱)

دارالعلوم دیوبند میں آپ اپنی پڑھائی کے دوران اصلاح باطن کی خاطر چند بزرگوں اور اہل اللہ کے دہلیز پر پہنچے، اس دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک رات خواب میں ایک سفید پوش بزرگ تشریف لائے اور آپ کو اسم اعظم شریف کی تلقین کر کے فرمایا کہ تم اس اسم شریف کو حفاظت سے رکھنا، ہمیشہ یہ راز راز ہی میں رہنے دینا، تا آنکہ تم تعلیم سے مکمل فارغ ہوجاؤ، اس واقعۂ خواب کے بعد آپ کی حالت دگرگوں ہوگئی، آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذکر الٰہی میں آئے دن زیادہ سے زیادہ منہمک ہوتے چلے گئے تھے، اب آپ کے حالات پر رحم کھاتے ہوئے آپ کے ایک ساتھی جو آپ کے ہم جھولیوں میں سے تھے نے پوچھا کہ بھائی! آخر کیا وجہ ہے کہ آپ کی حالت ایسی کیوں ہوگئی ہے؟ لیکن مولانا خاموش تھے، مگر ساتھی نے اصرار پر اصرار کرنا شروع کردیا کہ بتاؤ تو سہی آخر ماجرا کیا ہے، اب اس کے اصرار پر آپ نے تلقین اسم اعظم والی بات فاش کردی، کہتے ہیں کہ اس راز کو فاش کردینے کی وجہ سے آپ کی حالت مزید خراب ہوگئی، اور آپ پر جذب واستغراق کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی تھی۔

بہرحال آپ ہندوستان سے وطن واپس ہوئے تو آپ کو علاقے کے چند مدارس کے ارباب بست و کشاد نے عزت دی کہ آپ تشریف لائیں اور تدریسی سلسلے کو روشنی بخشیں، مگر مولانا اپنی حالت پر مجبور تھے، آپ پر رہ رہ کر جو جذب استغراق کی حالت طاری ہوجاتی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ آپ کسی مدرسہ کی مدرسی سے دور رہیں، کیوں کہ آپ اپنی حالت کو خوب خوب سمجھ رہے تھے کہ مدرسہ کی مدرسی آپ کے لئے مناسب نہیں ہوسکتی، تو وجہ یہی تھی کہ آپ نے کسی بڑے مدرسہ کے بجائے بس اپنے گاؤں کی ابتدائی مدرسہ پر اکتفاء کرلیا تھا۔

ہندوستان سے واپسی کے معا بعد آپ نے جناب خدیجہ بنت حاجی امیر حسین لمبا گونوی سے شادی

(۱) دیوبند میں مولانا محمد حنیف صاحب کے برمی ساتھیوں میں مولانا زاہد حسین صاحب گرجنڈیاوی، مولانا فیض اللہ صاحب کیلادنگی، مولانا عبدالسبحان صاحب کیلادنگی اور مولانا محمد سلطان صاحب خائندہ فاروی قابل ذکر ہیں۔

کی، ماشاء اللہ اہلیہ محترمہ بھی بڑی سعادت مندتھی اور ہے، اہلیہ نے آپ کے ساتھ شادی خانہ آبادی کے بعد سے بڑی بڑی مشکلات اور مصیبتیں اٹھائیں، لیکن ہر حال میں صبر وشکر کا مظاہرہ کرتی رہی، اس سلسلے میں چند واقعات سننے میں آئے، مگر طوالت کے خوف کے ساتھ اس عجالہ میں اس کی تفصیلات پر جانا مناسب نہیں سمجھ رہا ہوں، بڑی عابدہ، پاک باز اور نیک صفت خاتون ہے، اللہ تعالی ان کی حالت پر رحم فرمائے اور حیات میں برکت عطا کرے۔

مولانا پر جب جذب واستغراق کا حال طاری ہوتا تو عام مجذوبوں اور اصحاب حال بزرگوں کی طرح لب و لہجے میں قدرے تشدد اور سختی کا سماں ہو جاتا تھا، چال چلن اور رہن سہن کا معاملہ بھی عجیب و غریب سا ہو جاتا تھا، لیکن اس حالت میں بھی علماء، صلحاء، اہل اللہ اور طالب علموں کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آتے تھے، جذب واستغراق کی حالت میں بھی اللہ والوں سے ویسے سلوک کرتے، جو عام حالت میں ہوسکتا تھا، اہل علم و دانش اور اللہ والوں کے سامنے بڑی سنجیدگی اور متانت کا مظاہرہ کرتے تھے، عام حالت میں آپ رفاہِ عامہ کے معاملات میں بڑی دل چسپی لیا کرتے تھے، آپ نے اپنی استطاعت کے مطابق راہِ خدا میں بہت ہی خرچ کیا، آپ نے بڑی تگ ودو کر کے اپنی بستی میں ایک مسجد بنوائی، جس سے ملحق ایک مکتب یعنی ابتدائی دینی مدرسہ کی تعمیر کی تھی، جس میں آپ مکتب نشینوں کو پڑھایا کرتے رہے تھے۔

معاصرین میں سے بڑے بڑے علماء آپ کے پاس تشریف لاتے اور آپ کے سامنے دقیق وعمیق مسائل پیش کرتے تھے، آپ ان کے ساتھ گاہے گاہے ایسے دقیق وعمیق مسائل پر بحث کرتے کہ جن کا سمجھنا عالم عالموں کے لئے انتہائی مشکل ہو جاتا تھا، اسی لئے اہل علم وفضل آپ کی استعداد اور صلاحیت سے بڑے متاثر تھے۔

علم وفضل کے حوالے سے جہاں تک پتہ چلا کہ آپ بڑے وسیع النظر عالم دین تھے، آپ کے سینے میں علوم وفنون کا بہت بڑا ذخیرہ موجزن تھا، قرآن وسنت، فقہ واصول کی خاصی مہارت تھی، خاص طور پر فقہ وفتادی کے متعلق آپ کا دامن تحقیق بہت کشادہ تھا، اور سیرت وتاریخ کی معلومات کا پھیلاؤ نہایت حیرت انگیز تھا، تزکیہ واحسان کے سلسلے میں تو خیر آپ کا ذہن زرخیز تھا، چنانچہ آپ کے معاصرین میں سے بہت سے اہل علم ودانش کا اعتراف ہے کہ مولانا بڑے اہل کمال عالم دین اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے، پاک بازی اور تقوی شعاری میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا، ساتھ ساتھ حسن سیرت اور

حسن عمل میں اللہ تعالی نے آپ کو خاص امتیازی شان بخشی تھی، جہاں آپ علوم وفنون سے آگاہی رکھتے تھے وہاں تصوف کے عملی پہلو کے ساتھ ساتھ علمی پہلوؤں سے بھی آپ کو خاص دل چسپی تھی، اور اس کے مختلف گوشوں کے متعلق آپ کے حدود معلومات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، آپ طبعا بڑے ذہین تھے، ساتھ ہی ساتھ مطالعہ کے ذوق بھی رکھتے تھے، آپ کی شخصیت کا اصل جوہر آپ کی للّٰہیت وخلوص وتوفیق خداوندی اور زہد وورع ہے، اس اعتبار سے آپ سرزمین اسلام ارکان کے ایک گل سر سبد تھے، جس کی خوشنمائی وتازگی آپ کی زندگی کے دوران تو تھی ہی، لیکن موت کی شکل میں مرجھانے کے باوجود بھی باقی رہ گئی ہے۔

آپ غذا ہلکی پھلکی کھاتے، گوشت بنے ہوئے پسند فرماتے تھے، کسی خاص کھانے کی رغبت تو نہ تھی، البتہ سوکھی مچھلی سے ذرا نفرت تھی، جو ملا بس کھا لیا کرتے، کسی بھی کھانے پر عیب نہیں لگاتے اور کھانے میں کمی بیشی ہو بھی جائے تو شکایت نہیں کرتے تھے۔

آپ خاص وعام کی دلجوئی فرماتے، اور کوئی آپ سے مشورہ چاہتا تو آپ اپنی دانست کے مطابق صحیح اور صائب مشورہ دیتے تھے، مال وزر کی حرص تو خیر آپ کو چھوکر بھی نہیں گزری، زندگی میں آپ نے مال وزر کو بہت کم اہمیت دی، دنیاوی معاملات میں اگر کم زور سے طاقت ور کا مقابلہ ہو جاتا تو آپ کم زور (اگر حق بجانب ہوتو) کی مدد کرتے تھے، اور کوشاں ہوتے کہ کم زور کو اس کا حق مل جائے، حتی المقدور کسی کی حق تلفی ہونے نہ دیتے تھے۔

مسلسل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور ولا دیزی تھی، مزید برآں آداب واطوار، فہم وفراست، زہد وورع، امانت ودیانت، تعلیمی اور تحقیقی استعداد، کتاب وسنت پر عملی ذوق وشوق اور سیرت وکردار کے اعتبار سے آپ ایک حسین وجمیل اور دلکش انسان تھے۔

مولانا عام حالت میں بڑے نظیف ونفیس اور صاف ستھرا لباس پہنا کرتے تھے، سفید کرتہ، سفید پاجامہ، لنگی اور کبھی کبھار کرتے کے ساتھ پتلون بھی پہنا کرتے تھے، چادر سر پر یا کندھے پر رہتی تھی، جذب واستغراق کی حالت میں بھی لباس وپوشاک میں کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوتی تھی۔

اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے عزت وسربلندی سے نوازتا ہے، ظاہر ہے کہ برمی حکام اور ان کے لالے پالے غنڈے ارکان کے مسلمانوں کی عزت وجان سے ہولی کھیلتے آرہے ہیں، بزرگان دین، علماء وصلحاء کا مذاق اڑا ان کے آئے دن کا معمول بن چکا ہے، دنیا میں وہ کونسے مظالم کی نوعیت ہے، جوان

مسلمانوں پر نہیں ہو رہی ہے؟ مگر اللہ تعالی کا خاص کرم تھا اور مولانا کی مخصوص کرامات تھیں کہ برمی حکام اور ان کے لالے پالے غنڈے جتنے ہی ظالم کیوں نہ ہوں، مولانا کے سامنے پڑے تو موم بن جاتے تھے، کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ مولانا سے خلاف ادب برتاؤ کرے، کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کے مولانا کے سامنے باتیں بنائے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرے، صرف یہی نہیں بلکہ حکام ہو یا غنڈے آپ کے سامنے آتے تو ظلم وستم کا خیال تو کجا بلکہ موم ہو کر احترام سے پیش آتے تھے۔ حکام آپ کی فرمائش یا حکم کی بہر حال تعمیل کرتے یا کرا دیتے تھے، اسی لئے لوگ مصیبت کی حالت میں آپ کے پاس آتے اور اپنی اپنی پریشانیاں دور کرانے کی سفارش کراتے تھے، ان بیشمار واقعات میں سے بطور مثال چند واقعات کا یہاں تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ آپ کے تذکرے میں یہ مثالیں بطور یادگار محفوظ رہ جائیں:

(۱) کھاری فارہ منگڈو میں ایک گھرانہ کے ایک لڑکے نے اپنی حقیقی بہن کو بذریعہ خنجر اس لئے مار ڈالا کہ بہن نے بھائی کے ایک دشمن سے چوری چھپی شناسائی پیدا کرلی تھی، اب بہن تو مرگئی، مگر ماں باپ اس فکر میں پڑ گئے تھے کہ جو کچھ بھی ہو گیا سو ہو گیا، لڑکا حکومت کے ہاتھ سے بچ جائے، والدین نے فوری طور پر اس لڑکے کو پولیس کی نظروں سے بچاتے ہوئے بنگلا دیش بھیج دیا، بعد میں بوڑھے اور بے سہارے والدین کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کسی بھی طریقے سے اس لڑکے کو ارکان واپس لایا جائے، تاکہ یہ لڑکا اس بیکسی کے عالم میں ان کا سہارہ بن سکے، اب لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ اگر مولانا محمد حنیف صاحب اس لڑکا کے حق میں سفارش کریں گے تو ممکن ہے کہ لڑکا واپس آسکے گا اور حکومت کے ہاتھ سے بھی بچ جائے گا، اگر سزا ہو بھی گئی تو بہت کم ہونے کی امید ہے، چنانچہ والدین حضرت کے پاس پہنچے، اور حضرت کو سفارش کرنے کی درخواست کی، اب مولانا نے ان دونوں کی بے بسی اور کس مپرسی کو دیکھ کر دعائیں بھی دیں اور حکام سے سفارش بھی کردی، ویسے لڑکا واپس آیا اور یہ مجبور والدین مزید پریشانیوں سے بچ گئے تھے۔

(۲) مولانا کے ایک قریبی رشتہ دار کو پولیس والوں نے ناکردہ گناہ کی پاداش میں مسلسل ظلم کا نشانہ بناتے ہوئے کال کوٹھری میں ڈال رکھا، اور طرح طرح کے بہانے تراشے زنجیروں میں غرق کر رکھا تھا، یہ خبر مولانا کو ملی تو آپ فورا منگڈو کے جیل خانے آئے اور داروغہ کو تحکمانہ انداز میں فرمایا کہ فلاں میرا رشتہ دار ہے، اسے میرے سامنے زنجیر کھولے لایا جائے، اب داروغہ کا کہنا تھا کہ مولانا صاحب

میں اسے آپ کے سامنے لاؤں گا مگر زنجیروں میں جگرا ہوا، مگر مولانا ماننے والے نہ تھے، اور تحکمانہ انداز میں اصرار کر رہے تھے کہ زنجیر کھولے اسے عام لباس میں ملبوس میرے سامنے لایا جائے، بالآخر مولانا کی جلالت شان کے سامنے داروغہ کو ہار ماننا ہی پڑا، چنانچہ زنجیر کھولے عام لباس میں ملبوس کر کے آپ کے سامنے اس رشتہ دار کو لایا گیا تھا۔

(۳) ظاہر ہے کہ ارکان (برما) میں بنگلا دیشی سکے نہیں چل سکتے، کوئی آدمی اگر بنگلا دیشی سکے سمیت پکڑا گیا تو اسے سخت سے سخت ترین سزا ملتا تھا، اس حال میں مولانا کو کسی آدمی نے شاید کسی چیز کے عوض میں ہو کہ کچھ بنگلا دیشی سکے دیئے تاکہ مولانا اسے تبادلہ کر کے خرچ کر سکیں، آپ اپنے تھیلے میں اسے ڈالے منگڈو جا رہے تھے، راستے میں فوجیوں کی ایک ٹولی پڑی، کمانڈر نے کہا کہ مولانا صاحب دیکھائیے کہ آپ کے تھیلے میں کیا ہے، چونکہ عموما مولانا کے اس تھیلے میں قرآن کریم کے ایک نسخہ کے علاوہ دیگر دینی کتابیں بھی ہوا کرتی تھیں، اور کمانڈر مولانا سے واقف بھی تھا، اور جانتا تھا کہ مولانا کے تھیلے میں کتابیں ہوا کرتی ہیں، اب مولانا نے جلدی پر کتابیں نکالنے کے بجائے وہ بنگلا دیشی سکے نکال دیئے، تاہم کمانڈر نے یہ سکے ہاتھ لئے اور مسکرا کر واپس کر دیئے، راوی کہتا ہے کہ یہ مولانا کی کرامت تھی یا کسی حاکم کے سامنے آپ کی عزت، جس جرم میں لوگوں کو تختہ مشق بنایا جا رہا تھا، اس پر بھی مولانا بغیر کچھ کہے چھوڑ دیئے گئے تھے، اس واقعہ پر راوی نے مزید کہا ہے کہ:

(الف) ممکن ہے کہ یہ مولانا کی کرامت تھی کہ فوجی کمانڈر کو یہ بنگلا دیشی سکے کے بجائے برمی سکے نظر آئے ہوں۔

(ب) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فوجی کمانڈر مولانا کے حالات سے واقف تھے، اس کو شاید اندازہ تھا کہ مولانا حقیقت میں کوئی روایتی مجرم نہیں ہیں، بلکہ شاید کسی مجبوری پر یہ رقم آپ کو لینی پڑی ہو۔

(ج) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کمانڈر کوئی مسلمان تھا(۱) اسے مولانا کو کسی مصیبت میں ڈالنا گوارہ نہیں ہوا تھا۔

بزرگان دین اور اولیائے صالحین کی کرامات سے کون انکار کرسکتا ہے، مولانا ایک صالح عالم دین اور بلند پائے کے بزرگ تھے، آپ کے کشف وکرامات اور خوارق عادات کی روایتیں بہت ہی سننے میں آئیں، لوگ مولانا کہ نام سنتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ آپ سے فلاں فلاں کرامات صادر ہوئیں، آپ کا

---

(۱) یہاں بہت سے واقعات سننے میں آئے کہ رنگون کے مسلم نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ارکان آتا ہے، لیکن وہ اپنے دین کو چھپائے رکھتا ہے، وہ اس لئے کہ اگر فوج کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ مسلمان ہے تو اسے فوج سے فورا نکال باہر کر دیا جائے گا۔

حال ایک درویش اور خدا رسیدہ بزرگ جیسا تھا، اب آپ کی بعض کرامات اور خوارق عادات کے چند واقعات درج کررہا ہوں:

(۱) روایت ہے کہ مولانا اپنی بستی سے نکلے منگڈو شہر کو تشریف لے جارہے تھے، راستے پر گاڑی کا انتظار فرمایا، مگر سردست کوئی گاڑی نہ مل سکی، اچانک اس حال میں ایک گاڑی آنکلی جو فوجیوں سے بھری پڑی تھی، مولانا نے سائق کو گاڑی روکنے کے لئے اشارہ فرمایا تو سائق گاڑی روکنا چاہا، مگر فوجیوں نے روکنے سے منع کردیا، اب گاڑی مولانا کو اٹھائے بغیر جارہی تو مولانا نے فرمایا کہ آگے جاکے دیکھو گے اور معلوم ہوجائے گا کہ منگڈو کتنی دور ہے، یوں تو گاڑی چلی گئی اور مولانا بھی پیچھے پیچھے پیدل منگڈو کے لئے روانہ ہوگئے، راوی کہتا ہے کہ ایک میل تک آگے جاکر دیکھا کہ وہ گاڑی رک گئی، اور فوجیں گاڑی سے اتر کے پیدل چل رہی تھیں، مولانا گاڑی کے پاس سے گزرے تو سائق سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے اپنی مجبوری کا اظہار کیا، تب مولانا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے مغرب تک گاڑی ٹھیک ہوگئی تو تم منگڈو آجانا، اور عملاً ہوا بھی ویسا، راوی کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے یہ گاڑی والا مولانا کو جہاں پاتا اٹھائے لاتا تھا۔

(۲) مولانا کے بڑے بھائی نے والد کے انتقال پر جائدادیں تقسیم کیں، اور مولانا کو سوچھ سمجھے وہ جگہ دی گئی کہ جہاں سے برسات کے موسم میں بند ٹوٹ جاتا ہے، لیکن مولانا کی کرامت تھی کہ جب سے یہ جگہ مولانا کے حصے میں آئی، تب سے بند یہاں سے نہیں ٹوٹا، بلکہ اس کے بجائے وہاں سے ٹوٹنا شروع ہوگیا، جہاں تقسیم کرنے والے کی جگہ تھی۔

(۳) مولانا کے گاؤں میں عرصۂ دراز سے دو خاندانوں کے درمیان خاندانی چپقلس چلی آرہی تھی، اس دوران مولانا اپنی بنا کردہ مکتب میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، اب دشمن خاندان کی دو لڑکیاں مولانا سے پڑھنے مکتب آئیں تو مولانا نے ان کو قرآن کریم کی تعلیم دینا شروع کردیا، یہ سن کر دشمن خاندان کے مولوی صاحب مولانا کے یہاں آئے اور تحکمانہ انداز میں آپ سے کہا کہ آپ ان دونوں لڑکیوں کو پڑھانے کے بجائے ان کو مکتب سے باہر کردیں، مگر مولانا نے جواب میں فرمایا کہ ہم جیتے جی ان کو مکتب سے باہر نہیں کرسکتے، اب مولوی صاحب نے واپس جاکر بستی کے سرپنچ صاحب کو بلالایا، سرپنچ نے بزور بازو لڑکیوں کو مکتب سے نکال دیا، اس واقعہ کے فوراً بعد مولانا بڑی پریشانی کے عالم میں مکتب سے نکل کر چلے گئے، اب ہوا یہ تھا کہ ابھی مولانا نکلے بہت دور بھی نہیں گئے کہ مکتب کا پورا

ڈھانچہ گر کر تباہ ہوگیا، چونکہ مکتب بھانس پوس کا تھا، اس لئے بچے بچیوں کی جانیں بچ گئیں، راوی کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے مذکورہ سرپنچ مولانا کے سامنے آواز کھولنے کی جرات تک نہیں کرتا، مولانا کی ہر بات پر آمنا وسلمنا کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔

(۴) مولانا پر جذب کی حالت طاری ہوگئی تو خاندان کے لوگوں نے مولانا کو پابہ زنجیر کرکے گھر کے اندر محبوس کردیا، تب مولانا نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں پاگل نہیں ہوں، بہت ہی منتوں کے باوجود آپ رہا نہ کئے گئے تو آپ پر شدید غصے کا حملہ ہوگیا، اور موقع پا کر خود اپنے گھر کو آگ لگادی، اور پورا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا، مگر مولانا اس راکھ کے اندر صحیح وسالم ہی رہے، بس صرف زنجیر کی کڑی کی گرمی سے پاؤں میں تھوڑا زخم سا آیا تھا، راوی کہتا ہے کہ اس عجیب وغریب اور نہ سمجھ آنے والے واقعہ کے بعد لوگ کہنے لگے کہ ایک سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے کہ آگ کے شعلے آپ کے حق میں گلزار بن گئے تھے، اور دوسرا مولانا حنیف صاحب ہیں کہ آگ انہی جلانے میں بری طرح ناکام ہوگئی ہے۔

(۵) بعض برمی فوجی نوجوانوں کو آپ کلمہ طیبہ پڑھا دیا کرتے تھے، جب آپ کا سامنا ہوتا تو آپ تحکمانہ انداز میں فرمایا کرتے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لے، سب فوجی نوجوان کلمہ طیبہ پڑھ لیا کرتے تھے، راوی کہتا ہے کہ مولانا کی ایسی حرکت ہماری سمجھ سے باہر تھی، آیا یہ نوجوانان دین اسلام کے بھولے بسرے ہوئے مسلمانوں کے بچے تھے یا مولانا کی ایک انوکھی کرامت تھی کہ مولانا کے حکم ٹالنے کی ان کو جرات تک نہیں ہوتی تھی۔

(۶) فوجی جوانوں کا مسلمانوں کو بیگار کے لئے پکڑ پکڑ کر لے جانا یہاں معمول تھا اور اب بھی ہے، بیگار کے لئے لوگوں کو پکڑنا شروع ہوتا تو لوگ مولانا کے یہاں پناہ لیتے تھے، فوجی جوانوں کی کبھی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ آپ کے سامنے سے یا آپ کے گھر میں پناہ لینے والوں کو بیگار کے لئے پکڑ کر لے جائیں، راوی کہتا ہے کہ پکڑ دھکڑ کے وقت مولانا کا گھر لوگوں کی پناہ گاہ ہوجاتا تھا، خاص طور پر مجبوروں کے لئے۔

مولانا چھوٹے بچوں کو بہت پیار کرتے تھے، اور پڑھاتے تو بہت پیار سے پڑھایا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ مکتب میں ضرب تادیبی ہمارے یہاں کے حضرات مولویوں کا خاص معمول ہے، لیکن مولانا ایسی ضرب تادیبی کے سخت مخالف تھے، فرماتے تھے کہ بچوں کو محبت اور پیار سے پڑھانا چاہئے، ضرب تادیبی سے بچوں کا خاص کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

مولانا کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ نماز فجر کے بعد بعض احباب کو گھر بلالاتے اور دودھ پتی کے ساتھ دیگر

ناشتے خود بھی تناول فرماتے اور دوستوں کو بھی بلا کے کھلاتے تھے، مولانا دوسروں کو کھلا پلا کر بڑے خوش ہوتے تھے۔

مولانا کی عادت تھی کہ نماز مغرب سے فراغت کے بعد فوراً سو جایا کرتے، لیکن نماز عشاء سے پہلے از خود جاگ جاتے تھے، پھر نماز عشاء سے فارغ ہوتے ہی تلاوت شروع کر دیتے اور ایک دو گھنٹے تک تلاوت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، تلاوت کے اختتام پر محاسبۂ نفس اور مراقبہ میں بیٹھ جاتے، مراقبہ و محاسبہ کے بعد ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے، ویسے تہجد کا وقت ہوتا تو تہجد میں مشغول ہو جاتے، نماز فجر کی آذان ہو جاتی تو آپ باہر نکلتے اور لوگوں کو نماز فجر کے لئے جگایا کرتے تھے۔

آپ کے صاحب زادہ مولوی اختر حسین صاحب کا بیان ہے کہ انتقال سے چند روز پہلے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا، جس میں دیگر باتوں کے علی الرغم ایک بات یہ بھی بتائی گئی تھی کہ:

''سعودی عرب میں رہائش پذیر میرے تمام احباب اور جملہ متعلقین، عزیزوں اور اقارب تک یہ خبر پہنچا دی جائے کہ سب کے سب مجھ سے رابطہ کریں، قریب ہے کہ وہ لوگ میری آواز کبھی سننے نہیں پائیں گے''۔

بات کان پڑتے ہی میرا ہوش اڑ گیا تھا، اور مجھے لگا کہ والد صاحب کے انتقال کا وقت آ گیا ہے، آخر جو بات دل میں گزری وہی ہوگئی، کہ چند روز گزرتے نہ گزرتے خبر آئی کہ والد صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

روایت ہے کہ انتقال کی شام مولانا محمد حنیف صاحب منگڈو شہر گئے تھے، گھر واپس آ رہے تو چند احباب نے آپ کو وہاں روکنا چاہا کہ حضرت آج کی رات آپ ہمارے یہاں رہ جائیں تو ہمارے لئے بڑی سعادت ہوگی، کل انشاء اللہ آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا، مگر مولانا نہیں مانے اور فرمایا کہ آج مجھے ضرور گھر جانا ہے، زندگی رہی تو کل دوبارہ آپ لوگوں کے پاس آئیں گے۔

یوں آپ مغرب سے پہلے گھر پہنچ گئے، مغرب کی نماز ادا کی، اور معمول کے مطابق بعد مغرب سونا چاہا، لیکن طبیعت ناساز ہوگئی تھی، عشاء سے پہلے تھوڑی الٹی ہوئی، اور گھر والوں کو بتایا کہ میرا بستر سیدھا کر دیا جائے، اب مجھے آرام کرنا ہے، اور مزید یہ بھی فرمایا کہ تمام لوگ میرے پاس سے ہٹ جاؤ، ویسے گھر والے ادھر ادھر منتشر ہوگئے، سب نے سمجھا کہ مولانا اب آرام کرنا چاہتے ہیں، عشاء کے بعد گھر والوں نے دیکھا کہ مولانا معمول کے مطابق نہیں جاگ رہے ہیں، اب جگانا چاہا تو دیکھا کہ مولانا اب

اس دنیا میں نہیں ہیں، یعنی ۱۹۹۶ء میں مولانا ہمیشہ کے لئے سو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالی نے مولانا کی اولاد میں برکات عطا کیں، چار بیٹے اور تین بیٹیاں بخشیں، بیٹیوں میں سے ایک اللہ کو پیاری ہوگئی، باقی میں سے بڑے تین صاحب زادے فی الحال سعودی عرب کے شہر جدہ میں مقیم ہیں، اخلاقی اعتبار سے سب کے سب ماشاء اللہ اچھے ہیں، البتہ ان تمام صاحب زادوں میں سے ایک بیٹا صدیق محترم ابوحنیف مولوی اختر حسین صاحب ماشاء اللہ تبارک وتعالی بڑے روشن دل، روشن خیال اور روشن ضمیر نکلے ہیں، اللہ تعالی ان کی حیات میں برکات اور سکنات کی بارش برسائے، مولوی صاحب قوم وملت کے حوالے سے ایک دلِ دردمند اور فکرار جمند کے مالک انسان ہیں، ایک بزرگ ترین عالم دین کی اولاد سے جتنی توقع کی جا سکتی ہے اس کے لئے آپ کی ذات عالی مرتبت اور نرالی شخصیت موزون ہے، عرصۂ دراز سے وہ قوم وملت کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیم ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کے سرگرم کارکن اور آج کل رکن ہیں، ۲۰۰۴ء کے اواخر سے لے کر آج تک تنظیم کے پروگراموں اور کاموں کے لئے ان کی ذات وقف ہے، مجھے خود ان کی جان نثاری، فدائیت، خیر اندیشی اور قربانی واخلاص پر رشک آنے لگتا ہے، کسی بھی تنظیم اور تحریک کے کارکن ہو تو ایسا ، ایسے چند کارکن مل جائیں تو ایک تنظیم عملاً ایک تحریک کی شکل اختیار کر سکتی ہے، دامے درمے، قدمے سخنے غرض ہر اعتبار سے تنظیم اور قوم وملت کے خیر خواہ انسان ہیں، کبھی، کہیں اور کسی بھی موقع پر تنظیم کے کام سامنے آجائے تو وہ اپنی تمام ذاتی ضروریات کو چھوڑ چھاڑ کر تنظیم کے لئے وقف ہو جاتے ہیں، اس حوالے سے ان کو بہت سی تکلیفیں بھی سہنی پڑیں، مثلاً ۲۰۰۸ء کا واقعہ ہے کہ اس سال بنگلا دیش کے معروف شہر چاٹگام میں ہونے والی روہنگیا نیشنل کنونشن میں راقم السطور اور سعودی عرب میں مقیم تنظیم کے دیگر چند اہم کارکن جن میں برادر محترم محمد عثمان بن نصیر احمد ندا خالوی ناقابل فراموش ہیں نے شرکت کی، اس میں مولوی اختر حسین پیش پیش تھے، واپسی کے دوران انہی ڈھاکہ ائرپورٹ میں جتنی کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جتنی مصیبتیں جھیلنی پڑیں، سب کے سب قوم وملت کی بہبودی اور فلاح کی کوشش کی وجہ سے تھیں، ورنہ انہی کونسی ضرورت تھی اور ان پر کس کا دباؤ تھا کہ زندگی کی عیش وآرام، گھر بار، اولاد واقارب اور نفع بخش تجارت چھوڑے اس کنونشن میں شریک ہونا پڑا، مصیبتوں پر مصیبتیں سہنی پریں اور کلفتوں پر کلفتیں اٹھانی پڑی تھیں؟

خلوص کے ساتھ قربانی اور تگ ودو کی تو مولوی صاحب کے اندر ضرورت کی حد تک تنظیمی صلاحیت بھی

آ گئی ہے، ساتھ ساتھ آج کل ان کی فکر میں توازن اور کردار میں اعتدال بھی نظر آتا ہے، پچھلے زمانے میں زبان وگفتگو اور انداز وطرز بیان میں متانت وسائستگی کا فقدان رہا تو پچھلے عرصۂ دراز سے ان میں متانت وسادگی، شستگی وشگفتگی بھی آ گئی ہے، کسی بھی گفتگو کے دوران مخاطب کے مراتب وحالات کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، اور موزون وبرمحل اور شائستہ گفتگو کرنے میں بھی کافی مہارت آ گئی ہے۔

مولوی اختر حسین صاحب اوروں کے لئے جو کچھ بھی ہوں، مگر خاکسار کے لئے بہت کچھ ہیں، میرے بہت ہی قریبی چاہنے والے اور صحیح معنی میں خیرخواہ دوست اور ساتھی ہیں، راقم کے متعلق ان کا انداز دوسرا اور خیالات دوسرے ہیں، میرے خیال میں آپ مجھے اتنے پسند کرتے ہیں جتنے کا میں لائق نہیں ہوں، اتنی عزت واحترام اور محبت کرتے ہیں جتنی کا میں مستحق نہیں ہوں، شروع ہی سے انہوں نے میرے ساتھ جس خلوص، اپنائیت اور فدائیت کا مظاہرہ کیا وہ میری اور ان کی زندگی کا ایک حسین باب ہے، وہ میرے دکھ درد کا ساتھی ہیں، میری خوشیوں پر خوش اور میرے غم پر پریشان ہی رہتے ہیں، مجھے خوشی ہوتی تو وہ پھولے نہ سماتے، مجھے تکلیفیں ہوتیں تو وہ تڑپتے اور ماہی بے آب ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالی نے انہی بھی ان کے بے مثال بلکہ مثالی باپ کی طرح اخلاق وکردار اور حسن سیرت وصورت سے نوازا ہے، ان کی چال چلن، ڈھنگ وادا، رہن سہن، عادت واطوار مشرقی لوگوں کے انداز زندگی کا آئینہ دار ہے، اللہ تعالی ان کی اولاد میں بھی برکت عطا کی، چار بیٹوں میں بالترتیب محمد حنیف اور نواف راقم کے تلمیذ خاص اور بنگلا دیش قونصل خانے جدہ کے زیر اہتمام چلنے والے اسکول کے طالب علم ہیں، ماشاء اللہ بڑے ذہین وفطین بھی ہیں، ان دونوں کے علاوہ نائف، نوف اور ولید نامی بچے بھی ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس گھر میں برکت دے، اور ان کی تمام اولاد کو ملت وقوم کی خدمات کے لئے قبول فرمائے، آمین یارب العالمین۔

حضرت شاہ محمد ہاشم صاحب، صاحب بازاری بوسیدنگی

سرزمین ارکان کے درخشاں ستاروں میں ایک مایۂ ناز ستارہ حضرت شاہ محمد ہاشم صاحب، صاحب بازاری بھی ہیں، اسلاف امت کے سوز دروں کے مالک، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز دل، بڑے عزم وحوصلہ اور بلند ہمتی سے بھر پور سینہ، شخصیت میں کشش رکھنے والے، لب ولہجہ میں خلوص وللٰہیت، انداز دادا میں وقار ومتانت، زبان میں لطافت وشیرینی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند اس انسان نے اپنی زندگی کو خلق خدا کی ہدایت ورہنمائی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

حضرت کا خاندان اصل میں شاہ فریر دیپ ٹیکناف میں تھا، ایک اطلاع کے مطابق آپ کی ولادت با سعادت ۱۸۹۰ء میں ہوئی، بعد میں حوادثِ روزگار کا مارا یہ خاندان موجودہ ارکان میں منتقل ہوگیا، اور حضرت کا نشوونما اور تعلیم وتربیت بھی ارکان ہی میں ہوئی تھی۔

شاہ صاحب کی ابتدائی دینیات کی تعلیم ارکان میں ہوئی، مگر موجودہ رواج کے مطابق آپ ایک عالم نہ بن سکے، مگر اللہ تعالی نے آپ کے سینہ کو علم وعرفان کے نور سے منور کردیا تھا، ظاہری اعتبار سے اگرچہ آپ ایک عالم نہیں تھے، مگر علم لدنی اور وہبی علم کا وافر حصہ قدرت کی فیاضی سے آپ کو مل چکا تھا، آپ قرآن کریم کی ایسی ایسی تفسیر اور احادیث نبویہ کی ایسی ایسی تشریح فرماتے کہ عقل دنگ رہو جاتی تھی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ”شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ظاہری اعتبار سے عالم دین نہیں تھے، لیکن انہیں علم لدنی ووہبی کا وافر حصہ ملا تھا، اس لئے قرآن وحدیث کی تفسیر اس انداز سے بیان فرماتے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے“۔(۱)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ابھی پچیس سال تھی کہ آپ علم وعرفان اور نور ہدایت کے متلاشی بنے، چنانچہ ایک مرد باخدا کی تلاش میں کشاں کشاں حضرت حافظ مولانا شاہ ظہیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۲)

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۸۳۔

(۲) سردست حضرت شاہ حافظ مولانا ظہیر الدین رحمہ اللہ کے حالات سے خاکسار واقف نہیں ہے، تاہم تلاش وجستجو چل رہی ہے، خدا کرے کہ مل جائے۔

کے دربار تک پہنچ گئے تھے، حضرت شاہ ظہیر نے آپ کو بیعت فرمایا اور ان کے یہاں آپ نے چار پانچ سال تک ریاضت ومجاہدہ کیا، بالآخر ۱۹۲۰ء میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہو گئے تھے۔

خرقۂ خلافت واجازت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ جنوبی بوسیدنگ کی معروف بستی صاحب بازار تشریف لائے اور یہاں علم وعرفان کا دریا بہا دیا، آپ نے ۱۹۲۲ء سے لے کر پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا، زندگی کا بقیہ حصہ اس مردِ باخدا نے خلق خدا کی فیض رسانی میں گزار دیا تھا، حضرت شاہ صاحب ؒ صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، آپ سے صادر ہونے والی کرامات کی بہت ساری باتیں سننے میں آئیں، حضرت اتباع سنت میں یکتائے روزگار تھے، ذکر اللہ آپ کے دل کی خوراک تھا، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا محمد سکندر صاحب نے بتایا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کان اور دل وجان سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دیتی تھی، حالانکہ وہ نیند میں ہوتے تھے، حضرت شاہ صاحب کے خلیفہ جناب پیر ابو الخیر بوسیدنگی نے بتایا کہ ایک دفعہ میرا کلیجہ خلق میں اٹک گیا تھا (۱) اور میری حالت متغیر ہو گئی تھی، لیکن حضرت شاہ صاحب کی توجہ اور دم سے میں صحیح ہو گیا تھا، اور کلیجہ اپنی جگہ نصب ہو گیا تھا''۔(۲)

حضرت کے حلقۂ مریدان اور خلفاء میں خاصی تعداد کے علماء اور مشائخ وقت نظر آتے ہیں، ایسے ایسے کٹر علماء جن کے علم وتفقہ مسلم، جن کی تقوی شعاری معروف تھی، انہیں آپ کی روحانی کشش نے آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اس بارے میں حافظ محمد صدیق صاحب روایت کرتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کولاربیلوی لکھتے ہیں کہ (لگ بھگ ۱۹۳۰ء میں) ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پرامپورو کے عبدالسبحان رواسوگری کے گھر آئے اور نصیحت فرمائی، اس

---

(۱) حکماء اور طبیب حضرات بتا سکتے ہیں کہ کلیجہ خلق پر اٹک سکتا ہے تو کس طرح؟ میں نہ حکیم ہوں اور نہ طبیب، اس قسم کے حقائق سے واقف نہیں ہوں۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۸۳۔

میں میں بھی شریک تھا، چونکہ حضرت شاہ صاحب باقاعدہ عالم دین نہیں تھے، اس لئے حضرت شاہ صاحب کے متعلق میرے دل میں خلجان تھا، میں نے بغرض امتحان حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے چند سوالات کئے، انہوں نے تینوں (سوالات) کے تسلی بخش جوابات دیئے، یوں میں بھی ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا''۔(۱)

جس طرح عرض کی گئی ہے کہ حضرت شاہ صاحب سنت رسولؐ کے بڑے رسیا تھے، ساتھ ہی ساتھ بدعت وخرافات کے دشمن بھی، آپ نے سرزمین ارکان کے طول وعرض سے بدعت وخرافات کو بھگانے کے لئے بڑی حد تک کوشش کی، اس میں آپ ایک حد تک کامیاب بھی نکلے، آپ جہاں بھی گئے لوگوں کو سنت رسولؐ کی پابندی کی تلقین کی، اور مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی بدعتوں، غیر دینی رسموں، غیر شرعی رواجوں کا قلعہ قمع کر دیا تھا، یوں تو حضرت کی دیگر کرامات لوگوں کی زبانی سننے میں آئیں، راقم کے نزدیک آپ کی یہ ایک بڑی کرامت تھی کہ آپ نے سنت کا رواج دیا اور بدعت کا قسما خاتمہ کیا تھا۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے بیان کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے موضع صاحب بازار میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی، جس میں آپ کے نامور خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا زین العابدین والد مرحوم حضرت مولانا قاری بدر الاسلام نے درس دیا تھا، جہاں متوسطہ تک کی تعلیم ہوتی تھی، روایت کے مطابق اس مدرسہ کی بنیاد آپ نے لگ بھگ ۱۹۳۰ء میں رکھی، نہ جانے بعد میں اس مدرسہ کا کیا حال ہوا ؟

حضرت شاہ صاحب کے مریدین اور خلفاء نہ صرف ارکان میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ آپ کے بعض خلفاء ملک سے نکل کر دنیا کے دیگر گوشوں کو بھی اپنے نور ہدایت سے منور اور تاباں کیا تھا، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے اپنے علم کے مطابق چند خلفاء کے نام گنے ہیں تو میں ان مستعار لیتا ہوں:

(۱) حضرت مولانا زین العابدین صاحب بن حاجی محمد حنیف کولاربیلی۔

(۲) حضرت مولانا سعید اللہ صاحب کولاربیلی برادر مولانا زین العابدین۔

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۸۴، بحوالۂ حیات مولانا زین العابدین، ص: ۷۳، مولف مولانا قاری بدر الاسلام صاحب، صاحب زادۂ گرامی حضرت مولانا زین العابدین کولاربیلیؒ۔

(۳) حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کچھر بیلی۔

(۴) حضرت حاجی محمد حسین صاحب اکیابی۔

(۵) حضرت جناب محمد شفیع صاحب بوسیدنگی۔

(۶) حضرت پیر ابوالخیر صاحب بوسیدنگی۔

(۷) حضرت مولانا پیر محمد یوسف صاحب فرامپوری سابق استاد مدرسہ محمدیہ فرامپورو۔

حضرت کی ذات گرامی سے خلق خدا کو بہت ہی فائدہ پہنچا، آپ بڑے جاذب دل ونظر انسان تھے، لوگ آپ پر جان چھڑکتے تھے، آپ کے ہر قول وعمل کو دل وجان سے قبول کرتے اور مان لیا کرتے تھے، بالآخر ارکان کا یہ درخشاں ستارہ ایک طویل مدت تک ضیا پاشی کرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں فضائے ارکان سے چھپ گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب گدوسراوی

سرزمین ارکان کے مشہور ومعروف عالم دین حضرت مولانا محمد یعقوب بن شوکت علی صاحب کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، قدیم زمانے سے آپ کا خاندان ایک شریف اور علمی خاندان رہا ہے، آپ کے والد جناب شوکت علی صاحب ایک نیک دل اور پرہیزگار بزرگ تھے، اور والدہ ماجدہ بھی اطلاع کے مطابق ایک پارسا اور درویش صفت خاتون تھی۔

مولانا محمد یعقوب نے ابتدائی تعلیم علاقے میں حاصل کرکے اعلی دینی تعلیم کی امید پر ہندوستان کا سفر کیا، اور از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں جا داخل ہوئے، مولانا نے اس مادر علمی میں کتنے سال تعلیم حاصل کی اس کی صحیح صحیح معلومات نہ مل سکیں، البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت ضرور حاصل کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے دوران تعلیم آپ حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے حلقہ میں آنے جانے لگے تو حضرت مجدد ملت نے آپ کو اپنے حلقۂ مریدان میں شامل کرلیا، چنانچہ حضرت شیخ کے حلقہ بگوش ہوکر آپ نے تزکیہ واحسان اور تصوف وسلوک کے مراحل طے کئے تھے، فراغت تعلیم کے بعد آپ نے تھانہ بھون ہی میں قرآن کریم کا مکمل حفظ کرلیا تھا۔

مولانا فراغت کے بعد جب وطن واپس آرہے تھے تو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے انہی بہت ساری نصیحتیں کین، ان میں ایک دو یہ ہیں کہ:

> ’’تم جہاں کہیں بھی رہو دینی تعلیم اور درس وتدریس میں وقت گزارا کرو، دوسری یہ ہے کہ تم جب شادی کروگے تو تمہاری بیوی نے اگر ایک لڑکا جنا تو اس کا نام محمد یوسف ضرور رکھنا‘‘۔

مولانا محمد یعقوب نے اپنے شیخ کی نصیحت کا لحاظ رکھا، اور ہمیشہ درس وتدریس میں زندگی گزاری، اور جب پہلا لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام محمد یوسف رکھا، جو آگے چل کر حضرت مولانا محمد یوسف کے نام گرامی سے معروف ہوئے، جنہوں نے بھی اپنے زمانے میں دین اور علم دین کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، مولانا یوسف صاحب ایک جلیل القدر عالم اور فقیہ بنے تھے۔

راقم سطور سے حضرت مولانا سیف اللہ بن مولانا عبدالجبار صاحب گدوسراوی نے بتایا کہ مولانا حکیم

قاری محمد یعقوب سورتی سے مولانا محمد یعقوب ارکانی کے متعلق حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا کہ:

''یعقوب تو مادرزاد ولی ہے''

چونکہ مولانا قاری حکیم محمد یعقوب سورتی صاحب حضرت مولانا محمد یعقوب ارکانی کے دوست اور قریبی ساتھی تھے، دونوں طویل مدت تک تھانہ بھون میں ایک ہی ساتھ رہا کرتے تھے، اس لئے ان کی روایت کسی بھی گرفت وتنقید سے کم سے کم راقم کے نزدیک بالاتر ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کی چھ نرینہ اولاد تھیں، جن میں سے چار عالم دین بنے تھے:

(۱) حضرت مولانا محمد یوسف جو ماشاء اللہ عالم دین، حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ایک جلیل القدر معاملہ فہم مفتی بھی تھے، جس طرح عرض کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں ملت وقوم کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

(۲) دوسرا لڑکا حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب تھے، ان کے متعلق صحیح روایت ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۲ء کے بعد کسی جگہ پر مجمع عام سے حکومت برطانیہ کے خلاف اور تحریک آزادئ برصغیر کی حمایت میں تقریر کی، جس کی پاداش میں ان کو ۱۹۴۳ء میں لاہور میں گرفتار کرلیا گیا تھا، اور عرصۂ دراز تک راولپنڈی (حالیہ پاکستان) کے جیل خانے کی اندھیری کال کوٹھری میں غرق رکھتے ہوئے آخرکار حکومت برطانیہ کے غنڈوں نے گولی مار کر شہید کر دیا، یوں حضرت مولانا محمد یقوب صاحب کی اولاد میں ایک شہید، ایک محرک وقائد عالم دین بھی گزرے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سعادت بزور بازو نہیں مل سکتی، اللہ تعالی جس بندے کو چاہتا ہے ایسی سعادت عنایت کرتا ہے۔

(۳) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا تیسرا بیٹا حضرت مولانا محمود الرحمن صاحب بھی بڑے عابد و زاہد عالم دین بزرگ تھے، بہرحال وہ بھی ایک قابل قدر انسان تھے۔

(۴) اور چوتھا بیٹا حضرت مولانا محمد امین صاحب ایک مجذوب قسم کے بزرگ تھے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی یاد الٰہی میں گزار دی تھی۔

مولانا افلاطون لمبا گونوی منگڈوی سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی بیٹی جمیلہ کی شادی ہوئی تھی، حضرت مولانا کی یہ صاحب زادی اور داماد دونوں بڑی بلند صفات کے حامل تھے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب کو علاقے میں ''بوڑھا مولوی صاحب'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، آپ نے مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مدتوں درس دیا، اور منگڈو کی جامع مسجد کی ایک طویل مدت تک امامت وخطابت کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب ایک عابد، زاہد اور خدا ترس عالم دین اور خدارسیدہ بزگ تھے، کہتے ہیں کہ آپ سے بڑی بڑی کرامات بھی صادر ہوئیں، انتہائی سادہ لوح اور دنیا و مافیہا سے بے رغبت عالم دین تھے، مولانا پر زندگی کے آخری ایام میں فالج کا حملہ ہوا، اور طویل مدت مرض فالج کے شکار رہتے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد یونس جہادی شہید اولافوی

صدیق مکرم مولانا محمد یونس جہادیؔ بن مولانا عبدالشکور صاحب ۱۹۶۰ء میں بوسیدنگ ٹاؤن شپ کے گاؤں اولا فے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مولانا محمد یونس صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک عابد، زاہد اور قومی ہمدردی رکھنے والے بزرگ تھے، اور مولانا محمد یونس کے مطابق والدہ بھی نہایت پرہیزگار علماء وصلحاء کے وعظ ونصیحت سے نسبت رکھنے والی خاتون اسلام تھی۔

روہنگیا مسلمانوں کی عادت کے مطابق محمد یونس جونہی چلنے اور بولنے کے قابل ہوئے، انہی بستی کے مکتب میں بٹھادیا گیا، روشن ضمیر والد نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ساتھ ساتھ گاؤں کے سرکاری اسکول میں بھی داخلہ کروادیا، محمد یونس صاحب اسکول سے پرائمری پاس کرکے نکلے تو دیکھے گئے کہ مکتب میں قرآن کا ناظرہ اور ابتدائی اردو لکھنا پڑھنا اور بنیادی اسلامی عقائد اور طریقۂ عبادات بھی سیکھ چکے تھے، پھر محمد یونس نے اپنے والد کی خواہش پر فوئمالی میں واقع مدرسہ انوار العلوم میں داخلہ لیا اور درجۂ اولی اور ثانیہ کے امتحانات امتیازی نمبرات سے پاس کئے، وہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۷ء تک دابری چنگ کے مدرسہ میں پڑھے، بعد میں ارکان کے مایۂ ناز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فوئمالوی سے بعض مضامین پڑھے تھے۔

۱۹۸۰ء میں محمد یونس مدرسہ معین الاسلام اولا فے میں زیر تعلیم تھے، اچانک خبر ملی کہ دابری چنگ میں ایک معزز مسلمان کو برمی فوج نے وحشیانہ بربریت سے شہید کردیا، محمد یونس اس جنازہ میں حاضر ہوئے، اور اس وحشیانہ مظالم نے ان کے دل ودماغ کو بہت متاثر کیا، چنانچہ انہوں نے اپنے ہم راز دوست مولانا محمد سلیم صاحب سے مشورہ کرکے بالآخر جہاد اسلامی کی راہ لی، دونوں دوست یکم /فروری/ ۱۹۸۰ء کو مسلسل پانچ روز سفر کرکے دشوار گزار پہاڑی راستوں، پرخطر جنگلات اور بیابانوں کو عبور کرتے ہوئے اس وقت کی روہنگیا مجاہدین کی تنظیم روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے معسکر میں پہنچے، اور تنظیم کے سربراہ وقائد محترم محمد جعفر حبیب سے ملاقات کی، اور انہیں اپنی آمد کی غرض بتائی، چنانچہ قائد محترم نے ان کے جذبات سے متاثر ہوکر دونوں کو مجاہدین میں شامل کرلیا تھا۔

محمد یونس روہنگیا فدائین محاذ (RPF) میں پورے چار سال زیر تربیت رہے، گوریلا جہاد کی ممکنہ

تربیت حاصل کرلی، تربیت کے سلسلے میں لیبیا بھی گئے، وہاں سے بری اور بحری کمانڈو کی خصوصی تربیت لی، بعد میں ار پی ایف میں افراتفری کے نتیجے میں انتشار پیدا ہوا تو انہوں نے بعض خیر اندیشوں کے مشورے سے اپنی چھوڑی ہوئی بقیہ تعلیم مکمل کرلی، چنانچہ مدرسہ مظاہر علوم چاٹگام اور مدرسہ ضمیریہ پٹیہ میں چندسال پڑھ کر متداول نصاب تعلیم کی تکمیل کے بعد سند فراغت حاصل کرلی تھی۔

اس پڑھائی کے دوران محمد یونس صاحب نے اتحاد الطلاب المسلمین (ITM) کی دعوت قبول کرلی، اور بہت جلد وہ بنگلادیش برانچ کے صدر منتخب ہوگئے، تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی مسلسل محنت اور کوشش کے ذریعے ائی ٹی ایم کو ایک مستقل روہنگیا طلبہ کی نمائندہ تنظیم بنادیا۔

محمد یونس روہنگیا زبان کے اچھے خطیب تھے، ضابطے کے حافظ القرآن نہ ہونے کے باوجود قرآن کریم کا بڑا حصہ ان کو یاد تھا، یہی حال احادیث نبویؐ کا بھی تھا، وہ تربیت گاہوں میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے، خاص طور پر جہاد اسلامی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد دستور کے مطابق وہ اتحاد الطلاب المسلمین (ITM) سے بھی فارغ ہوگئے، اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں ایک عام مجاہد کی حیثیت سے روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے شعبۂ جہاد سے منسلک ہوگئے، ان کی خداداد صلاحیت، علمی قابلیت جسمانی موزونیت، عسکری تربیت، حربی مہارت، فنی خصوصیت اور قیمتی تجربات نے اس تنظیم میں انہی جلد نمایاں مقام پر فائز کردیا، اور جلد ہی کمانڈر، پھر پلاٹون کمانڈر اور آخر میں کمپنی کمانڈر بن گئے تھے۔

مولانا محمد یونس موزون الطبع بھی تھے، اردو میں اشعار بھی کہا کرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ جہادی ان کا تخلص تھی، دراصل وہ ایک ہفت خواں یا ہفت زبان کے مالک شخصیت تھے، اردو ان کی پڑھنے لکھنے کی زبان اور عربی، فارسی، برمی، اور بنگلہ زبانیں بھی کم وبیش لکھ پڑھ، بول اور سمجھ لیتے تھے، رہی روہنگیا زبان تو خیر ان کی اپنی مادری زبان ہی تھی۔

مولانا محمد یونس نے تعلیم سے فراغت کہ بعد معسکر میں قیام اور تدریب کے دوران ہی نکاح کی سنت ادا کی، ان کی ایک عالم دین مولانا ابوالحسین صاحب کی بیٹی سے شادی خانہ بادی ہوئی، ایک بچی ان کی یادگار رہے، خدا عمر دراز کرے۔

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (R S O) نے ۲۷/ا پریل/ ۱۹۹۴ء میں دھاکہ خیز

کارروائیوں سے اندرونِ ارکان باقاعدہ جہاد کا آغاز کیا، ویسے مولانا محمد یونس تنظیم کے اعلیٰ سطحی فیصلے کے تحت ۲۸ / اپریل/ ۱۹۹۴ء کو اپنی کمپنی کے ساتھ جنوبی منگڈو کے علاقے میں مقررہ ٹھکانے پر پہنچ گئے، اگلے دن انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر دشمن کے خلاف چھاپہ مار گوریلا کارروائیاں شروع کر دیں، دشمن کی چوکیوں پر اچانک شب خون مارتے اور اس کو بھاری جانی و مالی نقصان پہنچاتے اور اس کی گزرگاہوں پر بارودی سرنگیں بچھا دیتے تھے، علاوہ ازیں گزرنے والے فوجی قافلوں پر گھات لگا کر حملے کر کے سب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کیا کرتے تھے، خواہ دشمن کے پاس نفری اور ساز وسامان کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن مولانا نے بھاگنا اور پسپا ہونا سیکھا ہی نہیں تھا، مقابلے میں ہمیشہ دشمن کو ہی جہنم رسید یا پسپا ہونا پڑتا رہا تھا، ویسے مولانا محمد یونس جہادی صاحب کا یہ جہادی سلسلہ بہت دن تک جاری رہا، اس کے بعد ۲۵ / جون/ ۱۹۹۴ء کو مجاہدین نے جنگل میں پڑاؤ ڈالا، ایک روز جہادی صاحب خود دو مجاہدین کو ساتھ لے کر جنوبی منگڈو کے قصبہ علی تانجو کی بستی ہونسرا کی طرف نکل گئے، تاکہ دشمن کی نقل وحرکت کا جائزہ لے سکیں، بستی کے قریب کچھ لوگ ملے، تھوڑی ہی دیر میں بستی کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے، جہادی صاحب نے انہیں جہاد فی سبیل اللہ، اقامت دین اور آزادی کا درس دینا شروع کر دیا، اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ دشمن کے مقابلے کرنے اور حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کرنے میں لگ گئے تھے۔

اب ایک منافق نے موقع سے فائدہ اٹھا کر قریبی برمی فوجی چھاونی کو خبر دی، سو سے زائد برمی فوجی بھاری اور ہلکے ہتھیاروں سے لیس ان تین مجاہدین کے مقابلے کے لئے آتی ہوئی نظر آئی، عوام میں سے کسی نے کہا ارے او میاں دیکھو تو سہی برمی فوج ادھر آرہی ہے، یہ سن کر جہادی صاحب نے جواب دیا، کہ آنے دو، انشاء اللہ تعالیٰ یہاں بھی ہم چند لاشیں ڈھیر کر دیتے ہیں، اس کے بعد عوام سے کہا کہ تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ، پھر خود دونوں مجاہد ساتھیوں کے ساتھ ایک قریبی گڑھے میں جا کر پوزیشن سنبھال لی، اور دشمن کے اقدام کے انتظار کئے بغیر تینوں نے ایک ہی ساتھ ان پر فائر کھول دی، خود نشیب میں ہونے کی وجہ سے دشمن کی گولی انہیں نہیں لگ رہی تھی، دشمن نے باآواز بلند انہیں ہتھیار ڈالنے کو کہا، مگر انہوں نے گولیوں، تکبیروں اور دستی بموں سے اس کا جواب دیا، اب دشمن نے وہی بزدلانہ حربہ استعمال کیا، جو پہلے بھی چند مواقع پر استعمال کیا گیا تھا، مقامی

مسلمانوں کو ان کے گھروں سے پکڑ کر نکالا گیا، مرد، عورت، بوڑھے، بچے کی تمیز اور پرواہ کئے بغیر ان سب کو ڈھال بنا کر آڑ کے طور پر استعمال کیا گیا، اور ہر فوجی نے ایک مسلمان کو آگے کر کے اس کے کندھے پر اپنی بندوق رکھی، اور اس طرح آگے بڑھنا شروع کیا تھا، ساتھ ہی ساتھ برمی اور مگھ دشمن فائرنگ بھی کرتے گئے، اب یہ تینوں مجاہدین کرتے تو کیا کرتے؟ گولی چلاتے اور مقابلہ جاری رکھتے ہیں تو اپنے ہی معصوم، بے گناہ اور مظلوم مسلمان بھائی بند ناحق مارے جاتے ہیں، یہ صورت حال دیکھ کر یونس جہادی اور ان کے دونوں مجاہد ساتھی اپنے گڑھے والے مورچے سے ہتھیار سمیت باہر نکل آئے اور بزدل برمی فوج کی اس ظالمانہ اور غیر انسانی شرمناک حرکت پر انہیں زور سے براہ راست مخاطب کر کے لعن طعن اور ملامت کرنا شروع کر دیا، کہا کہ یہ کیسی بہادری ہے؟ اور تم کس قسم کے فوجی ہو؟ جنگ کی بھی کچھ اخلاقیات ہوتے ہیں، کچھ حدود، اصول اور قوانین بھی ہوتے ہیں، ابھی یہ للکار جاری تھی کہ منصوبہ کے مطابق دشمن نے پشت سے مشن گن کے برسٹ مار کر ان تینوں کو شہید کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بلا شبہ محمد یونس جہادی شہید اور ان کے ساتھ اور پہلے اور بعد میں شہید ہونے والے ار ایس او کے مجاہدین نے ایسے سفاک دشمن دین وایمان سے مقابلے کی ہمت کی جو مادی قوت اور تعداد میں ان سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں گنا بڑھ کر تھے، اور بالآخر لڑتے لڑتے اپنی آخری پونجی نقد جان بھی راہ خداوند میں لٹادی، اب بھلا ان کے ایمان واخلاص، جذبۂ شہادت اور غیرت ایمانی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مولانا محمد یونس جہادی شہید اور تمام شہداء اور جملہ مجاہدین کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔

مولانا محمد یونس جہادی کی طبیعت اور مزاج میں نرمی اور گرمی دونوں کا حسین امتزاج تھا، وہ اطاعت امیر کے ساتھ نظم وضبط کے شدید پابند تھے، ان کے اندر میرا جہاں تک اندازہ اور مشاہدہ ہے کہ مضبوط ایمان، عشق خداوندی کے ساتھ رسول انسانیت ﷺ کی اطاعت اور آپ ﷺ سے شدید محبت تھی، ان میں فرائض کا التزام اور نوافل کا بڑا اہتمام تھا، حق گوئی اور بے باکی میں وہ یکتائے روزگار تھے، وعدے کے پکے اور عہد کے سچے تھے، ان تمام اعلیٰ صفات کے علاوہ بہادری اور دلیری ان میں بھری ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب تلبنوی

مولانا مستفیض الرحمن صاحب جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی تلبنیہ میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ مولانا کے والد بہت ہی نیک اور خداترس بزرگ تھے، اور والدہ بھی ایک عابدہ اور پارسا خاتون تھی۔

ظاہر ہے کہ مولانا کا نام مستفیض الرحمن تھا، لیکن آپ کو اسی نام گرامی سے بہت کم لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں، طلبۂ مدارس دینیہ، علمائے کرام اور خواص حضرات تو اپنی جگہ بلکہ عوام الناس بھی انہی حضرت ناظم صاحب کے بطور یاد کرتے تھے اور اب بھی یاد کرتے ہیں، اس بارے میں مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اور ناظم بھی ایسے بنے کہ لفظ ناظم مولانا کے اسم مبارک کا جزو لاینفک بن گیا، جس طرح شمالی منگڈو کے مشہور عالم دین مولانا میر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم کراچی کے مولانا سبحان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مظاہر علوم سہانپور کے مولانا مفتی مظفر حسین صاحب بھی ناظم کے مبارک نام سے مشہور ہیں''۔(۱)

ناظم صاحب حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب کس کس دینی درسگاہ میں تعلیم پائے، اس کی تفصیلات تادم تحریر کوشش کے باوجود نہیں مل سکیں (۲)

مولانا نے فراغت کے بعد مدرسہ امداد العلوم علی تانجو میں ابتدائی مدرس کی حیثیت سے تعلیم دینی شروع کی، اس مدرسہ کی تعمیر و تاسیس کے حوالے سے اتنی سی روایت ملی ہے کہ آپ اس مذکورہ مدرسہ کے موسسین میں سے تھے، چنانچہ مولانا حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارکانی برادری بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے جو گرانقدر امور انجام دیئے وہ تا قیامت آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں، مدرسہ امداد العلوم علی تانجو کی تعمیر اور تاسیس میں مولانا صدیق صاحب کے ساتھ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۵٤۔

(۲) مولانا سیف اللہ گدوسراوی نے بتایا کہ مولانا نے ابتدائی تعلیم علاقے میں پاکر متوسطہ دارالعلوم چندن پورہ چاٹگام میں پائی، اسکے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، بالآخر فراغت مدرسہ امینیہ دہلی سے ہوئی تھی۔

حضرت کا بھی عمل دخل تھا، انوار العلوم انڈانگ کے بانی تو مولانا عبد الجبار شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے، لیکن اس کو اوج ثریا تک پہنچانے میں مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی خداداد صلاحیت بھی کارفرما تھی، حضرتؒ عرصۂ دراز تک اس عظیم ادارے کے مدیر تھے''۔(۱)

پھر مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کی بنیاد پڑی تو دوست واحباب اور اساتذۂ مدرسہ کے شدید اصرار اور تقاضے پر آپ یہاں منتقل ہو گئے، جلد ہی آپ کی خداداد قابلیت، خلوص وللّٰہیت اور ذاتی محنت کو سراہتے ہوئے موسسین مدرسہ نے آپ کو ''نظامت اعلیٰ'' کا عہدہ اور منصب سپرد کیا، تب سے آپ ایسے ناظم صاحب مشہور ہو گئے کہ لوگ آپ کے اصل نام گرامی بھی بھول گئے تھے۔

ناظم صاحب نے نہایت اخلاص وللّٰہیت اور شدید محنت ومشقت سے کام لیتے ہوئے مدرسۂ نور اللہ فارہ کی تعمیری اور تعلیمی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا، ابتدائی مراحل سے ترقی دے کر رفتہ رفتہ دورۂ حدیث تک پڑھانے کا اعلی انتظام کیا، ملک کے گوشے گوشے سے طالبان علوم نبوت آکر داخلہ لیتے گئے، اور منتہی طلبہ یہاں سے اعلی تعلیم کے لئے برصغیر میں پھیل گئے، اس طرح مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کی شہرت ہندوپاک، بنگلہ دیش اور برما میں پھیل گئی تھی۔

مولانا بعد میں اس درسگاہ کے مہتمم بھی رہے تھے، جبکہ سرپرست اعلی مولانا اسد اللہ صاحب فیاضی فاروی/گرجنڈیاوی تھے، مہتمم ہونے کے بعد آپ نے ملک کے چنیدہ، جید اور محنتی علماء کو مدرسہ میں تعین کیا، پھر ۱۹۵٦ء میں دورۂ حدیث کا افتتاح کیا، چنانچہ آپ نے مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں کا پہلا شیخ الحدیث مقرر کیا تھا۔

اس مدرسہ میں تحفیظ القرآن کا شعبہ بھی مولانا نے قائم کیا تھا، جس کا پہلا استاد حافظ محمد (قطروالے) تھے، البتہ ان کی ہجرت کے بعد حافظ حبیب اللہ صاحب سنبوی کو تعین کیا گیا تھا، جنھوں نے اس شعبہ کا انتظام خوب سنبھالا تھا۔

علاوہ ازیں مولانا نے برمی زبان کو تعلیم کا مستقل اور لازمی حصہ قرار دیا، ناظم صاحب نہایت دوراندیش، علم وعلماء دوست، سیاسی اور ترقی کے حریص انسان تھے، آپ نے مدرسہ کی ترقی وتطویر کے

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۵٤۔

سلسلے میں پہلے ایک انتظامی کمیٹی بنائی، پھر ایک امدادی کمیٹی بھی تشکیل دی، جس کے صدر چوہدری نجومیاں تھے، ناظم صاحب نے دیگر اساتذہ کے تعاون سے اس مدرسہ کو ایسی مرکزیت عطا کی کہ عرصۂ دراز تک اس مدرسہ کو ''ام المدارس ارکان'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا، ہزاروں حفاظ کرام اور علمائے عظام اس دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر کے ملک بھر میں دینی، قومی اور سماجی امور انجام دے رہے ہیں۔ حضرت ناظم صاحب کے اندر کورانہ تقلید محض اور جمود نہیں تھا، مصالح عامہ آپ کے پیش نظر رہتا تھا، دور بینی اور کشادہ نظری آپ کی خاص سنت تھی، آپ مقاصد اور ذرائع کا باہمی فرق اور تعلق کو خوب خوب جانتے اور پہنچانتے تھے، عصری تقاضے کا بھی آپ کو شعور تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مدرسہ میں برمی زبان کو شروع ہی سے لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا انتظام کیا، چنانچہ برما کا پہلا وزیر اعظم مسٹر اونو ایک مرتبہ شمالی ارکان کے دورہ پر آیا تو مدرسہ اشرف العلوم میں حاضر ہو کر حضرت ناظم صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا، اور قرآن مجید کا ایک نسخہ اور ایک ریڈیو سیٹ اپنے ہاتھ سے بطور ہدیہ پیش کیا تھا، چنانچہ اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کا اثر اور دخل تھا کہ اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر اونو صاحب مدرسہ میں آئے، اور مولانا کو نہ صرف شاباشی دی بلکہ ایک ریڈیو سیٹ اور قرآن پاک کا نسخہ ہدیہ دیا، ویسے بھی انسان جس ملک میں رہتا ہے، اس کی بولی سیکھنا اور جاننا ضروری ہے''۔(۱)

جمعیت علمائے اسلام برما کے سابق صدر مولانا محمد ابراہیم مظاہری مرحوم، مفتی محمود رنگونی صاحب، اور امیر جماعت تبلیغ برما حضرت مولانا الحاج محمد صالح صاحب مظاہری کے ساتھ حضرت ممدوح کا نہایت دوستانہ اور گہرا تعلق رہا، چنانچہ یہ حضرات رہ رہ کر اس مدرس میں تشریف لایا کرتے اور ناظم صاحب کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، اس میں شک نہیں کہ یہ حضرات آپ کی خدمات دینیہ وقومیہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت مولانا ممدوح اپنے مزاج کے مطابق اس قافلہ سخت جان کی بھی مدد، تعاون اور حوصلہ افزائی کر رہے تھے، جنہوں نے آزادی کے شوق سے شمع جہاد روشن کی تھی، چنانچہ اس حوالے سے مولانا حافظ محمد

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۵۴۔

صدیق نے بہت خوب لکھا ہے کہ:

> ''مجاہدین ارکان (حضرت مولانا محمد جعفر حسین قوال) کی تحریک کا اگر پتہ لگایا جائے، اور ان کی پشت پناہی اور ہر ممکن مدد کرنے والوں کی فہرست بنائی جائے تو مولانا (مستفیض الرحمن صاحب) کا مبارک نام سر فہرست آئے گا، یہی وجہ تھی کہ مجاہدین ارکان کا پہلا جلسہ (بس مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے مطابق) مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں مولانا کی زیر صدارت منعقد ہوا، شاید یہی وجہ ہو کہ برمی حکومت نے ۱۹۴۹ء کے لگ بھگ مدرسہ اشرف العلوم میں آگ لگادی تھی، جس سے مدرسے کے بہت سے کمرے جل گئے تھے''۔(۱)

حضرت ناظم صاحب طلبہ اور اساتذہ کی نظر میں ایک شفیق مربی کی حیثیت رکھتے تھے، اوقات کے اتنے پابند تھے کہ ایام مشیخیت میں بھی مدرسہ میں وقت سے پہلے حاضر ہو جایا کرتے تھے، جس پر جوان اساتذہ بھی رشک کرتے تھے، دار الطلبہ میں رات کی نگرانی خود کرتے اور غیر حاضر وشریر طلبہ پر خاص نظر رکھتے تھے، مولانا ایک خوددار، غیرت مند عالم دین، لائق استاد ومعلم، مدیر ومنتظم، زیرک اور ذہین انسان تھے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گزار دی تھی۔

۱۹۷۴ء کے اواخر میں بعض نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر آپ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ سے مستعفی ہو گئے تھے، اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۶ء کے دوران ماڈل عربی مدرسہ عالیہ شقدار فارہ چلے گئے، تو یہاں بھی نہایت محنت اور لگن سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، آپ ہمیشہ اساتذہ اور طلباء کے مرکز عقیدت بنے رہے، اس استعفی کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''مولانا کی انتھک کوشش کے نتیجے میں جب مدرسہ ہذا (اشرف العلوم) دیوبند ثانی بن گیا تو اندر سے سازش شروع ہوگئی، چنانچہ مولانا ۱۹۷۵ء میں مستعفی ہو گئے، مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ شقدار فارہ کے مدرسہ کے مہتمم رہے، اور مدرسہ کو ظاہری و باطنی اعتبار سے رونق بخشی، لیکن ظالموں نے انہیں یہاں بھی ٹکنے نہ دیا، حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ شقدار فارہ کے جس مکان (مدرسہ کی مشرقی جانب) میں رہتے

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۵۵۔

تھے اس میں آگ لگنے کی وجہ سے پورا مکان خاکستر ہوگیا تھا‘‘۔(۱)

ناظم صاحب نے تعلیمی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ روہنگیا مسلمانوں کو سنبھالا دینے کے لئے وقت کے مثقفین اور سیاستدانوں کے ساتھ مل کر شاندار خدمات انجام دیں، مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنی حریف قوم مگھوں کے ساتھ کئے گئے معاہدوں میں شریک ہوئے، جن سے امن وامان قائم رکھنے اور دونوں قوموں کی حفاظت میں کافی مدد ملی، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے کچھ حصے ایسے ہیں، جن کے فوائد بھی ہیں اور ان سے اختلاف میں ممکن ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات مستعار میں مالی فائدے کے تحت بعض امور میں مگھوں سے بھی معاہدے کئے، جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے کئے تھے‘‘۔(۲)

موصوف مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے شدید نالاں اور برگشتہ تھے، آپ نے قومی یکجہتی کے لئے اپنی زندگی میں کافی کوششیں کیں، مگر ناکامی سے دوچار ہوئے، بعض روایت کے مطابق کچھ حالات ایسے بھی ہیں جنہیں موجودہ حالت کے پیش نظر صیغہ راز میں ہی رکھنا بہتر ہے، آپ معروف معنوں میں کوئی ماہر نفسیات تو نہیں تھے لیکن اپنی فراست ایمانی کے ذریعے لوگوں کی نفسیاتی باریکیوں کو تاڑ لیا کرتے تھے، مدارس اسلامیہ سے دلی لگاؤ، طلبہ اور اساتذہ سے محبت، انسانیت سے ہم دردی اور خیر خواہی آپ کی فطرت میں داخل تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ آپ کی خدمات کو مخالفین بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی جانفشانی اور قربانی کے اعتراف کرنے پر ہر ایک لوگ گویا مجبور تھے۔

مولانا سیف اللہ صاحب بن مولانا عبدالغفار گدوسراوی نے راقم السطور کو بتایا کہ مولانا موصوف علمائے دیوبند کے بڑے مداح اور معترف تھے، خاص طور پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے شدید متاثر تھے، حضرت تھانوی کی بہت ساری تصانیف آپ نے مطالعہ کیں، اور فرمایا کرتے تھے کہ دراصل علم کی روح علماء دیوبند کی تعلیم وتربیت سے حاصل ہوتی ہے، مزید یہ بھی فرماتے تھے کہ علمائے دیوبند کی تعلیم وتربیت اصل میں سینے سے سینے میں منتقل ہوا کرتی ہے۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۵۵۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۵۵۔

مولانا مستفیض الرحمن صاحب نے اپنی آخری عمر میں اپنی آبائی بستی نلبنیہ میں ایک ابتدائی مدرسہ اور اس سے ملحق ایک حفظ خانہ بھی قائم کیا تھا، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

’’آخری عمر میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے محبوب علاقہ میں ایک ابتدائی مدرسہ اور حفظ خانہ کی بنیاد رکھی تھی، جس میں راقم کے والد محترم مولانا حسن علی کلیجہ بھانگوی داماد جناب اولو بلی نلبنوی (یہ والد محترم کی دوسری شادی تھی) مدرس تھے، راقم الحروف نے ایک خط میں والد محترم سے درخواست کی تھی کہ آپ مولانا سے میرا تذکرہ کریں، اور اپنی سوانح عمری لکھ کر دینے کی فرمائش کریں، لیکن مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر میرا مطالبہ مسترد کردیا تھا کہ گمنامی اچھی ہے، جس طرح چھلکے کے اندر کیلا اچھا ہے، یہی جواب والد محترم کا بھی تھا، اس لئے نہ والد محترم نے مجھے اپنی کوئی سوانح عمری لکھ دی اور نہ مولانا نے‘‘۔(۱)

عرض سرزمین ارکان کے یہ نامور انسان بہت سے کارنامے اور خدمات اپنے پیچھے چھوڑے رجب/ ۱۴۱۵ھ بمطابق دسمبر/ ۱۹۹۴ء کو انتقال کرگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت ممدوح اگر چہ دنیا سے رخصت ہوکر آخرت کی پہلی منزل میں آرام فرما ہیں، مگر آپ کی خدمات جلیلہ اور بہت سی یادگاریں لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ ہیں اور تازہ رہیں گی، انسان کے اندر نقائص و عیوب بہت سے ہوتے ہیں، مگر حضرت مرحوم کے اکثر کارنامے ایسے ہیں، جو آپ کے نام نقائص اور عیوب کو انسانوں کی نظروں سے اوجھل کردینے کے لئے کافی ہیں، اور جب تک مدرسہ اشرف العلوم قائم رہے گا، تب تک مرحوم کا نام ایک خاص دینی خادم کے بطور زندہ اور تابندہ رہے گا، انشاء اللہ تعالی۔

ذیل میں حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب کے کچھ اقوال ذرین مولانا حافظ محمد صدیق صاحب سے مستعار لے کر یہاں درج کررہا ہوں:

(۱) ہڑو اور جڑو سے بحث کرنا (الجھنا) اپنی عزت کو داؤ پر لگانا ہے، ہڑو اور جڑو دونوں کے معنی قریب قریب ہیں، یعنی ٹال مٹول کرنے ولا، ہیرا پھیری کرنے والا اور لیت ولعل سے کام لینے والا۔

(۲) کسی کو شوریدہ زمین خریدنے کا مشورہ دینا اس کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۵۶۔

(۳) مقدمات میں احمقوں کے ساتھ ہونا اپنی شکست کا سامان کرنا ہے۔

(۴) سخت مجبوری کے بغیر کسی کو نکاح ثانی پر اکسانا اسے ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

(۵) مولانا کی اہلیہ کے انتقال کے بعد مولانا تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے، پہلے جیسے نظم وضبط معمولات زندگی میں نہ رہ پایا تو لوگوں نے نکاح ثانی کا مشورہ دیا، تو آپ نے مزاحایہ شعر پڑھا کہ:

ہر کہ زن ندارد آسائش تن نہ دارد

ہر کہ برادر ندارد قوت باز و ندارد

مولانا مدرسہ میں جس دن سالانہ چھٹی کا جلسہ قائم ہوتا، سب طلبہ کو جمع کرتے اور ان کے فراق میں روتے اور نصیحتیں کرتے جاتے تھے، اور فرماتے کہ:

(۱) جس نے اپنی نفس کو پہنچانا، اس نے اپنے رب کو پہنچانا۔

(۲) اپنے آپ کو رذیل اخلاق سے دور رکھو۔

(۳) مطالعہ ومراجعۂ کتب اربعہ جو نحو وصرف کے لئے اساسی حیثیت رکھتی ہیں (صرف میر اور پنج گنج وغیرہ) کے مطالعہ پر مداومت رکھو۔

(۴) محنت ومشقت صبر کے ساتھ کرو۔

(۵) اساتذۂ کرام کی تعظیم وتوقیر میں کوتاہی مت کرنا۔

(۶) تواضع اور انکساری کو اپنی زندگی کا حصہ بنالینا، اس لئے کہ علم کا حصول تواضع کے بغیر ناممکن ہے۔

(۷) تقرب الی اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بناؤ۔

(۸) اپنے بھائیوں، اہل وطن اور تمام انسانوں کی نفع رسانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو۔

(۹) تم سب طالب علم اس مدرسہ کے سفراء ہو، اپنی بستیوں اور شہروں میں اسلام کی دعوت پھیلاؤ۔

(۱۰) دین اسلام پر خود بھی عمل کرو اور اوروں کو بھی عمل کی ترغیب دلاؤ۔

حضرت مولانا مظہر الحق صاحب باغکونوی بوسیدنگی

دور آخر میں سرزمین ارکان کے جلیل القدر عالم دین، گمنام شیخ طریقت حضرت مولانا مظہر الحق صاحب کی پیدائش ۱۸۹۹ء میں جنوبی بوسیدنگ کی بستی باغگونہ میں ہوئی، آپ ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے والد زمیندار بھی تھے اور گاؤں کے معزز ترین سردار بھی، آپ کا چھوٹا بھائی جنرل میر احمد صاحب مرحوم ۱۹۴۲ء کے معرکۂ کرب وبلا کے شہسوار اور عظیم مجاہد لیڈر تھے، جو بعد میں تشکیل شدہ اسلامی ریاست شمالی مغربی ارکان میں بوسیدنگ ٹاؤن شپ کے سپہ سالار بھی رہ چکے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب سے شروع ہوئی، بعد میں اعلی اسلامی تعلیم کے حصول کے لئے والدین کی آرزو، تمنا اور خواہش پر ہندوستان کا سفر کیا، اور اس وقت کی نامور درسگاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جا داخل ہوئے تھے۔

کلکتہ میں آپ نے تقریباً آٹھ نو سالوں تک تعلیم حاصل کی، نہایت تیز اور ذہین وفطین طالب علم تو تھے، لیکن نہ جانے کس وجہ سے کہ جماعت سیوم یا دوم (عالمیت) تک پڑھائی کے بعد وطن واپس لوٹ آئے تھے۔

فراغت تعلیم کے بعد حضرت مولانا مظہر الحق صاحب نے وطن میں چند سال گزار کر رنگون کا سفر کیا، آپ کے ساتھ آپ کا چھوٹا بھائی جنرل میر احمد صاحب بھی تھے، دونوں بھائی تقریباً ۱۹۳۷ء تک وہیں رہے، وہیں دونوں بھائیوں نے نجی تجارت کو فروغ دینا چاہا مگر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکے تھے۔

۱۹۳۷ء کے دوران برما میں قومی عصبیت کی ایک آگ بھڑک اٹھی تو دونوں بھائیوں نے پھر وطن واپس لوٹ آنے کو مناسب سمجھا، یوں وطن واپس آ کے اپنی موروثی زمینداری سے دلچسپی لینی شروع کر دی۔

بستی باغگونہ میں آپ کے گھر کے قریب خاندان کی تعمیر کردہ ایک پرانی مسجد آباد رہی ہے، اس میں مولانا خطیب مقرر ہوئے، جس میں آپ جمعہ کے خطبہ کے علاوہ عوام الناس کو اپنے علم وعمل کے ذریعے مستفید کرتے رہے تھے۔

مولانا مظہر الحق صاحب ایک جید عالم اور معنی کے واعظ بھی تھے، دور دراز کے علاقوں سے لوگ آپ کو دعوت دیتے اور محفل وعظ ونصیحت کو آراستہ کرنے کی فرمائش کرتے تھے، علاوہ ازیں فتاوی نویسی کے کام بھی کرتے تھے، نہ صرف عوام بلکہ علمائے کرام بھی بعض مسائل کے حل کے لئے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے، تاہم آپ اگر کسی معرکۃ الآراء مسئلہ میں پھنس جاتے تو فوراً شیخ الحدیث حضرت مولا

نا سلطان احمد صاحب فوئمالوی کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے، آپ مولانا سلطان احمد صاحب کو ایک جید الفکر اور معیاری عالم دین مانتے تھے۔

مولانا مظہر الحق صاحب بڑے غصیلے، لسان، تیز وطرار لیکن مستعد عالم دین تھے، یوں تو مجلس میلاد سے کافی دلچسپی رکھتے، لیکن بدعات وخرافات جو عوام الناس کی عام زندگی کو متاثر کررہی تھی ان کے خلاف سخت مزاحمت کیا کرتے تھے۔

مولانا مظہر الحق صاحب حضرت مولانا حافظ حامد حسین صاحب علوی اعظم گڑھی کے مرید تھے، لیکن حضرت حافظ صاحب کی ایماء پر آپ کو خلافت حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی گودام فاری کی طرف سے ملی تھی۔

مولانا مظہر الحق صاحب ایک مبصر سیاست دان بھی تھے، ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر بڑی دل چسپی کے ساتھ خاصی نظر رکھتے تھے، آپ اپنے زمانے کی بہتوں مجالس اور محفلوں کے صدر نشین بھی رہ چکے ہیں، عالم اسلام اور بطور خاص فلسطینی مسلمانوں کی زبوں حالی پر ہمیشہ تڑپتے رہتے تھے، مولانا نے اپنی مستعار زندگی میں ارکانی مسلمانوں کی بہت ساری خدمات انجام دے کر ۱۹۸۲ء میں انتقال کیا، اور اپنی آبائی قبرستان جو آپ کی آبائی جامع مسجد کے بغل میں ہے اس میں مدفون ہیں۔

میرا حقیقی نانا جان جناب مفضل احمد صاحب مرحوم حضرت مولانا مظہر الحق صاحب کا بھانجہ تھے، آپ مولانا کے دست راست اور سفر وحضر کا ساتھی تھے، چنانچہ آپ نے اپنے نامور ماموں کا زندگی بھر ساتھ نبھایا، مولانا جہاں کہیں بھی جاتے آپ کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کے چار بیٹے تھے، بالترتیب یہ ہیں:

(۱) جناب ابوطیب مرحوم: وہ ایک دانشور تھے، سیاست سے قدرے دل چسپی بھی رکھتے تھے۔

(۲) ابوطاہر: جو ایک ڈاکٹر تھے، عرصۂ دراز تک بوسیدنگ شہر میں رہائش پذیر رہ کر آپ نے وہیں انتقال کیا۔

(۳) مکارم: انہوں نے قدرے قلیل عصری تعلیم حاصل کی تھی، قومی ثقافت سے ان کو کافی دل چسپی تھی۔

(۴) مولانا کی اولاد میں حضرت مولانا علی جوہر صاحب ایک جید عالم دین اور قابل قدر معلم ومدرس گزرے ہیں، جن کی مختصر سوانح زندگی میری اس حقیر کاوش کی زینت بنی ہوئی ہے۔

کمانڈر مولانا محمد مظہر صاحب حائندہ فاروی

دور آخر میں ارکانی مسلمانوں کی تحریک آزادی میں شامل مرد مجاہد مولانا محمد مظہر صاحب کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں بستی حائندہ فارہ منگڈو میں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب ایک عابد وزاہد اور علماء و صلحاء سے لگاؤ رکھنے والے بزرگ تھے، اور آپ کی والدہ بھی ایک نیک سیرت خاتون تھی۔

مولانا محمد مظہر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے مکتب میں پاکر منگڈو کے سرکاری اردو اسکول میں آٹھویں/نویں جماعت تک تعلیم پائی، اس کے بعد مدرسہ میں داخل ہوئے، اور سند فراغت حاصل کی تھی۔

کہتے ہیں کہ مولانا بڑے خوش آواز تھے، شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کے نغموں اور غزلوں سے خاص دل چسپی رکھتے تھے، سجی سجائی محفلوں میں حضرت علامہ کی غزلیں سنا سنا کر لوگوں کو مخمور اور مسحور کیا کرتے تھے، علاوہ ازیں بڑے جہاں دیدہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے دیوانے اور شہادت کے حوالے سے جذبۂ شہادت سے سرشار انسان تھے۔

مولانا مظہر صاحب حضرت مولانا محمد جعفر حسین قوال کے عاشقوں میں سے ایک تھے، محمد جعفر حسین کے نہ صرف مداح تھے بلکہ جہاد کونسل اور اس کے تمام پروگرام اور پلان پر خوش بھی تھے، آپ جہاد کونسل کے ساتھ خفیہ طور پر رابطہ قائم کئے ہوئے تھے، بعد میں غالبا ۱۹۴۹ء کی ابتدا میں محمد جعفر حسین قوال کے حکم سے محمد قاسم راجا صاحب سے رابطہ قائم کیا، اور ۱۹۴۹ء کے اواخر میں خود مجاہد پارٹی میں شامل ہوگئے تھے۔

عسکری تربیت کے حصول کے بعد مولانا مظہر صاحب کو ایک گروپ مجاہدین کا کمانڈر بنایا گیا، چنانچہ اس کے بعد آپ نے مگھ برمی دہشت گرد فوجوں کے خلاف چند بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی تھی، سینکڑوں دشمنوں کو جہنم رسید کرکے آپ نے ارکانی مسلمانوں کے دلوں میں داغہائے محبت بٹھا دیے تھے، نہ صرف ساتھی مجاہدین بلکہ یہاں کے مسلم عوام بھی آپ پر جان چھڑکنے کے خواہش مند ہوگئے تھے، چنانچہ لوگ کہتے تھے کہ مولانا مظہر صاحب نہ صرف ایک جان باز مجاہد انسان ہیں بلکہ جہاد کی حکمت عملیوں سے واقف ایک عظیم مخطط دانشمند بھی، جن پر توقع وابستہ کی جاسکتی ہے۔

۱۹۵۴ء میں محمد قاسم بن عطاء الدین والی مجاہد پارٹی کی تباہی کے بعد آپ کمانڈر باسامیاں والے دھڑا کے ساتھ رہے، عرصۂ دراز تک برمی ظالم افواج کے خلاف لڑ کر آپ نے ارکان میں انتقال کیا، انا للہ و انا الیہ راجعون، اللہ تعالی آپ کی ممکنہ تما خطاؤں کو درگزر فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا نجم اللہ صاحب کیوکتوی

حضرت مولانا نجم اللہ صاحب کیوکتو میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندان ایک شریف اور مثقف خاندان ہے، چنانچہ آپ کے والدین بھی خاصے پڑھے لکھے تھے۔

مولانا نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، اس کے بعد اکیاب میں ایک دوسال پڑھ کر بنگال کا سفر کیا اور چاٹگام کی ایک دینی درس گاہ میں چند سال پڑھ کر اسلامی علوم میں مہارت حاصل کی، اور سند فراغت لئے وطن واپس آئے تھے۔

وطن میں پہنچتے ہیں آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی، اول اول آپ نے اپنے گاؤں کے مدرسے میں تعلیم دی، اس کے بعد علاقے کے دیگر چند مدارس میں تعلیم کے فرائض انجام دیئے، ساتھ ساتھ تبلیغ وارشاد اور وعظ ونصیحت کے ذریعے بندگان خدا کو راہِ راست پر لاتے رہے تھے۔

آپ اچھے واعظ تھے، پند ونصیحت کا ملکہ آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، زبان بڑی شستہ اور انداز خطاب بھی بہت بہتر تھا، ویسے آپ کے پاس بہت دور دراز سے وعظ ونصیحت کی محفلیں سجانے کے لئے دعوت آتی تھی، دعوت آتے ہی آپ قبول بھی کرلیا کرتے تھے، اور وقت پر پہنچ کر وعظ کے ذریعے اسلامی ودینی تعلیمات سے لوگوں کو محظوظ کرتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے معرکۂ کرب بلا میں آپ نے لوگوں کی خاصی رہنمائی کی، بنفس نفیس مجاہدین میں شامل ہو کر مگھ برمی دہشت گردوں سے ڈھٹ کے جان توڑ مقابلہ کیا، بالآخر آپ کے لئے ارکان کی زمین تنگ ہوگئی تو آپ نے ہجرت کی راہ ڈھونڈی، اور اپنے خاندان سمیت ایک بڑی جماعت کے ساتھ بنگال کی طرف ہجرت کر چلے گئے تھے۔

آپ نے رنگپور کے مہاجر کیمپ شوبرنگر میں پناہ لی، یہاں بھی آپ نے اپنی نصیحت اور وعظ کے ذریعے لوگوں کو دین کی تلقین کی اور ہر موقع پر لوگوں کی رہنمائی کی تھی، آپ اس وقت وہاں قائم ہونے والی پنچائیت کے قائد تھے، بعد میں مہاجرین کی واپسی کے ساتھ آپ بھی وطن واپس آتو گئے، لیکن ظالموں نے آپ کو اپنے آبائی مسکن میں آنے سے روک لیا تھا، بالآخر ارکان کے حالیہ دار حکومت اکیاب میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، وہاں بھی آپ اپنے وعظ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب پنکھادی

حضرت مولانا نذیر احمد بن عبدالرحمن صاحب مزی کی ولادت ۱۹۳۸ء میں موضع پنکھا میں ایک دین دار گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم مزی عبدالرحمن صاحب ایک بزرگ ترین عالم دین اور نہایت سخی انسان کی حیثیت سے اپنے علاقے میں معروف تھے، اور والدہ بھی ایک نیک اور عالم پسند خاتون کی حیثیت سے مشہور تھی۔

مولانا کچھ بڑے ہوئے تو اپنے گاؤں کے مکتب میں بٹھائے گئے، کچھ تعلیم وہاں ہوئی اور بعد میں ارکان کی نامور درسگاہ مدرسہ اشرف المدارس راجاربیل میں چند سال پڑھ کر اعلی اسلامی تعلیم کی خاطر ہندوستان کا سفر کیا، اور امروہہ یوپی کی نامور درسگاہ میں جا داخلہ لیا، وہیں سے دورۂ حدیث نبویؐ کی تکمیل کی، آپ دارالعلوم امروہہ سے سند فراغت حاصل کر کے سیدھے وطن واپس آئے تھے۔

وطن پہنچنے پر آپ دارالعلوم کیلا دنگ (منگڈو) میں مدرس اعلی مقرر ہوئے، وہیں چند سال تعلیم دینے کے بعد شاہی فریر دیپ (ٹیکناف) میں چند سال پڑھاتے رہے، ایک طرف آپ کے دل میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کا شوق موجزن تھا تو دوسری طرف ارکان کے حالات نے بھی مولانا کو بہت پریشان کر رکھا تھا، تو آپ اپنے وطن مقدس کی زمین کو خیر باد کہتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچے، وہیں حج وزیارت سے فراغت کے بعد اپنے گھرانے سمیت مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

مکہ مکرمہ میں بھی آپ نے درس وتدریس کی خدمات کو اپنایا، اور وہاں کے نامور دیوبندی مکتب فکر کے مدرسہ ''مدرسہ توحیدیہ'' میں اپنی عمر کی آخری سانس تک تعلیم دے کر ۱۹۸۳ء میں وفات پائی، آپ جنت المعلی کی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

مولانا نے درس وتدریس کو اپنے معاش کا کبھی بھی ذریعہ نہیں بنایا، آپ نے فراغت تعلیم کے بعد تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ تجارت سے بھی دلچسپی لی، اور جہاں کہیں بھی گئے اپنی نجی تجارت کو فروغ دیا تھا، یوں مولانا کی پوری عملی زندگی تقریبا فارغ البالی میں گزری تھی۔

ساتھ ہی ساتھ مولانا نذیر احمد صاحب سیاست سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی لیتے تھے، جمعیت علمائے اسلام ہند طرز پر سیاست کرنے کو ترجیح دیتے تھے، وہ بڑے صاف گو اور زبان کے پکے نہایت بلند اخلاق کے مالک انسان تھے، فقہی اور اصولی بھی تھے، غرض وہ علوم اسلامیہ میں ید طولی رکھتے تھے۔

مولانا کے والد محترم مزی عبدالرحمن صاحب ایک صاحب کشف وکرامات بزرگ کی حیثیت سے علاقے بھر میں مشہور تھے، ۱۹۴۲ء کے واقعہ کرب وبلا ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ مشرق سے ایک آگ بھڑک اٹھی اور ارکان کی مشرقی سمت سے ساری چیزوں کو جلتی جلاتی مغرب کی طرف بڑھ رہی تھی، دوسرا دن انہوں نے اپنی ساری جائداد کو بس ایک کشتی (سامپان) کے عوض میں بیچ ڈالا، اور پنکھا سے راتوں رات اس میں پورے کنبے کو سوار کر کے شمالی ارکان کے سرحدی علاقہ منگڈو تشریف لائے، اب کچھ دن کے بعد ۱۹۴۲ء کا واقعہ شروع ہوا تو آپ کے خاندان کے بچے کھچے افراد نے منگڈو آکے آپ سے شکایت کی کہ آپ نے ہجرت تو کی اور ہمیں ہونے والے واقعہ کے متعلق کچھ اطلاع تک نہ دی، تو آپ نے وہی خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں اس وقت آپ حضرات کو اپنا خواب بیان کرتا تو شاید آپ حضرت یقین نہیں کرتے، اس لئے میں نے اپنے خواب کو چھپائے رکھا اور اسے اطلاع غیبی سمجھ کر اپنے کنبے سمیت ہجرت کی تھی۔

مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کی اولاد میں صدیق مکرم پروفیسر مولانا ڈاکٹر عبداللہ نذیر مزی (پروفیسر فقہ اسلامی جامعۃ الملک عبدالعزیز جدۃ سعودی عرب) قابل قدر عالم دین ہیں، بہت اعلی پایہ کے مصنف ہیں، حالیہ دنوں میں ہماری برادری میں وہ ایک عظیم المرتبت ہستی ہیں، انہوں نے وطن مقدس کی خدمات کے بطور بنگلا دیش میں اپنے دیگر ساتھیوں سے مل کر ایک ادارہ بنام ''دار الانصار الخیریہ'' قائم کیا، جس کے ذریعے ملت وقوم کی عظیم اور ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے ساتھیوں میں صدیق محترم پروفیسر ڈاکٹر محب الدین عبدالسبحان واعظ (پروفیسر جامعہ ام القری مکہ مکرمہ) اور برادر محترم حضرت مولانا مفتی سعید عالم صاحب (مدیر دار الانصار الخیریہ چاٹگام) کے علاوہ ڈاکٹر اکرام اللہ صاحب ناقابل فراموش ہستیاں ہیں، اللہ تعالی پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ نذیر صاحب کی جملہ خدمات دینیہ وقومیہ کو قبول فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب روئی شنگی

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب روئی شنگ میں پیدا ہوئے، ماضی میں ان کا خاندان ایک دعوتی وتبلیغی خاندان رہا تھا، ایک روایت کے مطابق ان کے والد صاحب ایک دیندار ومبلغ انسان تھے، وہ اپنے گاؤں میں دینی، تبلیغی اور اصلاحی فریضہ انجام دیتے تھے۔

مولانا نذیر احمد کچھ بڑے ہوئے تو گاؤں کے مکتب میں بھیجے گئے، بعد میں اکیاب کے ایک دینی مدرسے میں داخلہ لیا، وہیں سے علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کی، اور ایک روایت کے مطابق آپ بنگال کے ایک دینی مدرسہ میں پڑھے، جہاں سے علم دین کی تکمیل کی تھی۔

فراغت تعلیم سے واپسی کے بعد آپ اپنے گاؤں کے مکتب میں معلم مقرر ہوئے، مسلم بچوں کو دین کی تعلیم دیتے اور مکتب سے ملحق مسجد میں امامت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے تھے، ساتھ ساتھ اپنے قریبی علاقوں میں جاجا کر وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی تلقین کیا کرتے تھے، یوں علاقے میں آپ میانجی کے نام سے معروف ہوگئے تھے۔

مولانا نے ۱۹۴۲ء کے واقعۂ کرب وبلا میں مسلمانوں کی رہنمائی کی، اور اپنے علاقے کے مسلمانوں کی ایک جماعت کو اسلامی جہاد کے لئے تیار کر لیا تھا، باوجودیکہ اس معرکہ میں وہاں ہزاروں مسلمانوں کی جانیں گئیں، مگر اللہ تعالی نے آپ کو حفاظت فرمایا، چنانچہ ۱۹۴۳ء میں ایک جماعت کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ وطن سے بنگال پہنچے اور شوبرنگر (رنگپور) کے کیمپ میں پناہ گزین ہوگئے تھے، وہاں بھی آپ نے اپنے دینی کاموں کو جاری رکھا، آپ بڑے زیرک اور ہشیار انسان تھے، لسان اور شستہ وشگفتہ زبان کے مالک بھی، لوگ آپ کو بہت محبت کرتے تھے، اور اپنے رہنما اور مربی مانتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں شوبرنگر میں جب مسٹر بنرجی آیا تو اس وقت بنرجی سے گفتگو کرنے کے لئے ایک وفد کی ترتیب عمل میں آئی تھی، جس میں مولانا بھی شریک تھے، چنانچہ آپ نے اپنی دانائی اور زیرکی سے وفد کو صحیح مشورہ سے نوازا تھا، وطن واپسی پر آپ اپنے گاؤں نہ جاسکے، اس لئے اکیاب میں رہائش پذیر ہوگئے تھے، جہاں آپ نے ایک طویل عمر گزار کر انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب شیل گھاٹوی

مولانا نذیر احمد بن حاجی ٹھنڈا میاں صاحب ۱۹۱۱ء میں شیل گھاٹ بوسیدنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب میں پائی، اس کے بعد بوسیدنگ اور کیا زنگیا فارہ (بوسیدنگ) کے مدرسوں میں تعلیم پاکر مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ منگڈو میں متوسطہ کی تعلیم حاصل کی، پھر اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعض نامساعد حالات کے پیش نظر ارادہ چند سال کے لئے ملتوی ہو گیا تھا، اس لئے تعلیم کے سلسلے میں آپ اکیاب گئے، وہاں آپ نے ایک دینی مدرسہ میں ثانویہ کی تعلیم پائی، بعد میں حالات سدھر گئے تو حصول تعلیم کے لئے آپ ہندوستان چلے گئے تھے۔

مولانا کا چھوٹا بھائی جناب رشید احمد بامونگ کی روایت کے مطابق مولانا نے ہندوستان میں تعلیم پر مسلسل سات سال گزار دیے، اگرچہ رشید صاحب کے مطابق مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی، لیکن بعض دیگر روایت کے مطابق دار العلوم دیوبند میں نہیں بلکہ اطراف دہلی کے کسی دینی مدرسہ (شاید مدرسہ امینیہ ہو) سے تعلیم مکمل کی تھی، رشید بامونگ صاحب کے مطابق آپ ہندوستان سے ۱۹۴۱ء میں وطن واپس آئے، چنانچہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ مولانا کی اپنی انکھوں کے سامنے تھا۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ نے سیاست اور ثقافت سے دلچسپی لی، سیاست میں آپ مسٹر عبد الغفار صاحب رنگیا دنگی (وفاقی برمی پارلمانی سکریٹری) کے ہم خیال تھے، اور سیاست وثقافت کے حولے سے ان کے دوش بدوش کام کرتے تھے، ان دونوں کا یہ نظریہ تھا کہ ارکان کے مسلمان تب تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہو جائیں، علاوہ ازیں مولانا نے اپنے علاقے میں چند مدارس کی تاسیس اور چند مساجد کی تعمیر میں بھی بھرپور حصہ لیا، خاص طور پر آپ نے اپنی بستی میں ایک سرکاری اسکول حکومت کے تعاون سے بنایا تھا، اس کے علاوہ سینڈنگ (بوسیدنگ) کا جو مدرسہ آج کل بڑی شان سے چل رہا ہے اس کے موسسین میں آپ بھی تھے، اس علاقے میں مسلم طلبہ کو تعلیم دینے کے سلسلے میں جناب مولانا عبد الغفار صاحب کی طرح مولانا کی بھی بڑی بڑی خدمات ہیں، چنانچہ منی بیل، علی چنگ کے سرکاری اسکول بھی ان دونوں کی کوشش سے قائم ہوا تھا، آپ نے اس ایک طویل مدت تک قوم کی بڑی سے بڑی خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۹۶ء میں انتقال فرمایا، اور اپنے آبائی گاؤں میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی

حضرت مولانا نور احمد صاحب کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کا خاندن ایک علمی اور ثقافتی خاندان کی حیثیت سے معروف ومشہور ہے، مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی، اور متوسطہ کی تعلیم علاقے کے عربی مدارس میں پائی تھی، بڑے ہوئے تو علم کا شوق بڑھا، یوں ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوئے تھے۔

مولانا نور احمد صاحب نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری شارح ابوداؤد کی خدمت میں رہ کر علم کی پیاس بجھائی، آپ سے خوب خوب استفادہ کیا، چند سال اس علم وعمل کے گہوارہ میں رہ کر علوم دینیہ میں پختگی حاصل کی، چنانچہ آپ کے اساتذۂ کرام آپ پر فخر کرتے تھے، کہ طالب علم ہو تو نور احمد جیسا، مولانا نے ۱۹۲۷ء میں امتیازی شان کے ساتھ دورۂ حدیث کی تکمیل کی تھی۔

مولانا فراغت کے بعد سیدھے وطن واپس لوٹے اور درس وتدریس کے ذریعے اس پورے علاقے میں علوم اسلامیہ کا دریا بہادیا، یاد رہے کہ ہندوستان سے واپسی کے بعد آپ چند سال کے لئے رنگون گئے تھے، وہیں بھی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا، اس سفر کے دوران آپ نے حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب تلبنوی وغیرہ کے بھرپور تعاون سے وہاں ایک دینی درسگاہ تاسیس کی، جسے دنیا ''جامعہ عربیہ تاموے'' کے نام سے جانتی پہنچانتی ہے، علم وعمل کے حوالے سے اس درس گاہ نے بہت ہی نام پیدا کیے، ہزاروں تشنگان علوم نبوت نے اس درس گاہ سے سیرابی حاصل کی اور اب بھی کر رہی ہے، اللہ تعالی کے اس برگزیدہ بندے کے مبارک ہاتھوں سے یہ مدرسہ قائم ہوا، الحمد للہ آب بھی اس مدرسہ میں دورۂ حدیث تک کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے، اللہ تعالی اپنے اس عاشق صادق کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے، اور آپ کے بناء کردہ مدارس ودرسگاہوں کو تاقیامت جاری رکھے، آمین یارب العالمین۔

یوں تو وہاں ملک برما میں حضرت مولانا نور احمد صاحب کے ہزاروں تلامذہ تھے، اور اب بھی ہیں، جنہوں نے اپنے استاد کی طرح ملک وقوم کی خدمات انجام دیں، اور اب بھی دے رہے ہیں، تاہم ان تلامذہ میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سابق مفتی اعظم برما، مولانا ابراہیم احمد مظاہری سابق صدر جمعیت علمائے اسلام برما اور رئیس التحریر ''دور جدید رنگون'' اور حضرت مولانا مقصود صاحب رنگونی قابل قدر اور ناقابل فراموش ہستیاں ہیں۔

۱۹۵۶ء میں مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ کی مجلسِ شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ اس مدرسہ میں دورۂ حدیث شریف کے درجہ کی افتتاح کی جائے، تو اربابِ مدرسہ کی نظر مولانا پر پڑی، یوں آپ کے ذریعے اس علمی درسگاہ میں درجۂ دورۂ حدیث کی ابتدا کی گئی، اس لئے آپ وہ عالم دین ہیں کہ جن کے ذریعے اللہ تعالی نے اس درس گاہ میں دورۂ حدیث نبویؐ کی ابتدائی تھی، چنانچہ آپ نے اس درس گاہ میں تقریباً اٹھارہ سال تک بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیا، اس دوران ہزاروں تشنگان علوم اسلامیہ نے آپ سے سیرابی حاصل کی تھی۔

مولانا نے ۱۹۷۵ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے بعد آپ نے شہر رسول کو اپنے آخری قیام گاہ بنایا، یوں آپ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہوگئے تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ الرسول میں انتقال فرمایا، جنت البقیع آپ کی آخری آرامگاہ بنی ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کی اولاد میں مولانا عبدالقادر صاحب فاضل مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ اور مولانا عبدالمبین صاحب نے اپنے نامور والد کی طرح ملک وقوم کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، موخر الذکر آج کل مدینہ الرسولؐ میں مقیم ہیں، حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کے معاصرین میں:

حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب مرنگلوی۔

حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب نلبنوی۔

حضرت مولانا احتشام الحق صاحب کاندھلوی۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب چاٹگامی۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ارکانی۔

حضرت مولانا میر احمد صاحب کاندھلوی۔

بڑی بڑی شہرت کی حامل ہستیاں ہیں، اللہ تعالی نے حضرت مولانا نور احمد صاحب کی طرح آپ کے معاصرین سے بھی دین کی خاصی خدمات لی ہیں، اللہ تعالی ان سب کے درجات بلند فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

حضرت مولانا نور احمد صاحب اکیابی

حضرت مولانا نور احمد رصاحب کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ارکان کے دارالحکومت اکیاب کی معروف بستی جہاز تلی گونہ میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم بڑے دین دار، خداترس اور عالم دوست انسان تھے، جہاں بھی وعظ ونصیحت کی محفل سجتی، آپ بڑے شوق سے وہاں پہنچ جاتے تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہوئی، بڑے ہوئے تو ہندوستان کا عزم کیا، تاکہ وہاں کے علم و عمل کے گہوارے سے مستفید ہوسکے، چنانچہ والد صاحب کی اجازت اور تعاون سے آپ ہندوستان گئے اور سیدھے جاکر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوگئے، وہاں آپ نے چند سال تعلیم حاصل کی، چنانچہ ۱۹۲۷ء میں سند فراغت ہاتھ لیتے ہوئے سیدھے وطن آپہنچے تھے۔

آپ بڑے مستعد، جید اور صاحب بصیرت عالم دین تھے، فراغت کے بعد وطن آتے ہی آپ نے اکیاب کی نامور درسگاہ مدرسہ تکمیل العلوم میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کردیا، اور ہمیشہ کے لئے اس درسگاہ کے ہوگئے تھے، اور مرتے دم تک اس عظیم درسگاہ میں تفسیر القرآن الکریم، احادیث نبویہ کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی تعلیم دیتے رہے تھے۔

روایت ہے کہ مولانا نے کسی ہندوستانی بزرگ عالم دین اور شیخ طریقت کے ہاتھ میں بیعت کی تھی، لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر اجازت سے سرفراز نہ ہوسکے تھے، آپ بڑے عالم ہونے کا ساتھ ساتھ عابد اور خداترس انسان تھے، طبعاً انتہائی کم گو تھے، فضول باتوں سے بڑی حد تک پرہیز کرتے تھے، مگر جب علم وعمل کی باتیں چھڑ جاتیں تو مولانا کی مبارک زبان سے اصلی جواہر پارے نکلتے تھے۔

مولانا کو راقم السطور نے نہیں دیکھا، لیکن حافظ محمد صدیق کی روایت کے مطابق آپ ٹھوس علمی صلاحیت واستعداد کے مالک ہونے کے ساتھ قد وقامت اور جسمانی اعتبار سے بھی دلکش اور جاذب نظر بزرگ تھے، بالآخر سرزمین ارکان کے یہ عظیم عالم دین، صاحب نظر بزرگ تقریبا ۱۹۹۰ء میں انتقال کرگئے اور خاکِ اکیاب میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا کے انتقال کے حوالے سے ایک دلچسپ اور نہ سمجھ آنے والی بات صدیق مکرم مولانا حافظ محمد صدیق سے سنئے کہ:

’’مولانا کے انتقال کا واقعہ محیر العقول ہونے کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس کے

اذہان سے بالاتر بھی ہے، مولانا عملہ پارہ مدرسہ میں دورۂ حدیث کے درس دے رہے تھے، دوران درس فرمایا کہ طبیعت ناساز ہے، پتہ نہیں کل سبق میں آسکوں یا نہیں، غلطیوں کو معاف کر دینا، طلبہ کو کیا پتہ تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے، اور یہ باتیں الہامی ہیں، یہ کہہ کر مولانا گھر چلے گئے اور عشاء کے بعد لیٹ گئے، رات تین بجے درد شروع ہو گیا، مولانا اٹھے اور وضو کیا اور تہجد کی نماز پڑھ کر دوبارہ لیٹ گئے، صبح کی آذان ہوگئی، بیوی نے نماز فجر کے لئے جگانے کی کوشش کی لیکن اٹھنے کا نام نہیں، انتقال کا گمان اس لئے نہیں ہوا کہ جسم میں حرارت موجود تھی، دونوں ہونٹوں کی گولائی سے ہوا بلکہ تھوک کی آمد ورفت جاری تھی، صبح ڈاکٹروں کو بلایا گیا، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے، آپریشن سے معلوم ہوگا، علماء نے فرمایا کہ انتقال ہو گیا ہے، لہذا آپریشن مناسب نہیں، بالجملہ غسل دے کر کفنایا دیا گیا، پھر نماز جنازہ کے لئے نعش سامنے رکھی گئی، اچانک نعش میں حرکت آگئی، اور ہنسنے کی آواز آئی، مصلیوں نے کفن کھول کر دیکھا اور ڈاکٹروں کو بلا کر دکھایا، سب نے کہا ہے کہ انتقال ہو چکا ہے، یہ حرکت اور ہنسنے کی آواز مولانا کی کرامت ہے، اس کے بعد مولانا کو سپرد خاک کر دیا گیا"۔(۱)

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برماص:۲۳۲۔

حضرت مولانا ڈاکٹر نورالاسلام صاحب میانجانفوری

مولانا ڈاکٹر نورالاسلام صاحب کی پیدائش ۱۹۵٦ء میں بمقام میانجانپور شمالی منگڈو میں ہوئی، مکتب نشینی گاؤں کے دینی درسگاہ میں ہوئی، اس کے بعد دارالعلوم احمدیہ سعد اللہ سر میں جماعت دہم ونہم کی تعلیم پائی، جماعت ہشتم سے لے کر جماعت پنجم تک دارالعلوم کوانچی بنگ میں آپ نے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اعلی تعلیم کی نیت سے پاکستان پہنچے، کراچی کے ایک مدرسہ میں جماعت سوم کی تعلیم کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور پہنچے، وہاں آپ نے جماعت دوم سے لے کر دورۂ حدیث نبویؐ کی تعلیم پائی تھی۔

اس کے بعد آپ نے فیصل آباد پنجاب کا ایک ادارہ "جامعہ تعلیمات اسلامیہ" میں ایک سال استفادہ کیا، وہاں آپ نے حدیث نبویؐ اور علوم قرآن پر مطالعہ کرتے رہے، وہیں سے آپ نے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض سعودی عرب سے رابطہ کیا تو جامعہ میں قبولیت کے بعد آپ ریاض پہنچے، اور کلیۃ اللغۃ العربیہ میں دو سالوں تک پڑھتے رہے، چنانچہ اسی جامعہ سے آپ نے لغہ عربیہ میں بی اے کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد آپ کلیہ الشریعہ الاسلامیہ ابھا میں بھرتی ہو گئے، وہیں سے ماجستر کی ڈگری حاصل کی تھی، بعد ازاں پاکستان چلے گئے اور پشاور یونیورسیٹی سے دوبارہ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دکتورہ کے لئے منظوری ملی تو دو سالوں کی کوشش کے بعد دکتورہ کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔

۱۹۸۸ء میں آپ رابطۃ العالم الاسلامی کی طرف سے داعی اور مندوب کی حیثیت سے پشاور میں کام کرتے رہے تھے، چودہ سالوں تک مسلسل افغان مجاہدین ومہاجرین کی خدمات انجام دے کر لاہور منتقل ہو گئے، وہاں آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے مدرس بنے، جامعہ اشرفیہ لاہور کو ایک بامعنی یونیورسیٹی بنانے میں آپ کا عمل دخل تھا۔

۱۹۸۲ء مولانا کی شادی خانہ آبادی ہوئی، آپ کی اہلیہ محترمہ سلیمہ بنت علی احمد عرف مومنہ خاتون سانگری بیلی بوسیدنگی ایک شریف اور پڑھی لکھی خاتون ہیں، جن کے بطن سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں، بڑا بیٹا محمد عثمان بڑا لائق وفائق بنا، مولانا کو خونی کینسر کا مرض لاحق ہوا تو راقم سطور اور مولوی حفیظ الرحمن لمبا گونوی نے بڑی کوشش سے سعودی عرب لاکر آپ کو مستشفی ملک فیصل ریاض میں علاج کروایا، لیکن آپ شفایاب نہیں ہو سکے، آخر ۲۰۰٦ء میں آپ کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی نورالاسلام شہید تمبر ووی

مولوی نورالاسلام بن سعید کریم صاحب شمالی منگڈو کی بستی تمبر و کے رہنے والے تھے، آپ کا خاندان ایک نیک اور قومی ہمدردی رکھنے والا خاندان ہے، چنانچہ آپ کے والد بزرگوار نے اپنے زمانے میں مجاہدین آزادی کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم کے بعد متوسطہ کی تعلیم قریبی بستی کے مدرسہ سے حاصل کی، جب کہ ثانویہ کی تعلیم کوانچی بنگ کے مدرسہ سے، ۱۹۸۹ء میں برمی فوج کی مسلمانوں کے خلاف مہم اور ظالمانہ کاروائیوں کے نتیجے میں مولوی صاحب بنگلا دیش ہجرت پر مجبور ہو گئے، تاہم انہوں نے وہاں بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور نہلا کا مشہور مدرسہ ''مدرسہ دار السنہ'' میں ثانویہ میں داخلہ لیا، ۱۹۹۰ء میں روہنگیا سالیڈریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے معسکر میں پہنچے، ماسٹر شبیر احمد (شہید) اور ماسٹر محمد خان سے عسکری تربیت لینے کے بعد باقاعدہ مجاہد کی حیثیت سے معسکر میں رہنا پسند کیا، اور بیرونی دنیا سے قسما لاتعلق ہو گئے تھے۔

لیکن چند دن کے بعد مدرسہ ابن عباس الاسلامیہ جو خاص اس وقت معسکر میں مجاہدین کے لئے قائم کیا گیا تھا (اب تک ماشاء اللہ یہ مدرسہ مستقل طور پر وجود میں آچکا ہے) جس میں ممتاز علمائے کرام جو جہاد کی غرض سے معسکر پہنچے تھے درس دیا کرتے تھے، نورالاسلام اس درسگاہ سے ۱۹۹۴ء میں فارغ التحصیل ہوئے، آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شرف الدین بیلی، مولانا امجد حسین صاحب، مولانا اشرف علی صاحب گدوسراوی قابل ذکر ہیں۔

مولوی نورالاسلام صاحب ذہین ترین طلبہ میں سے تھے، اور بڑے جواں مرد، نہایت بہادر اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی، دوران طالب علمی میں وہ اتحاد الطلاب المسلمین (ITM) کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے، تعلیم کے ساتھ ساتھ دعوت وتحریک کا کام بھی سرگرمی کے ساتھ انجام دیتے تھے، وہ اپنے علاقے میں آئی ٹی ایم کے ذمے دار تھے، کھیلوں میں فٹ بال اور بیڈمنٹن کے ماہر کھلاڑی تھے، تہجد کے لئے سب سے پہلے بیدار ہونے والوں میں سے تھے، سریلی آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے، اور شعر بھی خوب خوب کہتے تھے، ۲۶/اپریل/ ۱۹۹۴ء کی صبح مولوی نورالاسلام صاحب جنوبی منگڈو میں شہید ہوئے، اللہ تعالی مجاہد نورالاسلام کی قربانی اور جہود کو قبول فرمائے، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا نور احمد صاحب ممبراوی ارکانی

حضرت مولانا نور احمد بن سیف الملوک صاحب ۱۹۲۰ء میں ارکان کے شہر ممبرا/ممبیا کی بستی کوپچنگ میں پیدا ہوئے، آپ اپنے والدین کے اکلوتے صاحب زادے تھے، والد کا سایۂ پدری بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا، مولانا مرحوم کا سلسلۂ نسب سیدنا علی رضی اللہ تعالی عنہ سے جاملتا ہے، چنانچہ مولانا حافظ محمد صدیق صاحب شیخ یونس ابراہیم سامرائی عراقی کی تصنیف ''علماء العرب في شبه القارة الهندية'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت علی سے جاملتا ہے، شیخ یونس ابراہیم سامرائی عراقی لکھتے ہیں کہ شیخ نور احمد سادات علویہ آل بیت سے ہیں، ان کے آباواجداد ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں عراق سے منتقل ہو کر برما آ گئے تھے، تاکہ یہاں دین متین کی اشاعت ہو''۔(۱)

مولانا نور احمد صاحب ابتدائی، متوسطہ اور ثانویہ کی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کر کے نوعمری میں ہی اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے، اور ۱۹/شوال/ ۱۳۶۳ھ بمطابق اکتوبر/ ۱۹۴۴ء میں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں اس دور کے اکابر علمائے دیوبند سے شرف تلمذ حاصل کیا، جن میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا رسول خان صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے دورانِ تعلیم آپ خصوصی طور پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''طالب علمی کے زمانے میں مولانا کا تعلق مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہو گیا تھا، اور ان کی خوب خوب خدمت کی تھی، جس کے صلے میں خود مفتی صاحب نے اپنی صاحب زادی کا عقد نکاح مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تھا، ۲/جنوری/ ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان کی طرف ہجرت کی، ۱۹۵۰ء میں مفتی صاحب کی صاحب زادی مولانا کے نکاح

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۶۸۔

میں آئیں''۔(۱)

مولانا مرحوم جنہیں اللہ تعالی نے غیر معمولی صلاحیت واستعداد، ذہانت اور قوت حافظہ سے نوازا تھا، اپنے طالب علمی کے دور میں اساتذۂ کرام کی نظریں اپنی طرف مبذول کرلی تھیں، آپ طالب علمی کے دور میں ممتاز صلاحیت، استعداد اور لیاقت کے حامل تھے، اور ساتھ ساتھ آپ نے اپنے اساتذہ سے بے پناہ تعلق بھی قائم کرلیا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے دوران جب برما پر جاپان کا قبضہ ہوگیا تو انڈین حکومت نے دارالعلوم دیوبند میں ارکان کے زیر تعلیم طلبہ کے لئے وظیفہ جاری کیا، یہ وظیفہ شاید سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے تھا، لیکن مولانا مرحوم کی دینی غیرت اور ملی نخوت نے اسے قبول کرنا گوارہ نہ کیا، اور علم دین کے وقار وعزت کو قبول وظیفہ کی شکل میں پامال ہونے نہیں دیا تھا۔

مولانا جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اس زمانے میں آزادی کی تحریک زور شور سے شروع ہوچکی تھی، مولانا مرحوم اس تحریک میں اپنے اساتذہ خصوصا مفتی محمد شفیع صاحب کے دست راست بنے رہے، تقسیم ہند کے بعد آپ نے حضرت مفتی صاحب کے خاندان، تجارتی اور علمی کتب خانہ کی پاکستان منتقلی کا دشوارترین کام بھی انجام دیا، حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ہر وقت آپ کی مکاتبت کا سلسلہ جاری تھا، تو ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ آپ کا تعلق غیر معمولی رہا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان میں بورڈ آف تعلیمات اسلامی کی تشکیل ہوئی، اور قرارداد مقاصد کا مرحلہ سامنے آیا تو شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور ان کے رفقاء کی جدوجہد میں اس ارکانی خاموش مجاہد کی پس پردہ مساعی بڑی بارآور ثابت ہوئیں، پاکستان آمد کے بعد جس طرح عرض کی گئی ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی بڑی صاحب زادی کا نکاح آپ سے کرادیا تھا۔

جب مفتی صاحب کی زیر صدارت ایک نوزائدہ ملک کی شایانِ شان علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت کے لئے ایک موزون درس گاہ قائم کرنے کا پروگرام طے ہوا تو اس ادارہ کی نظامت اعلی کے لئے بھی آپ ہی کو منتخب کیا گیا، یہ انتخاب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے کیا، اور آپ ہی نے ان کو نظامت کا اہم ترین منصب تفویض فرمایا تھا، اس وقت دارالعلوم کراچی کا وجود صرف دینی اور فکری سطح پر

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۶۸۔

تھا، تو آپ نے دارالعلوم کراچی کے لئے شہر میں جگہ کی تلاش شروع کردی، اس تلاشی کے دوران نانک واڑہ میں متروکہ املاک سے متعلق ایک اسکول کی جگہ خالی کر کے اس پر مدرسہ قائم کیا گیا، نانک واڑہ میں جو بوسیدہ اور تنگ وتاریک عمارت دارالعلوم کو ملی تھی، اس کی مولانا مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ساتھ بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے صفائی کی تھی، پھر سادگی، تواضع، اخلاص اور للّٰہیت کے سرمائے سے ۱۳/شوال/۱۳۷۰ھ کو اس ادارہ کی بنیاد رکھی تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی، پھر افریقہ کے ایک فاعل خیر نے کورنگی میں شرافی گوٹھ کے پاس ایک قطعۂ اراضی دارالعلوم کے لئے وقف کردیا، یہ ایک مختصر سا رقبہ تھا، لیکن دارالعلوم کی ضرورت کے لئے کافی تھا، تاہم مولانا نور احمد صاحب مرحوم نے کورنگی کے سروے کے دوران اس بات کا احساس کیا کہ دار العلوم کے رقبہ میں اضافہ کی ضرورت ہے، چنانچہ آپ نے اپنی ذاتی کوشش اور لگن سے دارالعلوم کے لئے بہت ہی وسیع جگہ حاصل کر کے اصل وقف شدہ زمین میں شامل کردیا، اس طرح یہ عظیم دینی، علمی، فکری اور روحانی درس گاہ چھپن ایکڑ زمین پر قائم ہوگئی تھی۔

دارالعلوم کراچی کے موثر ترین تاسیسی رکن اور ناظم اعلی کی حیثیت سے آپ کی مساعی جمیلہ اہل دانش اور اصحاب بصیرت سے مخفی نہیں ہیں، آپ نے اس ادارے کے لئے رجال کار، سرمایہ اور ضروری وسائل کی فراہمی میں جفاکشی، سرگرمی، جوش وجذبہ کے ساتھ شبانہ روز محنت کر کے ابتدائی تعمیری ڈھانچہ کھڑا کردیا تھا، اور اس دینی درسگاہ میں جو شہر سے بیس میل دور ایک بیاباں میں قائم کی گئی تھی، اور شہری سہولیات سے محروم تھی، اس کے لئے تمام وسائل جمع فرمادیئے تھے، دارالعلوم کے یوم تاسیس سے تقریباً چودہ سالوں تک مشکل اور صبر آزما اور تعمیر وترقی کا اہم ترین مرحلہ اللہ تعالی نے آپ کے مبارک ہاتھوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، چنانچہ اس دارالعلوم کے حوالے سے آپ کے بعد کے کچھ حالات مولانا حافظ محمد صدیق کے قلم سے ملاحظہ کیجئے کہ:

> ''اس عظیم ادارے کی بنیاد حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دست راست اور داماد خاص مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی، بلاشبہ نام مفتی صاحب کا ہے، لیکن کام مولانا ممدوح کے حصے میں آیا، اس گمنام شخصیت نے صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس دارالعلوم کو بام عروج تک پہنچانے میں جو قربانیاں پیش کیں، اب وہ تاریخ کا حصہ ہیں، جس طرح کلمہ

طیبہ میں اللہ کے نام کے ساتھ رسول کا نام لابدی ہے، اسی طرح دارالعلوم کی بناء پر مفتی صاحب کے اسم گرامی کے ساتھ مولانا ممدوح کا نام ضروری ہے، دونوں لازم ملزوم ہیں، آج دارالعلوم کا جو بھی نام اور مقام ہوا، یہ سب کچھ انہیں دونوں بزرگوں کی للّٰہیت وخلوص کی مرہون منت ہے۔

افسوس صد افسوس اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بعض نام نہاد مضمون نگار وقلم کار جب دارالعلوم کی تاریخ، بنیاد اور عروج پر قلم اٹھاتے ہیں تو۔۔۔۔۔کی وجہ سے مولانا ممدوح کا نام نکال دیتے ہیں، یا بے التفاتی سے تذکرہ کرتے ہیں، اوپر سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لیتے ہیں اور درمیان میں مولانا کو چھوڑ کر دیگر بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں، بعض حضرات تقریر میں بھی ایسا کرتے ہیں، لیکن انہیں ٹوکنے والا کوئی نہیں، عجب خدا کا نظام ہے کہ درخت لگاتا کوئی ہے اور پھل کھاتا کوئی اور۔

وہی دارالعلوم جس کی بنیاد پر مولانا کا خون پسینہ شامل ہے، جس کے عروج کے لئے مولانا نے دن رات کو ایک کیا تھا، اور جس کی بلند وبالا عمارتیں بھی آج تک مولانا کی جانفشانی اور عالی ہمتی کی گواہی دے رہی ہیں، اسی دارالعلوم کی فضاء مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں مکدر کردی گئی ہے، مولانا بالآخر ۱۴/ دسمبر/ ۱۹۶۴ء میں مستعفی ہوکر تبلیغی چلے پر چلے گئے، اور سات چلے لگائے''۔(۱)

اس ادارے کے قیام کے بعد اللہ تعالی نے آپ سے دیگر محاذوں پر بھی خدمات لیں، چنانچہ آپ نے اس دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد ''دعوۃ الحق'' کے نام سے ایک تبلیغی ادارے کی بنیاد رکھی، اس ادارے کو مغربی پاکستان میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور مشرقی پاکستان میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب کی سرپرستی حاصل تھی، مولانا محمد صدیق صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''پاکستان سمیت کسی بھی ملک میں جب بھی دین متین کے خلاف کوئی فتنہ کھڑا ہوتا تو مولانا اس کی سرکوبی تک چین سے نہیں بیٹھتے، بلکہ اس کو ختم کرکے دم لیتے یا کم از کم

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۲۶۸-۲۶۹۔

عوام پر اس کی قباحت وشناعت واضح کردیتے، پاکستان میں جب جی ایم سید کا فتنہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھا تو مولانا نے اس کو نیست و نابود کرنے کے لئے ''دعوۃ الحق'' کے نام سے علمی اکیڈیمی کا افتتاح کیا، جس کے سربراہ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحب اعلاء السنن) مقرر ہوئے، اور اس کی ایک شاخ بنگلا دیش میں کھولی گئی، جس کے ذمے دار مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) منتخب ہوئے، اس اکیڈیمی سے جی ایم سید کے خلاف بہت سے علمی مقالے اور گرانقدر کتابچے شائع ہوئے، جس سے یہ فتنہ دب کررہ گیا''۔(۱)

اس زمانے میں پاکستان میں سوشلزم کا فتنہ تیز رفتاری سے پروان چڑھ رہا تھا، مولانا مرحوم نے تعلیمی اداروں، مزدوروں کی یونینوں اور دیگر مختلف محاذوں پر اس خطرناک فتنہ کے خلاف کام شروع کردیا، اور مختلف کتابوں اور پوسٹروں کے ذریعے (جو علماء اور دانشوروں سے لکھوائے گئے تھے) مبلغین کے ذریعے اس فتنہ کا خدو خال اور بھیانک نتائج سے پردہ اٹھایا، تاکہ سوشلزم کے پرفریب نعروں سے مسلمانان پاکستان دھوکہ نہ کھائیں، ان کتابچوں میں سوشلزم اور افسر شاہی ''سوشلزم اور مزدور'' شامل ہیں۔

مولانا روسی ترکستان میں سوشلزم ''سوشلزم کفر ہے'' کے خلاف جو فتاوی دیئے گئے تھے، ان کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کرواکے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کروائے، سوشلزم کے بارے میں علماء کے متفقہ فتاوی کے حصول کے سلسلے میں پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصے کے علماء کی رائے کے لئے شہر شہر اور قریہ قریہ سر کیا، اور ہر مکتب فکر کے اہل علم واہل فتاوی کی سوشلزم کی تباہ کاری کی طرف توجہ مبذول کرائی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق لکھتے ہیں کہ:

''جب پاکستان میں ۱۹۶۹ء کو فتنہ اشتراکیت نے سر اٹھایا تو مولانا بے چین ہوگئے، اور بذات خود کراچی سے پشاور تک کئی دفعہ سفر کئے، اور تین سو تیرہ علمائے کبار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور فتنۂ اشتراکیت کے خلاف متفقہ فتوی صادر کیا، جس سے اشتراکیت کی ہوا نکل گئی، مذکورہ علمائے کبار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا جبکہ ان

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۲۶۹-۲۷۰۔

کے آپس میں اختلاف اور دوریاں بھی تھیں، بلاشبہ مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت اورخلوص نیت کانتیجہ تھا''۔(۱)

تقریباً پندرہ سال تک ''موتمر عالم اسلامی'' کے شعبۂ دعوت وارشاد کے اعلیٰ ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ نے امت مسلمہ کی مشکلات ومسائل کے حل کے لئے موتمر کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا، موتمر کے پلیٹ فارم سے عالم عرب میں علمائے دیو بند اور علمائے ہند و پاک کو متعارف کرانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے، دنیا کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں کی مشکلات اور دکھ درد سے آپ تڑپ اٹھتے تھے، مولانا کے اندر اوروں کی خدمات کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، آپ موتمر عالم اسلامی کے نہایت فعال اور سرگرم رکن تھے، جس کا اعتراف عرب وعجم کے اکثر اہل علم نے کیا ہے۔

افغانستان کے مقدس جہاد سے آپ کی والہانہ حد تک وابستگی تھی، مجاہدین کے مقتدر رہنماؤوں کو آپ کی ان مساعی کا اچھی طرح اعتراف تھا، آپ نے ابتدا ہی میں اس جہاد کے لئے مادی، معنوی، سیاسی اور اخلاقی حمایت حاصل کی تھی، کراچی میں افغان ریلیف کمیٹی جس کے آپ سکریٹری تھے کے ذریعے اس مقدس جہاد میں بھر پور شرکت کی، نیز اس سلسلے میں پاکستان کے اندر مسلسل کوشش کے علاوہ بیرون ملک کا متعدد دورہ کیا، افغان جہاد کے مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے اتحاد کے لئے بھی آپ نے انتھک کوشش کی، اس حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''۲۵ / دسمبر/ ۱۹۷۹ء میں روس نے افغانستان پر یلغار کی، اس وقت مولانا ممدوح ہی وہ پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے بے یار و مددگار افغانی مجاہدین کی مالی امداد کی اور کروڑوں روپے جمع کر کے انہیں دیے، اور آخری دم تک یہ سلسلہ جاری رکھا، بلکہ انہوں نے خفیہ طور پر بہت سے پاکستانی نوجوانوں کو ترغیب دے کر افغانستان میں جہاد کے لئے بھیجا، ایک مشہور افغانی لیڈر نے کہا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہدین کی مدد کے سلسلے میں اندرون ملک اور بیرون ملک جو فون کئے تھے، ان کے ایک ماہ کا بل دس ہزار روپے آیا، وہ سب مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جیب خاص سے دیئے ، ایک دفعہ مولانا عملی جہاد کی نیت سے محاذ پر تشریف لے گئے، اسلحوں کا مشاہدہ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۷۰۔

کیا، جنگ دیکھی اور لوگوں کی گھن گرج سننے کے بعد معرکۂ حق و باطل پر کود پڑنے کی کوشش کی، لیکن مجاہدین نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اگر مولانا شہید ہو گئے تو پیچھے سے کمک پہنچانے والا کوئی نہیں رہے گا، جبکہ اس وقت افرادی قوت سے زیادہ مالی امداد کی ضرورت تھی''۔(۱)

غالباً انتقال سے پانچ سال قبل آپ نے ایک عظیم علمی، تحقیقی اور اشاعتی ادارہ کی بنیاد رکھی، اس ادارے نے اپنی مختصر مدت میں قرآن کریم، تفسیر وحدیث اور فقہ اسلامی کی نایاب کتب کی طباعت کے سلسلے میں حیرت انگیز کردار ادا کیا، مرحوم کا قائم کردہ ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی'' نے بیش قیمت علمی شاہکار شائع کئے، اور عالم اسلام کو ان سے متعارف کروایا، آپ کی شدید خواہش تھی کہ اس طرح کے تمام علمی دفینوں کو منظر عام پر لایا جائے، اس ادارے میں مستند اہل علم کی زیر نگرانی تحقیق کا ایک شعبہ بھی قائم ہے، جس میں حدیث وفقہ کی نایاب کتب ومخطوطات کی جدید طرز پر ترقیم کی جاتی ہے، اور صحت کے اطمینان کے بعد عربی کمپیوٹر پر نہایت اہتمام سے عمدہ طباعت سے آراستہ کیا جاتا ہے، ادارے نے اپنے قیام سے لے کر اب تک جو کام کیا ہے، وہ کسی عظیم الشان علمی اکیڈیمی سے زیادہ ہے، اور بعض مخطوطات تاریخ اسلام کے چودہ سالہ دور میں پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں، اب تک یوں تو بہت سی کتب اس ادارہ کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئیں، لیکن ان میں سے بعض اہم علمی وتحقیقی کتب جو شائع ہوئیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، سولہ جلدوں پر مشتمل۔
(۲) المبسوط للسرخسی، اکتیس اجزاء پر مشتمل
(۳) کتاب الاصل، پانچ جلدوں پر مشتمل۔
(۴) جامع الصغیر۔
(۵) کتاب الدیات۔
(۶) شرح الاشباہ والنظائر، پانچ جلدوں پر مشتمل۔
(۷) احکام القرآن، للتھانوی، پانچ جلدوں پر مشتمل۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۷۰۔۲۷۱۔

(۸)المبسوط للامام محمد رحمۃ اللہ علیہ۔

(۹)غمز عیون البصائر للامام الحموی۔

(۱۰)شرح الطیبی علی مشکوۃ المصابیح۔

(۱۱)الکوکب الدری للگنگوھی رحمہ اللہ تعالی۔

(۱۲)غنیۃ المسالک فی بغیۃ المناسک۔

(۱۳)کتاب المخارج فی الحیل۔

(۱۴)الرد علی سیر الاوزاعی۔

(۱۵)اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی۔

مولانا ایک قابل قدر مؤلف بھی تھے، آپ نے اپنے دینی، علمی اور فکری مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان بھی سر کیا ہے، مثال کے طور پر چند تصانیف کا تذکرہ حاضر خدمت ہے:

(۱)پردہ کی چہل حدیث: کل ۶۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کی ابتدا میں علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تقاریظ موجود ہیں، ان دونوں حضرات کی تعریف وتوصیف سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کتنے بڑے جلیل القدر مصنف تھے۔

(۲)سوانح حیات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ: کل ۹۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت حکیم الامت مجدد ملت اشرف علی تھانویؒ کی زندگی پر لکھی گئی ہے، اگر چہ چھوٹی ہے، لیکن حضرت مولانا نور احمد صاحب نے مولانا حافظ محمد صدیق کے الفاظ میں سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے۔

(۳)دستور قرآن: یہ کتاب بھی ماشاءاللہ مولانا کی علمی صلاحیت وقابلیت کی روشن اور واضح دلیل ہے۔

مولانا مرحوم ایک دل زندہ دار انسان تھے، جس طرح شریعت کے ایک بڑے عالم تھے اسی طرح کوچہ طریقت کے سالک برحق بھی تھے، آپ نے اپنے اصلاحی تعلق حضرت غلام النصیر چلاسی بابا سے قائم کیا تھا، جنھوں نے آپ کو ۱۹۸۶ء میں خلافت عطا کی، اس بارے میں محترم جناب مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''یوں تو حضرت مولانا (نور احمد صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق خاص اپنے مربی مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، انہیں کے اشاروں پر جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے، تاہم مشہور بزرگ غلام النصیر چلاسی بابا صاحب سے

اصلاحی تعلق قائم کیا، اور ۱۹۸۶ء میں آپ کو چلاسی بابا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے خلافت بھی مل گئی''۔(۱)

مولانا کے اخلاق حمیدہ پر لکھتے ہوئے مولانا محمد صدیق نے اپنا دل کھول دیا ہے، اوران کا یہ دل کھول دینا دراصل حق بجانب بھی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ مکارم اخلاق اور نیک سیرت کے مالک تھے، مجسم جود وسخا تھے، اوران پر استغناء اور بے نیازی کی شان غالب تھی، برطانوی حکومت مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند ودیگر مدارس کے برمی طلبہ کو وظیفہ دیتی تھی، بہت سے طلباء اس سے فائدہ اٹھائے ہیں، لیکن مولانا اسے توہین سمجھتے تھے، اور نیت کے فتور پر محمول کرتے تھے، اس لئے کبھی حکومت برطانیہ سے وظیفہ نہیں لیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی چیز خریدتے یا ٹیکسی کرایا پر لیتے تو بائع کی طلب اور میٹر کے حساب سے کچھ زیادہ ہی دے دیا کرتے تھے، اور جب بھی موقع ملتا تو ٹیکسی والے کو دین کے مسائل سمجھاتے تھے، گویا وہ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مصداق تھے :بابعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی النصح لکل مسلم، مولانا جب بھی کوئی نیک عمل کرتے تو گم نام رہنے کو پسند کرتے تھے، کسی سے اپنی شمولیت کا تذکرہ نہ کرتے تاکہ دکھاوے کا شبہ نہ ہوجائے، اس لئے مولانا ممدوحؒ گمنام مجاہد کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے(۲)

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، شیخ طریقت ومرشد برحق، مجاہد فی سبیل اللہ، اسلامی سیاسی قائد ورہنما اور قابل قدر مصنف ومولف ومصلح ومرشد تھے، آخرکار یہ چمکتا دھمکتا ہوا ستارہ ایک طویل مدت تک آسمان علم وعمل میں چمکتا ہوا ۲/جمادی الاخری/۱۴۰۷ھ۔ یکم/فروری/۱۹۸۷ء کو ہمیشہ کے لئے اس جہان فانی سے غروب ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان میں پانچ بیٹے اور پانچ صاحب زادیاں ہیں، بیٹوں کا مختصر سا تذکرہ یہاں

---

(۱)مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۲۷۲۔

(۲)مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما،ص:۲۷۲۔

حاضر خدمت ہے:

(۱) مولانا امین اشرف صاحب: مولانا کا یہ صاحبزادہ ایک حافظ القرآن بھی ہے اور عالم دین بھی، جامعہ کراچی کے فارغ التحصیل ہونے کے علاوہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں کلیۃ القرآن بھی کیا ہے، مدینہ منورہ کے دارالعدل میں مترجم تھے، راقم سے ان کی ملاقات رہی ہے، نہ جانے آج کل ان کا کیا حال چال ہے۔

(۲) مولانا رشید اشرف سیفی صاحب: مولانا کا یہ صاحب زادہ ایک جلیل القدر عالم دین ہے، دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کی کتاب ''درس ترمذی'' کے مرتب ہیں، دارالعلوم کراچی کے اعلی استاد بھی ہیں اور منتظم بھی۔

(۳) مولانا قاسم اشرف صاحب: جو حافظ القرآن الکریم ہیں، اور جامعہ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، موصوف نے دارالعلوم کراچی میں قضاء کی تربیت لی، اور جامعہ اسلام آباد سے کلیۃ الشریعۃ الاسلامیہ بھی کیا ہے۔

(۴) مولانا نعیم اشرف صاحب: جو حافظ القرآن ہیں، اور جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کے فارغ التحصیل ہیں، پھر جامعہ سندھ سے دکتورۃ بھی کیا ہے۔

(۵) مولانا فہیم اشرف صاحب: مولانا کے تاسیس کردہ ادارۃ القرآن کے ذمے دار ہیں۔

مولانا کے دوسرے صاحب زادہ گرامی مولانا رشید اشرف سیفی صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی حیات طیبہ پر ''متاع نور'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جو راقم السطور کی نظر سے گزری ہے، جو اس کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے، مولانا رشید اشرف سیفی صاحب نے اپنے والد بزرگوار پر جو لکھا ہے دراصل لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے، انہوں نے یہ کتاب لکھ کر ہم غریب اور مسکین ارکانیوں پر احسان کیا ہے، انشاءاللہ تعالی ان کی یہ خدمت تا قیامت باقی رہے گی۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب مظاہری قادربیلی

مولانا نور محمد بن عبدالجبار کی ولادت ۱۹۲۶ء میں جنوبی منگڈو کی بستی قادربیل میں ہوئی، آپ کے والد صاحب نہایت دین دار اور علماء وصلحاء سے لگاؤ رکھنے والے ایک سخی اور انسانیت نواز بزرگ تھے، اور والدہ بھی ایک عابدہ خاتون تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں اور متوسطہ کی تعلیم علاقے کے دینی مدارس میں ہوئی، اعلی تعلیم دینی کا شوق بڑھا تو ہندوستان پہنچے، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، چار سال تک وہیں پڑھ کر ۱۹۵۵ء میں فراغت حاصل کر لی، آپ نے اس عظیم الشان ادارے میں خاص طور پر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب، حضرت مولانا منظور احمد صاحب اور حضرت مولانا اسد اللہ صاحب سے استفادہ کیا، فراغت کے بعد آپ وطن واپس آ کے درس وتدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔

آپ نے ۱۹۵٦ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک جنوبی منگڈو کی معروف دینی درس گاہ ''مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں تعلیم دی، آپ پہلے پہلے ابتدائی کتابیں پڑھایا کرتے تھے، بعد میں متوسطہ کی کتابیں بھی پڑھائیں، ابھی آپ مزید ترقی کی طرف گامزن تھے کہ اچانک ارکان پر برمیوں کے مظالم بڑھ گئے تھے، اور جنرل نیون کی شکل میں ایک عظیم اور خطرناک عفریت نے یہاں بربریت کی ایسی چکی چلائی کہ جس کی وجہ سے حضرت مولانا کا دل اچھاٹ ہو گیا، ویسے مولانا وطن عزیز سے ۱۹٦٦ء میں ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی جا پہنچے تھے۔

مولانا ۱۹٦٦ء میں کراچی برمی کالونی کی جامع مسجد حقانیہ کے امام اور خطیب مقرر ہوئے، ویسے مسلسل آٹھ سالوں تک آپ نے اس میں مذہبی فریضہ انجام دیا، یہاں کے لوگ آپ کو امام صاحب کے نام سے جانتے تھے۔

مولانا نے ۱۹۷۳ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا، وہاں آپ نے ۱۹۷۴ء تک قیام کیا، حج بیت اللہ اور زیارت منورہ سے فراغت کے بعد کراچی واپس آئے، یاد رہے کہ اس حج اور زیارت کے بعد بھی آپ نے مزید تین حج اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کی تھی۔

مولانا کے پیرومرشد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی ہے، ہمیشہ پیر و مرید کے

درمیان خط وکتابت جاری تھی، چنانچہ یہاں آپ کے نام حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کا ایک خط ملاحظہ ہو:

”عنایت فرمایم! سلمہ اللہ تعالی۔

خط پڑھ کر مسرت ہوئی، اور معمولات کے پورا ہونے سے اور بھی مسرت ہوئی، حق تعالی شانہ اپنے فضل وکرم سے ترقیات سے نوازے، تعلیمی سلسلہ میں اشتغال بہت مبارک ہے، اللہ تعالی شانہ اپنے فضل وکرم سے اپنے دین کی خدمت آپ سے لے، اور اپنی رضا ومرضیات پر عمل کی مزید توفیق عطا فرمائے، آپ نے جواب کے لئے کارڈ تو بھیجا ہے مگر غالبا یہ کارڈ تو شاید یہاں سے کافی نہ ہو، بقائے تعلق کے لئے اس ناکارہ کے رسائل میں سے کسی رسالہ کا مطالعہ کرتے رہنا کافی ہے۔

یہاں اپنے کسی واقف کو لکھ دیں کہ وہ برما جانے آنے کا کارڈ یا لفافہ پر پتہ لکھ کر بندہ کے حوالہ کردے۔ فقط والسلام۔

زکریا عفی عنہ

یکم/صفر ۱۳۷۵ھ بمطابق ۷/نومبر/۱۹۵۵ء(۱)

حضرت مولانا نور محمد صاحب کا انتقال ۱۰/رمضان المبارک/۱۴۲۱ھ بمطابق ۶/دسمبر/۲۰۰۰ء میں کراچی میں ہوا، خاک پاکستان میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یوں آپ کے بے شمار تلامذہ تھے اور اب بھی ہیں، ان میں سے حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب چارکبوی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب والد گرامی مرحوم مولانا مفیض الرحمن نلبنوی، حضرت مولانا قاری ابوالحسن صاحب، حضرت مولانا محمد انور صاحب گدوسراوی اور حضرت مولانا ناظر حسین صاحب قابل ذکر ہستیاں ہیں۔ اللہ تعالی مولانا مرحوم کو خاص رحمتوں سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

(۱) ملاحظہ ہو: مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما۔

حضرت مولانا بشیر اللہ صاحب رنگونی

حضرت مولانا محمد بشیر اللہ بن مولانا محمد شکر اللہ اپنے آبائی علاقہ برما کے دار الحکومت رنگون میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد شکر اللہ صاحب ایک جلیل القدر عالم دین اور خدا ترس بزرگ تھے، اور بعض اطلاع کے مطابق آپ کی والدہ بھی بڑی نیک سیرت خاتون اسلام تھی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے نامور والد کے علاوہ مدرسہ تعلیم الدین مغل اسٹریٹ رنگون میں متفرق اساتذۂ کرام سے حاصل کی، بعد ازاں ۱۳۴۴ھ بمطابق ۱۹۲۴ء کو اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور سیدھے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جا داخلہ لیا، وہاں سے ۱۳۵۱ھ بمطابق ۱۹۳۱ء میں سند فراغت حاصل کی، وہیں آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری صاحب، حضرت مولانا منظور احمد خان صاحب، حضرت علامہ صدیق کشمیری صاحب، حضرت مولانا جمیل احمد صاحب اور حضرت مولانا اخلاق احمد صاحب قابل ذکر ہیں۔ آپ نے فراغت کے بعد وطن واپس آ کے مختلف اداروں میں دینی وتعلیمی خدمات انجام دیں، آپ ایک بہترین مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تالیف وتصنیف بھی تھے، آپ کی دو تصانیف:

(۱) دونبی۔ (۲) بشیر الدراري لمن يطالع جامع البخاري نہایت اہمیت کی حامل تصانیف ہیں۔

ان میں اول الذکر تصنیف رد قادیانیت پر تو دوسری تصنیف ظاہر ہے کہ بخاری شریف کی اردو زبان میں سلیس اور جامع شرح ہے۔

آپ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۲ء تک برما کے شہر ٹانگو کے معروف دینی مدرسہ ”اشرف العلوم“ میں دینی اور تعلیمی کاموں میں مشغول رہے، پھر ۱۹۴۷ء سے تقریبا ۱۹۷۵ء تک جامعہ عربیہ تانبوے رنگون کے ناظم اور صحیح بخاری کے مدرس رہ چکے تھے۔

حضرت مولانا محمود حسن گنگوہی مصنف ”فتاوی محمودیہ“ حضرت علامہ مولانا صدیق احمد چاٹگامی (خطیب اعظم وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیہ) حضرت مولانا منیر اللہ ارکانی اور حضرت مولانا سید حسین رنگونی آپ کے ہم سبق تھے، آپ جمعیت علمائے اسلام برما کے سرگرم رکن تھے، آپ نے اس ادارہ کے زیر سایۂ مسلمانان برما وارکان کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، آپ نے پوری زندگی علم دین اور مسلمانان ارکان وبرما کی خدمات انجام دے کر ۱۴۰۴ھ بمطابق ۱۹۸۴ء وفات پائی، آپ کے انتقال کو جمعیت علمائے اسلام برما نے ”موت العالم“ سے تعبیر کیا تھا۔

حضرت مولانا حبیب الدین صاحب رنگونی

جنوبی شرق ایشیا کی خوب صورت سرزمین ملک برما میں دور آخر میں جو چند صاحب علم وقلم علماء پیدا ہوئے، ان میں ایک حضرت مولانا حبیب الدین صاحب رنگونی بھی ہیں، حضرت مولانا حبیب الدین بن عبدالرحمن صاحب کی پیدائش رنگون کے علاقے میں ہوئی، اور رنگون میں ہی آپ کا نشوونما ہوا، آپ کے والد جناب عبدالرحمن صاحب بڑے اخلاقی انسان تھے، اور والدہ ماجدہ بھی ایک اطلاع کے مطابق نہایت پاکیزہ صفات خاتون تھی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں پائی، اس کے بعد مدرسہ مدینۃ العلوم برما میں داخلہ لیا، وہاں چند سال پڑھ کر سرزمین بنگال آئے اور مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں پڑھے، وہاں آپ نے چند سال پڑھ کر ۱۹۵۱ء میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف چلے گئے، وہاں سے ۱۹۵۳ء میں سند فراغت حاصل کر وطن واپس لوٹے تھے۔

مولانا حبیب الدین صاحب کے استادۂ کرام میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا قاری سعید احمد صاحب، حضرت مولانا منظور احمد صاحب اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب شامل ہیں، ان بزرگوں کے علاوہ بھی آپ نے بعض اساتذہ سے خوب خوب استفادہ کیا تھا۔

مولانا حبیب الدین صاحب فراغت تعلیم کے بعد وطن واپس آئے، اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، آپ علمی قابلیت اور خداداد صلاحیت کے مالک تھے، ابتدائی کتابوں سے لے کر اعلی درجات تک کی کتابیں پڑھائیں، چنانچہ ہزاروں طالبان علوم نبوت نے آپ سے استفادہ کیا، آپ بڑے مخلص معلم کی حیثیت سے معروف تھے۔

مولانا درس وتدریس کے ساتھ ساتھ دعوتِ تبلیغ کے ساتھ لو لگائے ہوئے تھے، آپ کا اصل مشغلہ عامۃ الناس کو دینی اعتبار سے فائدہ پہنچانا تھا، آپ کی ذات وشخصیت سے برمی مسلمانوں کو دینی لحاظ سے بڑا فائدہ پہنچا، آپ صاحب علم وقلم تھے، برمی زبان میں آپ کے چند تراجم پائے جاتے ہیں، جن میں اضافات یومیہ کا انتخاب، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، آخری تقریر، چند تبلیغی تقاریر قابل ذکر ہیں، آپ بڑے جید عالم دین، خداترس بزرگ اور داعی اور صاحب علم وقلم انسان تھے۔

حضرت مولانا مفتی عبدالولی صاحب رنگونی

قدیم زمانے سے قطع نظر اللہ تعالی نے دور آخر میں بھی سرزمین برما میں جو بڑے بڑے بلند پایہ کے علمائے دین، دعاۃ ومبلغین اور اہل علم وقلم پیدا کئے، جنہوں نے ملک وملت کی اپنے زمانے میں گرانقدر دینی وعلمی، تعلیمی وتدریسی، فکری وثقافتی، معاشرتی وسیاسی خدمات انجام دی ہیں، ان میں ایک صاحب علم وقلم بزرگ حضرت مولانا مفتی عبدالولی صاحب رنگونی بھی ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عبدالولی بن عبدالعلی صاحب رنگون میں پیدا ہوئے، اور رنگون ہی میں آپ کا نشوونما ہوا، آپ کے والد جناب عبدالعلی صاحب بہت نیک سیرت، خداترس اور عالم دوست بزرگ تھے، اور بعض اطلاع کے مطابق آپ کی والدہ ماجدہ بھی ایک پڑھی لکھی خاتون اسلام تھی۔

مولانا نہایت ذہین وفطین طالب علم اور بعد میں عالم دین ومطلوب علم تھے، مولانا نے ابتدائی تعلیم رنگون میں پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور ۱۹۵۹ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جا داخل ہوئے، آپ نے اس مادر علمی میں حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا قاری سعید احمد صاحب، حضرت مولانا منیر احمد صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد سلیمان صاحب کے علاوہ حضرت مولانا ظہور الحق صاحب سے خوب استفادہ کیا، چنانچہ آپ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے خوب خوب سیراب ہو کے ۱۳۶۱ھ بمطابق ۱۹۴۱ء میں سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن پہنچے، ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک رنگون کے ایک اسلامی ہائی اسکول میں دینیات کا درس دیا، پھر سورتیہ عربیہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے، مولانا ۱۹۵۷ء سے مرکزی جمعیت علمائے اسلام برما کے صدر دفتر میں فتاوی نویسی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے، غرض آپ ایک جلیل القدر عالم دین، مبلغ اور مدرس ہونے کے علاوہ ایک جاندار قلم کار بھی تھے۔

مولانا عبدالولی صاحب نے رنگون سے شائع ہونے والے مختلف رسائل وجرائد اور اخباروں میں بہت سے گرانمایہ مضامین لکھ چھوڑے، دور جدید، استقلال، اور المحمود کے علاوہ دیگر جرائد واخبارات میں آپ کے مقالے اور مضامین زینت بنے ہوئے تھے، کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا محمد ابراہم صاحب مظاہری (مدیر دور جدید) آپ کی توصیف کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا عبیداللہ حسینی صاحب مانڈلوی

حضرت مولانا عبیداللہ حسینی بن مولانا غلام اللہ صاحب کے متعلق جہاں تک پتہ چلا کہ آپ برما کا دوسرا بڑا شہر اور پرانا دارالحکومت مانڈلے میں پیدا ہوئے، ظاہر ہے کہ آپ سادات حسینی میں سے تھے، آپ کے والد گرامی حضرت مولانا غلام اللہ صاحب بہت برے عالم دین معلم اور صاحب تصنیف بزرگ گزرے، مولانا غلام اللہ صاحب نے اردو زبان میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ''اسرار معرفت'' رکھا گیا تھا، جسے ان کے فرزند رشید حضرت مولانا عبید اللہ صاحب حسینی نے قابل قدر اضافے وخواشی کے ذریعے اور بھی جاندار بنا دیا، علاوہ ازیں مولانا غلام اللہ صاحب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید خاص اور ایک روایت کے مطابق مجاز بیعت بھی تھے۔

مولانا عبید اللہ صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے نامور باپ کے علاوہ اپنے علاقے کے مدارس میں ہوئی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے، مدرسہ امروہہ میں ایک عرصہ تعلیم حاصل کر کے ۱۳۶۸ھ بمطابق ۱۹۴۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جا داخل ہوئے، وہاں آپ نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا سعید احمد صاحب، حضرت مولانا منظور احمد صاحب اور حضرت مولانا اسد اللہ/ اسعد اللہ صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، وہاں آپ نے مسلسل چھ سال تعلیم حاصل کر کے ۱۹۵۴ء میں سند فراغت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ وطن واپس آکے مانڈلے کی ایک جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے رہے، بعد ازاں اپنے علاقہ کی جامع مسجد میں منتقل ہو کے امامت کے فرائض انجام دیئے اور ساتھ ہی ساتھ مدرس خلیلیہ برما کے مدرس اعلی بھی رہے تھے، سات سال یہاں تعلیم دے کر مدرسہ عربیہ مدینۃ العلوم قصبۂ ینڈو کے استاد ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا عبیداللہ صاحب حسینی ایک جلیل القدر عالم دین، ماہر وتجربہ کار مدرس ومعلم، بلند پایہ کے خطیب ومقرر اور دل دردمند داعی الی اللہ تھے، آپ کی حیات مستعار قال اللہ اور قال الرسولؐ اور دعوت دین اور خدمت خلق میں گزر گئی تھی۔

مولانا اردو کے علاوہ برمی زبان کے ادیب تھے، چنانچہ آپ نے برمی زبان میں چند تصانیف لکھ چھوڑیں، جن میں ''سیرت نبویؐ'' گرانمایہ اور نا قابل فراموش ہے۔

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب ندوی رنگونی

مولانا عبدالحمید صاحب ندوی ۱۹۴۰ء میں برما کے دارالحکومت رنگون میں ایک دین دار اور علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے محلے کے مدرسہ میں پائی، سن شعور کو پہنچے تو دارالحکومت رنگون کی معروف درس گاہ ''معہد علمی دارالعلوم العربیہ'' میں داخل ہوئے، اور وہیں سے درس نظامیہ کی باضابطہ تکمیل کی، یوں تو کہنے میں آپ نے درس نظامیہ کی تکمیل کی تھی، مگر علم کا شوق ہمیشہ ان کا دامن گیر رہا تھا، یوں کشاں کشاں مدارسہ مظاہرالعلوم سہارنپور پہنچے، وہاں ایک سال تک درس حدیث کے حلقے میں بیٹھے اپنے علم کے شوق وپیاس بجھاتے رہے، ایک سال وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں آپ رنگون واپس آئے اور اپنی مادر علمی ''معہد علمی دارالعلوم العربیہ'' میں تدریسی خدمات پر مامور ہو گئے تھے، اس تدریسی خدمات کے دوران آپ نے انگریزی زبان کی طرف توجہ دی اور بہت کم مدت میں اس اجنبی زبان پر قدرت حاصل کر لی تھی۔

۱۹۶۶ء کے بعد آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو پہنچے، وہاں آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامن سے وابستہ ہو گئے، اس دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باقاعدہ دوسالہ اختصاص فی الادب العربی کے نصاب کی تکمیل کی، چنانچہ اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ:

> ''اس سب کے باوجود مولانا کی طبیعت میں ایک مربی ومرشد سے عدم تعلق کا شدید احساس ہوا تھا، چنانچہ یہ احساس آپ کو لکھنؤ لے آیا، یہاں آکر ایک سال تک (۱) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دامن سے وابستہ ہو گئے، کیا سفر کیا حضر حضرت مولانا ہی کے ہو کر رہ گئے، دار العلوم میں باقاعدہ دوسالہ اختصاص في الادب کے نصاب کی تکمیل کی، یہاں سے فراغت کے بعد پھر اپنے وطن برما واپس تشریف لے گئے''۔(۲)

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، مبصر صاحب قلم اور دل جلے خادم قوم تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم

(۱) یہاں ایک سال کی مدت کا تعین صحیح نظر نہیں آتا۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص:۲۰۵۔

اورحضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت نے آپ کی فطری صلاحیت اور خداداد استعداد میں مزید جلا بخشا، جس کا بین ثبوت آپ کی وہ قلمی خدمات ہیں جو آپ نے اپنی زندگی میں دنیا کے سامنے پیش کیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وطن واپس آکر آپ نے رنگون کے بعض اخبارات میں جو مضامین لکھے انہیں آپ کی عبقری صلاحیت کی روشن دلیل کے بطور پیش کیا جا سکتا ہے، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''خالق قلم جل جلالہ نے آپ کو قلمی صلاحیت سے نوازا تھا، وقتاً فوقتاً بہت سے علمی، دینی اور سیاسی مضامین لکھتے تھے، جن کو برما کے علمی و دینی حلقے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا رہا، آپ کی علمی صلاحیت کو دیکھ کر رنگون کے مشہور روزنامہ اخبار'' دور جدید'' کی جانب سے آپ کو نائب مدیر کے طور پر دعوت دی، آپ نے اس پیش کش کو قبول فرمالیا، اور آپ مستقل طور پر اپنی خداداد صلاحیت سے دینی و اصلاحی مضامین ومقالات لکھنے شروع کئے، اور علمی و دینی حلقہ سے خوب داد تحسین حاصل کی، سن ۱۹۶۶ء میں کمیونسٹ حکومت نے اس اخبار کو بند کردیا تو آپ جمعیت علمائے اسلام برما کی طرف سے ناظم اعلی برائے رنگون کے منصب پر فائز ہوکر مسلمانان برما کی اصلاحی اور فلاحی اور دینی خدمات میں مصروف ہوگئے''۔(۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد آپ رنگون پہنچے تو وہاں کی دو معروف مساجد ''جامع مسجد سورتی'' اور ''جامع مسجد پنجابی'' کے متولیوں اور ذمے داراں نے آپ کو دعوت دی کہ آپ ان دونوں مساجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کریں، چنانچہ آپ نے ان حضرات کی دعوت قبول کی اور درس قرآن کا ایک روشن سلسلہ شروع کردیا، اسی درس قرآن کے علاوہ بھی آپ نے مختلف فلاحی اور اصلاحی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا تھا۔

۱۹۷۸ء میں آپ نے اپنے وطن میں مزید وقت گزارنے کو مناسب نہ سمجھا، ایک طرف یہاں عام مسلمانوں پر مظالم کا انتھک سلسلہ شروع ہوچکا تو دوسری طرف خاص طور پر وہ علمائے اسلام جنہیں اللہ تعالی نے علم وعمل کے ساتھ ساتھ قوم وملت کی بہبودی کی خواہش بخشی تھی کے لئے زمین تنگ ہوچکی

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۰۵۔

آپ نے اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہہ دینے کا ارادہ کرلیا، اس سلسلے میں آپ نے اپنے مرشد کامل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے رابطہ کیا، اور ان کے مشورے سے عزم کرلیا کہ وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے جائیں، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۷۸ء میں پھر وہ وقت آیا جب برما کی زمین برمی مسلمانوں پر تنگ ہوگئی تھی، حکومت نے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، ان کو ہر طرح سے ستایا گیا، ایسے حالات میں مولانا اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے مع اہل وعیال لکھنؤ، انڈیا تشریف لے آئے، یہاں آکر دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاذ مقرر ہوئے''۔(۱)

مولانا نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں لگ بھگ تین سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، پھر ۱۹۸۳ء کے کے اوائل میں حجاز مقدس کا رخ کیا، مدینۃ الرسول ﷺ کی معروف یونیورسٹی'' الجامعۃ الاسلامیہ بالمدینۃ المنورۃ'' کے شعبۂ دعوت سے ماجستر کیا، اس کے بعد یہاں کی ایک معروف موسسہ'' موسسۃ الناجی'' کے مدیر رہے، اور ساتھ ہی ساتھ وزارۃ الاعلام السعودیہ مدینہ منورہ کی جانب سے مراقب اور جوازات مدینہ منورہ میں ایک روایت کے مطابق طبی معاون ومشرف رہے تھے۔

پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا ایک صاحب قلم عالم دین تھے، لکھنے پڑھنے کا شوق زندگی کے آخری دم تک باقی رہا، رنگون کی رہائش اور ہجرت کی زندگی میں آپ نے مجلّات اور اخباروں میں مختلف موضوعات پر خاصی مضامین لکھے، ان کے علاوہ بھی آپ کی چند تصانیف منظر عام پر آئیں، جو رہتی دنیا میں ان کی یادگار کے بطور انشاءاللہ زندہ وتابندہ رہ جائیں گی، جن میں سے قابل ذکر یہ تصانیف ہیں:

(۱) تفسیر القرآن الکریم: مولانا کی وفات کے چند سال پہلے رابطۃ العالم الاسلامی کی جانب سے آپ کو برمی زبان میں ایک تفسیر لکھنے کی پیش کش کی، چنانچہ آپ نے اپنی کوشش اور پیہم جستجو اور توفیق الہی سے برمی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر لکھی، جو مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف سے بڑی خوبصورت جلدوں میں چھپ کر شائع ہوچکی ہے۔

(۲) ''برما میں مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل'': نامی مولانا کی یہ تصنیف میری نظر سے گزری ہے

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۲۰۵۔

یہ تصنیف مولانا کی جان دار قلم اور آپ کی ذہانت کی یادگار ہے۔

(۳) اسلام کی دعوت عہد عباسی میں: یہ ایک بیش قیمت علمی تحفہ ہے، میدان دعوت میں کام کرنے والوں کے لئے بہت قیمتی مواد ہے، اس میں مولانا نے اپنی صلاحیت اور خداداد استعداد سے بہت کچھ لکھا ہے۔

صدیق مکرم مولانا حافظ محمد صدیق صاحب مولانا کی اردو دانی اور اردو زبان میں آپ کی قدرت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اس کے علاوہ آپ اردو کے بہترین ادیب اور انشا و پرداز تھے، باوجودیکہ اردو آپ کی مادری زبان نہ تھی مگر ایسی سلاست اور فصاحت سے گفتگو فرماتے کہ اندازہ ہوتا تھا کہ اردو آپ کی مادری زبان ہے، بہترین خطاط اور کاتب تھے، بہت سی قیمتی نصیحتیں اور مفید جملے لکھ کر دیوار پر آویزاں رکھتے، اپنے دفتر میں اپنے بیٹھنے کی جگہ کے مقابل ایک شعر جلی قلم سے لکھ کر لگایا تھا، جو بلا شبہ موجودہ معاشرے کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔(۱)

حافظ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''مادر علمی مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حضرات علمائے دیوبند سے (مولانا کو) عشق تھا، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے غایت درجہ عقیدت تھی، جیسے ہی پتہ چلتا کہ مولانا مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں، فورا حاضر ہوتے، اپنی بیماری بھی بھول جاتے، حضرت مولانا بھی آپ کی بڑی قدر کرتے اور اکرام فرماتے تھے''۔(۲)

مولانا کے مرض وفات کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ایک عرصہ سے مولانا دل کے مریض تھے، اور بالآخر یہ مرض قلب وفات کا سبب

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۹۶۔۲۰۷۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۲۰۷۔

بنا، چنانچہ ۱۰/ شعبان/ ۱۴۲۰ھ کو آپ نے ارض طیبہ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد فرمائی، مسجد نبوی میں بروز جمعہ نماز جنازہ ہوئی، اور جنت البقیع میں مدفون ہو کر محو آرام ہو گئے، پسماندگان میں اہلیہ اور دو بیٹے، تین بیٹیاں ہیں''۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم، سیاسی مبصر اور جان دار قلم کار انسان تھے، آپ کی تحریروں سے پتہ چلا کہ آپ ذوق سلیم کے مالک صاحب قلم ادیب اور انشاء پرداز تھے، اگر برما میں مزید آپ کی خدمات ہو سکتیں تو شاید علوم دینیہ کے لئے بہت اچھی ہوتیں، مگر قدرت کو اور منظور تھا کہ برما کی اس پھول کی خوشبو دوسروں کے گھر پھیلی مگر اہل وطن محروم رہ گئے۔

حضرت مولانا محمد صالح صاحب رنگونی

حضرت مولانا محمد صالح بن محمد یحیی بن محمد سعید کی پیدائش برما کے دار الحکومت رنگون میں ہوئی، آپ کے والد بڑے نیک اور خلق دوست انسان تھے، اور والدہ بھی بڑی پاکیزہ سیرت خاتون تھی۔

مولانا کی مکتب نشینی شہر رنگون کے اپنے محلے میں ہوئی، بعد میں دار العلوم العربیہ رنگون میں داخلہ لیا، وہاں سے آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے، اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جا داخلہ لیا، اس مادر علمی میں آپ نے ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک بڑی محنت ومشقت کے ساتھ تعلیم حاصل کر کے سند فراغت کے ساتھ وطن واپس لوٹے، مظاہر علوم میں آپ نے جن بزرگوں سے خصوصی طور پر استفادہ کیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب۔

(۲) حضرت مولانا عبد الرحمن کامل پوری صاحب۔

(۳) حضرت مولانا اسد اللہ/ اسعد اللہ صاحب۔

(۴) حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی۔

(۵) حضرت مولانا امیر احمد صاحب۔

(۶) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب۔

مولانا وطن واپس آئے تو دار العلوم العربیہ رنگون والوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، چنانچہ اس ادارے میں آپ نے تقریبا چالیس سال تک قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے درس دینے کے ساتھ ہی ساتھ مدرسہ عربیہ صوفیہ رنگون کی تعلیمی سرپرستی بھی فرماتے رہے، درس وتدریس کے تہ بتہ آپ نے دعوت وتبلیغ کو اپنی زندگی کا اصل مشن بنالیا تھا، علاوہ ازیں تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے تو برما کی تبلیغی جماعت کے مرکزی امارت کے عہدے پر فائز ہو گئے، اور مرتے دم تک اس عہدے پر برابر فائز تھے۔

مولانا محمد صالح صاحب کو فیاض ازل نے سیرت باطنی کے ساتھ ساتھ ظاہری صورت سے بھی نوازا تھا، یعنی آپ حسن سیرت وحسن صورت کے ایک حسین پیکر تھے، راقم سطور نے حضرت مولانا کو چند مرتبہ

قریب سے دیکھا، جب آپ علی چنگ بوسیدنگ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کرنے تشریف لاتے تھے، آپ سے راقم نے ملاقات بھی کی، آپ کے خطابات سننے کی توفیق بھی ہوئی، میرے ننہال میں آپ کی دعوت ہوئی تھی، بڑے نیک دل، پاکیزہ صفات اور حسن عمل کے پیکر تھے، پھر ایک جلیل القدر عالم دین اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے داعی اور خلق دوست انسان تھے، تبلیغی جماعت پر آپ کی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس جماعت کی دعوت پہنچی اور لاکھوں انسان اللہ تعالی کے دین سے لو لگا سکے تھے، آپ کی زبان میں ایسی شیرینی تھی کہ لوگ آپ کے حلقے چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے، آپ بڑے دل جلے اور دردمند انسان تھے، اللہ تعالی آپ کی قبر مبارک پر باران رحمت برسائے۔ ع

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

حضرت مولانا حافظ محمود داود ہاشم یوسف صاحب رنگونی

حضرت مولانا حافظ محمود داؤد ہاشم یوسف ۱۹۱۶ء میں برما کے دارالحکومت رنگون میں پیدا ہوئے، آپ کا نشوونما بھی وہیں ہوا، آپ کی عمر پانچ سال ہوئی تو ابتدائی تعلیم مولانا عبدالمجید شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ راندیریہ میں بھرتی ہوئے، وہاں آپ نے اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی، اس مدرسہ میں تقریباً پانچویں جماعت تک کی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۲۹ء میں ہندوستان پہنچے اور سیدھے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جا داخل ہوئے، اسی مادر علمی میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم سے لے کر دورۂ حدیث نبویؐ تک کی تعلیم حاصل کی، آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا اسداللہ صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری صاحب، حضرت مولانا منظور احمد صاحب، حضرت مولانا عبدالخالق صاحب، حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمہم اللہ علیہ قابل ذکر ہیں، اس کے بعد تھانہ بھون جا کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے تبرکاً شرح وقایہ کا کچھ حصہ پڑھا، اور حکیم الامت نے آپ کی سند تجوید پر دستخط بھی کئے تھے، ان مذکورہ بزرگوں کے علاوہ اس وقت کے نامور اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری صاحب، حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب اور میاں جی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کی بھی آپ نے خصوصی توجہ ومحبت اور شفقت و دعائیں لیں، آپ نے مظاہر العلوم سہارنپور سے تقریباً ۱۹۳۹ میں سند فراغت حاصل کی تھی، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت جی حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی آپ کے ہم سبق تھے، آپ کی بیعت اور خرقۂ خلافت کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت مفتی صاحب نے دوران تعلیم اصلاحی تعلق حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے قائم کیا، پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ مریدین ومتوسلین میں شامل ہو کر بیعت کی سنت ادا کی، اور شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب کی للّٰہیت، ٹھوس علمی

صلاحیت، تزکیۂ نفس اور قائدانہ قابلیت کو دیکھ کر سند خلافتِ تصوف سے نوازا، یوں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم سے بھی آراستہ ہو گئے، غالباً شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد حضرت مفتی صاحب نے صاحب اعلاء السنن، یکے از بانیین پاکستان علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا، اور علامہ عثمانی صاحب نے بھی خرقۂ خلافت سے نوازا''۔(۱)

فراغت تعلیم کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایک سال آپ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں درس دیا، یہ ان کی علمی قابلیت واستعداد کا بین ثبوت تھا کہ جس مادر علمی سے انہوں نے فراغت حاصل کی اسی میں آپ بحیثیت مدرس درس دے سکے۔

اسی سال آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی، اہلیہ صاحبہ آپ کی چچازاد بہن تھی، شادی خانہ آبادی کے بعد آپ نے اپنے شفیق استاد حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لئے حجاز تشریف لے گئے، اس حج کے حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''سندھی زبان میں نکلنے والا رسالہ ماہنامہ ''الصادق کراچی'' شمارہ شوال وذی قعدہ/ ۱۴۰۲ھ۔اگست دسمبر/ ۱۹۸۲ء میں مفتی اعظم برما کا تحریر شدہ ایک تصدیق نامہ ہے، جو مدرسہ مظاہر علوم کھڈہ کراچی (بانی مولانا محمد صادق) کی تعریف وتوصیف پر مشتمل ہے، اس تصدیق نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب ۱۹۳۷ھ میں حج کے لئے جاتے ہوئے اپنے استاد محترم مولانا عبدالرحمن کامل پوری کی معیت میں مذکورہ مدرسہ میں تشریف لائے تھے، اور دوسری مرتبہ حج کے لئے جاتے ہوئے ۱۵ /ذی قعدہ، ۲۱/ اپریل / ۱۹۶۲ء میں آئے اور تصدیق نامہ تحریر فرمادیا، مفتی صاحب نے اس تصدیق نامہ میں مولانا فضل الرحمن برمی کا حوالہ بھی دیا، جو مذکورہ مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں''۔(۲)

مفتی صاحب نے ۱۳۵۶ھ بمطابق ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم تاموے رنگون کی بنیاد رکھی، اس مدرسہ کی تاسیس وتعمیر میں اس وقت کے مقتدر علمائے کرام کی تائید وحمایت حاصل تھی، ان علمائے عظام میں حضرت مولانا

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہر ارکان وبرما، ص: ۱۹۰۔۱۹۱۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہر ارکان وبرما، ص: ۱۹۲۔

اسد اللہ صاحب، مولانا عبد الخالق صاحب، مولانا مفتی مرغوب الرحمن صاحب اور حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب قابل ذکر ہیں، اللہ تعالی کے فضل و کرم سے اس مدرسہ کا آج بھی فیض عام ہے، مولانا نے یہاں نصف صدی سے زائد عرصہ تک دینی خدمات انجام دیں۔

مولانا محمود داؤد صاحب شاعر بھی ہیں اور مولف بھی، ۱۹۸۳ء میں آپ کی چند تالیفات منظر عام پر آئیں، ان میں ادعیہ مسنونہ، تعلیم الحج، مناجات مقبول، خلاصۃ المخلصین، درود وسلام، حزب البحر قابل ذکر ہیں، ان تمام رسائل کو ادارۂ اشاعت الاسلام برطانیہ نے شاید مولانا ابراہیم باوا صاحب کی کوشش سے شائع کیا ہے۔

مولانا نے ۲ / اپریل/ ۱۹۳۹ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے جلسۂ صدارت میں شرکت کی، اس اجلاس میں آپ نے برمی مسلمانوں کے حالات پر روشنی ڈالی تھی، آپ رابطۃ العالم الاسلامی مکۃ المکرمہ کے مستقل رکن تھے، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مکۃ المکرمہ کی مشہور عالمی تنظیم رابطہ عالم اسلامی نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۹۶۴ء میں رابطہ کا مستقل رکن بنایا، بلکہ دستور ساز کونسل کا رکن بھی بنایا، لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرمہ کی طرف سے مفتی صاحب کے لئے ہر سال ٹکٹ آتا تھا، لیکن ظالم و جابر برمی حکومت نے کبھی بھی حضرت مفتی صاحب کو رابطہ کی کسی بھی میٹنگ اور اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں دی، جس پر رابطہ نے کئی دفعہ احتجاج بھی کیا، لیکن بے سود ثابت ہوا''۔(۱)

حافظ صدیق صاحب تاریخ مظاہر، سیرت عثمانی، خونیں سرگذشت اور تذکرۂ ارکان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مفتی صاحب نے اطراف عالم کے چپہ چپہ تک برمی مسلمانوں کی حالت زار پہنچانے کے لئے ۱۳۵۷ھ بمطابق ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ اپنی ادارت میں ایک مجلہ ماہنامہ ''المحمود'' بھی جاری کیا تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ برمی حکومت کے ظلم کا شکار ہو گیا''۔(۲)

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہر ارکان و برما، ص: ۱۹۳۔

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہر ارکان و برما، ص: ۱۹۳۔

برما کے بے شمار مدارس، مکاتب، دینی ادارے اور اسلامی پاٹ شالے حضرت مولانا کی زیر ادارت و زیر صدارت چلتے رہے تھے، اس کے علاوہ جمعیت علمائے اسلام ہند کے نقش قدم پر برمی علماء نے ایک جمیعت ٹھیک اسی نام پر بنائی تھی، حضرت مولانا تا حیات اس تنظیم کے کبھی صدر اور کبھی نائب صدر رہ چکے تھے، ملک میں اس تنظیم کے ذریعے بعض دینی فائدے بھی مرتب ہوئے تھے۔

مولانا ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک برما سے نکلنے والا اردو رسالہ ''دور جدید'' جو حضرت مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری کی زیر ادارت نکلتا تھا کے نائب مدیر رہے تھے، اس کے علاوہ ''استقلال'' کے بھی نائب مدیر رہے، بعد میں برمی حکومت نے ان دونوں اخباروں کو بند کر دیا تو حضرت نے اپنی زیر ادارت ''الکوثر'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا، مگر یہ بھی برمی اوباشوں کا نشانہ بن گیا تھا۔

ماشاءاللہ آپ صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ پتے کے شاعر بھی تھے، آپ کا ایک قصیدہ ملاحظہ ہو جو حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب کی رنگون کی آمد پر لکھا گیا تھا:

اے میر کاروان حق اے حامل قرآن		تو ہے جہان علم وہدایت کا اک نشان
حاصل ہے تجھ سے علم نبوت کو اب فروغ		سیراب تجھ سے رشد و ہدایت کے تشنگان
انسانیت کو ناز ہے تیرے وجود پر		سنتی ہے تجھ سے علم و شرافت کی داستان
محبوب تھانوی ہے تو اے مرد با خدا		آماجگاہ خلق رہا جس کا آستان
اس قاسم علوم کا ورثہ ملا تجھے		جو تھا قلوب اہل معارف پہ حکمران
کیوں کر نہ تیری مدحت بے لوث ہو عزیز		قائل ہے تیری عظمت و رفعت کا اک جہان
تھی منظر ورود سعادت کی یہ زمین		آمد سے تیری ہوگئی ہم رنگ آسمان
کرتا ہے رشک ہم پہ زمانہ اسی لئے		ہم میں ہے آج ایک خطیب سحر بیان
تجھ پر نوازشوں کی یہ بارش رہے مدام		تا حشر تیرے فیض سے سیراب ہو جہان
ہو جائے ہر نفس تیرا اسلام کے لئے		دین مبیں ہو تیری محنت سے کامران
رحمت خدا کی سایہ فگن تجھ پہ ہو مدام		سیراب تجھ سے ہوتے رہے خلق صبح وشام(۱)

(۲) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہر ارکان و برما، ص: ۱۹۱۔

آپ نے ۱۸/اپریل/ ۲۰۰۳ء بمطابق ۵/صفر/ ۱۴۲۴ھ براز منگل وفات پائی، دار العلوم تامبوے رنگون کے متصل سنی قبرستان میں مدفون ہیں، آپ کے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ اورایک بیٹا ڈاکٹر سلیم بقید حیات تھے، آپ کے اورایک بیٹا محمد خالد حضرت کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب اور آپ کی اولاد کی سعی وکوشش کوقبول کرے، آمین۔

حضرت مولانا قاری محمد علی صاحب رنگونی

حضرت مولانا قاری محمد علی بن الحاج محمد یوسف رنگون میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بہت خدا ترس، اورایک عالم دوست انسان تھے، دعوت تبلیغ سے ہمیشہ جڑے ہوئے ایک داعی الی اللہ تھے، اور والدہ محترمہ بھی ایک پڑھی لکھی دین دار خاتون تھی۔

مولانا قاری محمد علی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے کے مکتب میں حاصل کی اور بعد میں دارالعلوم برما میں داخلہ لیا، وہاں سے ایک روایت کے مطابق آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم حاصل کی، جب کہ دوسری روایت یہ بھی ملی ہے کہ آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنے علاقے کے ایک استاد خاص سے حاصل کی تھی۔

مولانا صاحب اس کے بعد اعلی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان چلے گئے اور سید ھے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جا کر داخل ہو گئے، وہاں آپ نے ۱۳۵۵ھ سے لے کر ۱۳۶۱ھ تک تعلیم حاصل کی، آپ نے اس مادر علمی سے خوب خوب فیض حاصل کیا، آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری صاحب، حضرت مولانا اسداللہ صاحب اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب شامل ہیں، کہتے ہیں کہ بعض اساتذۂ کرام مولانا کی محنت اور کوشش پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ مولوی محمد علی ایک محنتی طالب علم ہے، چنانچہ مستقبل میں وہ ایک مستعد عالم دین بن کر ملت وقوم کی خدمات انجام دے سکے گا۔

فراغت کے بعد آپ وطن واپس ہوئے، آپ بڑے دل دردمند مبلغ تھے، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے امامت، خطابت اور وعظ وتبلیغ کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، رشد وہدایت، خطابت وتبلیغ کے علاوہ آپ ایک اچھے معلم بھی ہیں، آپ کی ذات وشخصیت سے برمی مسلمانوں کا جو فائدے ہوئے وہ ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں، برمی زبان میں آپ کی ایک اچھی تصنیف ہے، جس کا نام ''فضائل روزہ'' ہے، یہ تصنیف راقم السطور کی نظر سے گزری ہے، روزے کے حوالے سے بہت جاندار رسالہ/کتاب ہے، اللہ تعالی آپ کی اس تصنیف کو مزید قبول کرے۔آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا قاری محمد علی صاحب نے برمی مسلمانوں کی دینی وملی، علمی وثقافتی، دعوتی وتبلیغی، تعلیمی وتدریسی خدمات کے حوالے سے بہت کچھ کیا ہے، اللہ تعالی قبول پرمائے، آمین۔

شیخ طریقت حضرت حاجی محمد یوسف صاحب رنگونی

حاجی محمد یوسف کے متعلق پتہ چلا کہ آپ رنگون میں پیدا ہوئے، تعلیم کے حوالے سے بس اتنا سراغ ملا کہ آپ نے ابتدائی تعلیم رنگون میں حاصل کر کے ہندوستان تشریف لے گئے، لیکن وہاں کسی مدرسہ میں پڑھا ہے کہ نہیں اس کا پتہ تو نہ چل سکا، تاہم آپ نے حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی صاحب تھانوی کے یہاں زندگی کے چند سال گزارے تھے، آپ کے مرید ہوئے، چنانچہ عرصۂ دراز کے بعد حضرت نے آپ کی للّٰہیت، عبادت، اخلاص اور پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر اصلاح اور بیعت کی اجازت عطا فرمائی تھی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

> ''آپ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نہایت مخلص اور متمول خادم و مجاز تھے، آپ رنگون کے رہنے والے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے عاشق صادق تھے، (تقریبا) ساری زندگی حضرت کی خدمت میں گزاری دی، اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق بسر کی تھی، حقوق العباد کے بڑے سختی سے پابند تھے، ذکر وعبادت اور زہد وتقوی میں اسلاف کا نمونہ تھے، حضرت کا جب انتقال ہوا تو آپ نے اپنی کثیر رقم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نام بذریعہ تحریر وصیت فرمادی تھی، مگر حضرت نے وہ رقم اس وقت تک قبول نہیں کی، جب تک اس کے متعلق شرعی فتاوی اور گواہان کی گواہی نہ آگئی تھی، بہر حال آپ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز بیعت تھے، اور عمر بھر اصلاح وتربیت میں مصروف رہے تھے''۔(۱)

لوگوں کی زبانی مزید اتنا پتہ چلا کہ آپ صاحب ثروت آدمی تھے، بڑے پاکیزہ سیرت اور سخی بھی، آپ نے علم دین اور طلبائے علوم نبوت کی بڑی خدمت کی تھی، ہر وقت اصلاح معاشرہ کی فکر کرتے تھے، حقوق العباد میں آپ کی پابندی کے حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب نے کاروان تھانوی مولفہ حافظ سید اکبر شاہ بخاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے حضرت والا (مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہرارکان وبرما، ص: ۲۰۳۔

> علیہ) حقوق العباد کا بہت اہتمام فرماتے ہیں، حضرت والا فرماتے ہیں کہ حقوق العباد کو ادا کرنا اوراد و وظائف سے بدر جہا زیادہ ضروری ہے، اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا، اور ترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں، حضرت والا فرماتے ہیں کہ میری تعلیم و تربیت کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ میں طریقت میں تہذیب واخلاق کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں، چنانچہ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں، اور جب تک اصلاح اعمال واخلاق نہ ہو، اس وقت تک ذکر و اذکار سے کوئی نفع نہیں ہوتا، اس لئے کہ اخلاق واعمال کی خرابی ایسا حجاب ہے جو ان کے اثرات وانوار کو روح میں سرایت کرنے سے روک دیتا ہے''۔(۱)

غرض آپ کی ذات عالی صفات سے خلق خدا کا بہت ہی فائدہ ہوا تھا، یوں آپ نے اپنی پوری زندگی زہد وورع اور عامۃ الناس کی اصلاح وتربیت میں گزار کر ۸ /محرم/ ۱۳۵۲ھ۔ ۳/مئی/ ۱۹۳۴ء میں وفات پائی، خاکِ رنگون میں مدفون ہیں۔

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۳۰۲۔ بحوالۂ کاروان تھانوی، مولفہ سید اکبر شاہ بخاری، ص: ۱۳۰۔

حضرت مولانا موسیٰ صاحب رنگونی

حضرت مولانا موسی بن مولانا محمد یونس بن مولانا اسماعیل کی پیدائش رنگون میں ہوئی، آپ کے والد اور دادا بہت بڑے عالم تھے، یوں آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے نامور والد کے ہاتھوں ہوئی، آپ نے اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور سیدھے جا کر مادر علمی مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، ۱۳۷۱ھ سے لے کر ۱۳۷۵ھ تک اس ادارہ سے فیض حاصل کرتے رہے، ۱۳۷۵ھ بمطابق ۱۹۵۵ء میں وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے، آپ نے اس ادارہ میں حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا منظور احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی فیض احمد صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا تھا۔

مولانا جس طرح ایک جلیل القدر عالم دین تھے، اسی طرح ایک سنجیدہ قلم کار اور پیشے کے صحافی بھی تھے، جہاں تک معلوم ہوا کہ صحافت آپ کا محبوب مشغلہ رہا، فراغت کے بعد آپ نے اپنے ملک وملت کی خاطر ایک رسالہ برمی زبان میں نکالا، جس کا نام ''تہذیب الاسلام'' تھا، یہ رسالہ چند سالوں تک پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ شائع ہوتا رہا تھا، مگر بعد میں برمی اوباشوں کی اوباشیت کا شکار ہو گیا۔

مولانا ایک اچھے مدرس و معلم بھی تھے، عرصۂ دراز تک دارالعلوم عربیہ محمدیہ کے ناظم بھی رہ چکے تھے ،اس مدرسہ میں دورۂ حدیث نبویؐ تک تعلیم ہوتی ہے۔

مولانا ایک عالم، داعی اور مبلغ و قلم کار تھے، آپ نے مندرجہ ذیل کتابوں کا بہت سلیس برمی زبان میں ترجمہ کیا ہے، آپ کا اس طرح کا ترجمہ کرنا امت اسلامیہ کے لئے بہت ہی سودمند ثابت ہوا، آپ نے اپنے رواں قلم سے جو خدمات برمی اور ارکانی مسلمانوں کے لئے کی ہیں، وہ انشاء اللہ تا قیادت باقی رہیں گی، تو لیجئے وہ کتابیں جو آپ نے دوسری زبانوں سے برمی زبان میں ترجمہ کیا ہے:

بہشتی زیور، تفسیر موضح القرآن آخری دس پارے، چھ باتیں، فضائل تبلیغ، فضائل نماز، فضائل قرآن، فضائل صدقات، فضائل ذکر، فضائل رمضان، حکایت صحابہ، فضائل حج، آئینۂ نماز، حج مبرور، احوال برزخ، زاد السعید، قیامت کبری، خدا کی جنت، حالات جہنم، آداب المساجد، ترجمہ وتفسیر سورۂ رحمن، رد قادیانی۔

اللہ تعالی آپ کی تمام خدمات کو قبول کرے، آمین یارب العالمین۔

ارکان اور اس کے متعلق بعض نمایاں تاریخی واقعات

۲۶۶۶ق م - سے دھنووتی ر دھنیاودی پہلے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۸۰۰ق م تک جاری تھا۔

۸۲۵ق م - سے دھنووتی ر دھنیاودی دوسرے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۷۸۸ء تک جاری تھا۔

۷۸۸ء - ویسالی دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۰۱۸ء تک جاری تھا۔

۹۵۷ء - ارکانی راجا چولاٹنگ چندرا کے زمانے میں ارکان پر منگولوں کا حملہ، اور ارکان کی تاخت و تاراج۔

۱۰۱۸ء - پن سا پہلے دور حکومت کی ابتداء، جو ۱۱۰۳ء میں اپنی انتہاء کو پہنچی تھی۔

۱۱۰۳ء - پارن دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۶۷ء تک جاری رہا۔

۱۱۶۷ء - کریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۸۰ء تک جاری تھا۔

۱۱۸۰ء - پن سا دوسرے دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۲۳۷ء تک جاری تھا۔

۱۲۳۷ء - لنگریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۴۰۴ء تک جاری تھا۔

۱۴۰۴ء - برمی غاصب راجا ''من کھاؤن'' کا ارکان پر حملہ، نرامیخلا کی ارکان کی سلطنت سے بے دخلی۔

۱۴۰۴ء - ارکانی بادشاہ نرامیخلا (محمد سلیمان شاہ رمن سامون) کا ترک وطن یا جلاوطن۔

۱۴۳۰ء - سلیمان شاہ کی ارکان واپسی اور مروکو حکومت کی بنیاد، جس کا سلسلہ ۱۷۸۴ء تک جاری تھا۔

۱۶۶۰ء - بدنصیب مغل شہزادہ شجاع کی ارکان میں آمد، بعد میں اس کا مع اہل وعیال قتل۔

۱۶۶۶ء - مگھ اور پرتگیز لٹیروں کی وجہ سے مختلف آلام و پریشانیاں۔

۱۷۱۰ء - ارکان میں خانہ جنگی، اور وسیع پیمانے میں نقصانات۔

۱۷۸۴ء - برمی غاصب راجا بودھوپھیا کا ارکان پر حملہ وقبضہ، اور اس کی دہشت گردی، اور قتل عام۔

۱۷۹۶ء - تیس ہزار ارکانیوں (مگھ رمسلمانوں) کا ترک وطن اور بنگال میں ان کی پناہ۔

۱۷۹۸ء - جنرل علیہ بائنگ رعلی بھائی (مسلمان) وغیرہ کی برمی غاصبوں سے آزادی کی جدوجہد۔

۱۸۱۱ء - سین فیا (KINGBERING) اور مسلم لیڈروں کی قیادت میں ہونے والے انقلاب کی ناکامی۔

۱۸۲۵ء - پہلی انگلو برمن جنگ۔

۱۸۲۶ء - ارکان پر برطانیہ کا قبضہ۔

۱۹۳۰ء - برمی مسلم تاجر'' اوباو '' کے تعاون سے برما مسلم سوسائٹی کا قیام۔

۱۹۳۰ء - مگھ ڈاکو (بورینگ اونگ) اور اس کے حواریوں کی بربریت اور مسلمانوں کی بڑے پیمانے سے ہجرت۔

۱۹۳۰ء - وسطی، تحتی برما اور ارکان میں مسلمانوں کا قتل عام اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۳۳ء - روہنگیا جمعیت علمائے اسلام ارکان کی بنیاد۔

۱۹۳۶ء - برطانوی ہند سے برما کی انتظامی علیحدگی، اور ملک بھر سے مسلمانوں کا کریک ڈاؤن۔

۱۹۴۲ء - رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ۔

۱۹۴۲ء - ارکانی مسلمانوں کا تاریخی قتل عام، اور بڑے پیمانے پر ان کی ہجرت۔

۱۹۴۲ء - منگڈو، بوسیدنگ اور راسیدنگ پر مشتمل تاریخی ''مسلم ریاست'' کا قیام۔

۱۹۴۵ء - ارکان میں برطانویوں کی دوبارہ واپسی۔

۱۹۴۵ء - ''برما مسلم جنرل کونسل'' نامی تنظیم کا قیام۔

۱۹۴۵ء - مسٹر عبدالرزاق کی صدارت میں برما مسلم کانگرس کا قیام۔

۱۹۴۶ء - مسٹر عبدالرزاق کی سربراہی میں پمنا رپیو منا مسلم کانفرس کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء - سازش پر مبنی بدنام زمانہ ''پیلونگ کانفرنس'' کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء - برمی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔ جس میں ارکانی مسلمانوں کو قانونی طور پر نمائندگی ملی تھی۔

۱۹۴۷ء - محمد جعفر حسین قوال کی زیر قیادت ''جہاد کونسل'' کی تشکیل اور ظالموں کے خلاف اعلان جہاد۔

۱۹۴۸ء - برطانیہ سے برما یا برمیوں کو حصول آزادی۔

۱۹۴۸ء - محمد قاسم بن عطاء الدین کی قیادت میں ''مجاہد پارٹی'' کا قیام۔

۱۹۴۹ء - مولانا مظفر احمد کی زیر صدارت انجمن مہاجرین ارکان کا قیام۔

۱۹۵۰ء - بی ٹی ایف کی بربریت، ہزاروں مسلمانوں کی شہادت اور ہزاروں کی ہجرت۔

۱۹۵۰ء - بانیٔ تحریک آزادیٔ ارکان محمد جعفر حسین قوال کی افسوسناک شہادت۔

۱۹۵۱ء - آزاد برما میں قومی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات۔

۱۹۵۴ء - ارکان میں بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۵۶ء - برمی قومی اسمبلی کے دوسرے انتخابات۔

۱۹۵۹ء - ارکان میں اور ایک مرتبہ بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمان ترک وطن پر مجبور۔

۱۹۶۰ء - مایو فرنٹیر اڈمنسٹریشن کا نفاذ۔

۱۹۶۱ء - برمی قومی اسمبلی کے تیسرے عام انتخابات۔

۱۹۶۱ء - راغب اللہ مرحوم وغیرہ کی قیادت میں ۲۹۰ سے زائد مجاہدین کا برمی فوجی قیادت کے سامنے سارنڈر۔

۱۹۶۲ء - جمہوری آئین کی معطلی، اور اقتدار پر جنرل نے ون کی قیادت میں برمی فوج کا مکمل قبضہ۔

۱۹۶۲ء - برما میں شوشل ازم کا نفاذ۔

۱۹۶۳ء - نے ون کے نام نہاد قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۶۴ء - روہنگیا انڈیپنڈنٹ فورسس (RIF) کی تشکیل۔

۱۹۶۶ء - مگھ شرپسندوں کی شرپسندی اور برمی بربروں کی بربریت کی وجہ سے مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۶۶ء - محمد جعفر ثانی کی قیادت میں ارکان آزاد فوج (RNLP) کی تشکیل۔

۱۹۷۳ء - نے ون کی قیادت میں برمی فوج اور اس کے لالے پالے غنڈوں کے مظالم، اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۳ء - محمد جعفر حبیب (رحمہ اللہ) کی زیر قیادت روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تشکیل اور اعلان۔

۱۹۷۵ء - جنرل نے ون کی ایماء پر مسلمانوں کی وسیع پیمانے میں گرفتاریاں اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۵ء - ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) کا قیام۔

۱۹۷۷ء - روہنگیا مسلم طلبہ تنظیم ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین کا قیام۔

۱۹۷۸ء - نے ون کے نام نہاد برمی قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۷۸ء - ناگامن آپریشن، برمیوں اور مگھوں کی غارت گری، مسلمانوں کی عام گرفتاریاں، قتل عام اور ہجرت۔

۱۹۷۹ء - روہنگیا جمعیت علماء (مسلح) کی زیر زمین جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء - روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تشکیل۔

۱۹۸۲ء - مولانا عبدالقدوس مجاہد کی امارت میں حرکۃ الجہاد الاسلامی نامی تنظیم کی جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء - نے ون قومی اسمبلی کے اور ایک نام نہاد انتخابات۔

۱۹۸۶ء - ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء - مولانا عبدالحمید مجاہد کی زیر امارت ''روہنگیا اسلامی محاذ'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء - روہنگیا طلبہ تنظیم، اتحاد الطلاب المسلمین ارکان۔ برما۔ (ITM) کی بنیاد۔

۱۹۸۸ء - جنرل نیون کی اقتدار سے ہمیشہ کے لئے چھٹی، اور سین لوین کی گدی نشینی۔

۱۹۸۸ء - ڈاکٹر مونگ مونگ کی چند دنوں والی حکومت۔

۱۹۸۸ء - جنرل سا مونگ کی قیادت میں اقتدار پر فوج کا دوبارہ قبضہ۔

۱۹۸۸ء - مولانا محمد حنیف راغب ارکانی کی قیادت میں ''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۸ء - روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا اعلان۔

۱۹۹۰ - ارکانیوں کی نمائندہ جماعت ''نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی فار ہیومن رائٹ (NDPHR) کا قیام۔

۱۹۹۰ء - نام نہاد انتخابات / اقتدار پر فوج کا قبضہ، جس کا سلسلہ تان شوے سے لے کر اب تا جاری ہے۔

۱۹۹۱ء ۔ روہنگیا مسلمانوں پر مظالم اوران کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۱ ۔ مسلمانوں کا قتل عام،وسیع پیمانے میں مسلمانوں کی گرفتاریاں،اوران کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۵ء ۔ روہنگیا نشنل الائنس(RNA)نامی الائنس کی تشکیل۔

۱۹۹۸ء ۔ ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن(ARNO)کی تشکیل اوراعلان۔

۲۰۱۱ء ۔ ارکان روہنگیا یونین(ARU)کی بنیاد اوراعلان۔

۲۰۱۲ء ۔ مسلمانوں کا قتل عام،ہزوروں شہادت،ہزاروں ماں بہنوں کی عصمت دری،اور لاکھوں کی ہجرت۔